افاداتِ اقبال

ڈاکٹر
محمد ریاض

افاداتِ اقبال

ڈاکٹر محمد ریاض

مقبول اکیڈمی
۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

سنہ ۱۹۹۱ء

اہتمام
ملک مقبول احمد

مطبع
شاہ اینڈ سنز بزنس پرنٹرز، لاہور

قیمت
۰۰/۲۰۰ روپے

مقبول اکیڈمی، لاہور

فہرست

صفحہ نمبر	نام مضامین
۵	پیش گفتار
۷	خراج تحسین
۹	حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت ابوعبیدہ ثقفی (بحوالہ اقبال)
۱۵	اقبال اور وحدت ملی
۲۵	اقبال۔ اسلامی تصور ادب کا عظیم ترجمان
۴۰	اقبال۔ خود آموز مفکرین کے زمرے میں
۶۶	اقبال کا تصور علم و تعلیم
۷۹	اقبال اور معاشرے کی تعمیر نو
۸۹	اقبال اور معاشرتی انصاف
۹۷	علامہ اقبال کا عسکری آہنگ
۱۰۰	گل لالہ کی ادبی روایات اور اقبال
۱۲۴	اقبال کے مترادف اشعار
۱۴۸	اصناف سخن میں اقبال کی جدتیں
۱۶۷	اقبال اور ان کی فارسی شاعری
۲۰۳	افغانستان اور ایران میں اقبال شناسی
۲۱۸	اقبال کی فارسی تصانیف (تعارف برائے طلباء)
۲۸۸	تازہ بتازہ نو بہ نو تراکیب اقبال

اقبال اور جوہر کے روابط ——— ۳۰۱
پروفیسر عزیز احمد (مرحوم) کی اقبال شناسی ——— ۳۲۱
اقبال کا ایک ولولہ انگیز ترکیب بند ——— ۳۲۹
علامہ اقبال اور مسلم خواتین کی جداگانہ یونیورسٹیاں ——— ۳۳۷
اقبال اور نژادِ نو ——— ۳۴۵
علامہ اقبال اور تصورِ ریاستِ اسلامی ——— ۳۵۵

○

پیش گفتار

ڈاکٹر محمد ریاض پاکستان کے ان چند ماہرینِ اقبال میں سے ایک ہیں جو اقبال شناسی کے لئے مشہور و معروف ہیں۔ وہ بلند پایہ علمی ذوق کے مالک ہیں، انکا مطالعہ لائق رشک حد تک وسیع ہے اور تحقیق کے جدید طریقوں میں کامل دستگاہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اُردو ہی نہیں فارسی اور انگریزی میں بھی اقبالیات پر کام کیا ہے اور یہ کام توضیحی و تشریحی بھی ہے اور تنقیدی و تحقیقی بھی۔ اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ کے عمیق مطالعہ نے انہیں جو بصیرت بخشی ہے اور فارسی زبان و ادب میں مہارت نے ان میں جو غیر معمولی استعداد پیدا کی ہے اس کی بدولت انہوں نے افکار اقبال کی قدر و قیمت متعین کرنے اور فارسی شعراء اور اقبال کے درمیان فکری و فنی موازنے کے ضمن میں جو کچھ لکھا ہے وہ کمیت ہی نہیں کیفیت کے اعتبار سے بھی وقیع ہے۔ اقبال شناس حلقے جانتے ہیں کہ وہ ایک مدت سے اس بحر کی شناوری میں مصروف ہیں اور آغاز سے اب تک ان کا قلم متحرک ہے۔ اقبال پر ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد بارہ ہے اور بعض زیر تحریر یا زیر طبع ہیں۔ اقبال پر ان کے سینکڑوں مقالات پاکستان کے بلند پایہ علمی و ادبی رسائل و جرائد مثلاً اقبال ریویو، اقبال، صحیفہ، المعارف، فکر و نظر، مجلۂ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اسلامی تعلیم وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن لوگوں کو ڈاکٹر محمد ریاض کی کتابیں اور مقالے پڑھنے کا موقعہ ملا ہے وہ تسلیم کریں گے کہ اقبال کے ذہنی ارتقاء، علمی و ادبی خدمات اور نظم و نثر کے مجموعوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے فکر و فن کے ان گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر لوگوں

کی نظر سے اوجھل تھے۔

ڈاکٹر محمد ریاض صاحب نے اقبالیات کے سلسلے میں جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کا احاطہ ان چند سطور میں ممکن نہیں۔ البتہ ایک خدمت ایسی ہے جس کی طرف اشارہ نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی۔ انہوں نے کلام اقبال کے ان فنی پہلوؤں کو متعارف کرایا ہے اور ان کی تعلیمات کے ان نکتوں کی تشریح و توضیح کی ہے جو اقبال پر لکھنے والوں کی گرفت میں اس سے قبل نہیں آسکے تھے۔ اس طرح انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اقبال پر تحقیق کے امکانات روز بروز وسیع تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اقبال کے فکر و فن کے نئے نئے پہلو سامنے آتے چلے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ریاض نے اقبال کے فکر و فن پر مختلف اوقات میں جو مقالے لکھے ہیں ان کا کچھ حصہ کتابی صورت میں مرتب ہو کر سامنے آ رہا ہے۔ اس سے قبل ان کے اُردو مقالے کے دو مجموعے "برکات اقبال" اور "تقدیر امم اور اقبال" چھپ چکے ہیں۔ جن میں مجموعی طور پر ۱۳+۱۷ مقالے شامل ہیں۔ "افادات اقبال" ان کے مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے جو اقبال کی شخصیت، فکر اور فن پر لکھے گئے ۱۳ مقالوں پر مشتمل ہے۔

میں دلی فخر و مسرت سے یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مقالوں کا قدردان ہوں بلکہ میں نے اقبالیات کے بہت سے دوسرے طالب علموں کی طرح ان کی تحریروں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی دیگر کتابوں اور مقالوں کے مجموعوں کی طرح "افادات اقبال" بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اقبال کے شائقین اس سے کماحقہٗ مستفید ہوں گے۔

رحیم بخش شاہین
شعبۂ اقبالیات
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
راولپنڈی - اسلام آباد

۹- نومبر ۱۹۸۳ء

خراجِ تحسین

علامہ اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو ایک مغربی نقاد ہربرٹ ریڈ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح کہا تھا کہ دنیا میں صرف ایک شاعر ایسا ہے جس کے ہاں ایسا نصب العین ملتا ہے جو بیک وقت نظری بھی ہے اور عملی بھی اور یہ شاعر ہماری نسل اور قوم سے نہیں میری مراد محمد اقبال سے ہے ..... اِدھر ہمارے ملک کے نام نہاد شاعر تو کیٹس کے زمانے کی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں اور بلبلوں، پرندوں یا چھوٹے چھوٹے موضوعات پر نظمیں لکھ رہے ہیں، اُدھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہوئی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ پر پوری طرح غلبہ و تسلط حاصل کر لیا ہے۔ اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مُردوں کو زندہ کر دیا ہے تم پوچھو گے کہ آخر اس میں ایسی کونسی ظاہری کشش ہے جس نے لوگوں کے دل اپنی طرف کھینچ لئے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی ظاہری کشش کا مرہونِ منت ہے جو ظاہر دارِ مبلغوں اور مصلحوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ معجزہ ایک نظم نے دکھایا ہے جس کے حسن و جمال کے آئینے میں فلسفہ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں اس میں خیالات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ وحدت اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے، اور اس کی منطق سازی کائنات کے لئے آوازِ غیب کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ایک مثنوی "اسرار خودی" پر منحصر نہیں اقبال کی ساری شاعری اور نثری کاوش کائنات اور نوع انسان کے لئے آواز غیب کی حیثیت رکھتی ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ آواز بلند اور وسعت پذیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں اقبال کے فکر و فن پر کام ہو رہا ہے۔ ہر قوم یہ سمجھتی ہے کہ اقبال نے

اُسے بیداری، عمل اور ترقی کا پیغام دیا ہے۔

لیکن پاکستان اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ وہ اقبال ہی کی فکری رہنمائی کا ثمر بن کر وجود میں آیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں اقبال کی شخصیت، فکر اور شاعری پر بہت کام ہوا ہے۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت ابو عبید ثقفیؒ

(بحوالہ اقبالؒ)

عربی اور فارسی زبانوں کی طرح تاریخ اسلام کے مطالعے سے بھی ہم تساہل برت رہے ہیں۔ اس تساہل کا ایک نمونہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت ابو عبید ثقفیؒ کی نمایاں شخصیتوں کو خلط ملط کر دینا ہے۔ کلامِ اقبال میں ان دو بزرگوں کا ذکر آیا اور اقبال کے اکثر شارح اور مترجم ان دونوں شخصیتوں کو ایک سمجھ بیٹھے۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کا ذکر اقبال کے ہاں بانگِ درا حصہ سوم میں جنگِ یرموک کے ایک واقعے کے سلسلے میں آیا ہے (اس واقعہ میں مذکور نوجوان عاشقِ رسولؐ کو بھی کسی شارح بانگِ درا نے متعارف نہیں کرایا) اور حضرت ابو عبید ثقفیؒ کا مثنوی رموزِ بیخودی میں اخوتِ اسلامی کی وضاحتی مثال کے طور پر۔ پہلا واقعہ ۱۳ ہجری سے متعلق ہے اور دوسرا ۱۵ ہجری (جنگِ نمارق) سے متعلق۔ جنگِ یرموک کا تعلق شام سے اور جنگِ نمارق کا ایران کی سرزمین سے ہے حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ ایک صحابی تھے اور حضرت ابو عبید ثقفیؒ ایک تابعی۔ گو اخوتِ اسلامیہ کی روح دونوں واقعات میں مضمر ہے۔ مگر اقبالؒ نے جنگِ یرموک کے واقعے سے عشقِ رسولؐ کے جذبے کو اجاگر کیا ہے۔

جنگِ یرموک، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور ایک نوجوان عاشقِ رسولؐ

یرموک کی جنگ مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان ۱۳ھ (خلافتِ صدیق اکبرؓ کے آخری ایام سے) تا ۱۵ھ کے درمیان جاری رہی اور آخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی۔ اس جنگ کے کئی محاذ تھے جیسے دمشق اور فحل (اردن) اور اس کے دوران خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو عساکرِ اسلامی سے سبکدوش کر کے حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو ان کا جانشین نامزد کر دیا۔ حضرت ابو عبیدہ

بن جراح (وفات ۱۸ ھ) عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور انہیں امین الملت کا لقب ملا ہوا تھا۔ ان کی جلالت و عظمتِ شان اس واقعہ سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ کے وصال کے موقع پر جب مسلمان سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلیفۃ الرسول کے انتخاب کے بارے میں سوچ رہے تھے، تو حضرت ابوبکر صدیق انہیں یا حضرت عمرؓ کو منتخب کرنے کے حق میں تھے مگر بالآخر لوگوں نے حضرت صدیقِ اکبرؓ کو ہی منتخب کر لیا۔

علامہ اقبال عاشقِ رسول ہی نہ تھے، وہ عاشقانِ رسولؐ کے بھی عاشق تھے۔ چنانچہ مثنوی اسرارِ خودی میں فرمایا:

عاشقانِ او ز خوبان خوب تر　　خوشتر و زیبا تر و محبوب تر

ان کے ہاں عاشقِ رسولؐ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت امام مالکؒ و امام بوصیریؒ کا ذکر بڑی دل سوزی کے ساتھ ملتا ہے۔ "جنگ یرموک" کا ایک واقعہ بھی دراصل ایک نوجوان صحابی اور عاشقِ رسولؐ کا واقعہ ہے جو حضرت رسول اکرمؐ کی چند سالہ جدائی کے ہاتھوں بے قرار تھا اور جو جامِ شہادت نوش کر کے بہشتِ بریں میں دیدارِ رسولؐ سے متمتع ہونے کا آرزو مند تھا۔ اقبالؒ نے ان کا نام نہ لکھا تھا مگر یہ دراصل رسول اللہ کے ایک نواسے حضرت علی زینبی ابن ابوالعاص تھے جنہیں جناب محمد یوسف کاندھلوی نے یوں متعارف کروایا ہے:

" سیدنا حضرت علی زینبی بن ابو العاص۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے اور محبوب حقیقی نواسے ہیں۔ آپ آنحضورؐ کی سب سے بڑی بیٹی سیدہ زینبؓ شہید کے بطنِ مبارک سے پیدا ہوئے۔ سیدہ زینبؓ آنحضورؐ کی سب سے بڑی اور محبوب صاحبزادی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں افضل البناتی (یعنی ساری بیٹیوں میں افضل) فرمایا ہے۔ کیوں کہ سیدنا زینبؓ نے اسلام کی خاطر بہت تکالیف اٹھائیں اور شہادت پائی۔

آنحضرتؐ نے سیدنا علی بن ابوالعاصؓ کو اپنی پیاری بیٹی سیدنا زینبؓ سے

مانگ لیا تھا اور عربی دستور کے مطابق رضاعت (دودھ پینے) کے دو سال قبیلہ بنی غاضرہ میں گزارے۔ زندگی کے تمام اوقات سیدالمرسلین کی تربیت اور آغوش میں گزارے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علیؓ بن ابوالعاصؓ کی فوجی تربیت خود اپنی نگرانی میں دلوائی۔ تیر، تلوار اور نیزہ وغیرہ خود چلانا سکھایا۔ اور یہی تربیت تھی جس کی وجہ سے جنگِ یرموک میں اس شیرِ خدا و رسول نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دنیا آج تک حیران ہے۔ تنہا بہت سے کفار کو تہ تیغ کر دیا۔ کفر و اسلام کی اس جنگ میں لشکرِ اسلام کی طرف سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے رجب المرجب ۱۵ھ کو اس نواسۂ رسولؐ نے جام شہادت نوش کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہی وہ عظیم ہستی ہے کہ جو فتح مکہ کے اہم ترین موقعہ پر آنحضرتؐ کے ساتھ ان کی اونٹنی پر سوار تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوشِ مبارک پر سوار ہو کر آپ نے خانہ کعبہ کے بتوں کو توڑنے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

جنگِ یرموک کا ایک واقعہ

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظرِ حنا کی عروسِ زمینِ شام

اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آکر ہوا امیرِ عساکر سے ہمکلام

اے بو عبیدہؓ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام

بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

جاتا ہوں میں حضورِ رسالتؐ پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغ بے نیام

بولا امیرِ فوج کہ "وہ نوجواں ہے" تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام

پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام!

پہنچے جو بارگاہِ رسولِؐ امیں میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے

جنگِ یرموک کے واقعے کا ایک حصّہ جنگِ نمارق سے ملتا جلتا ہے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے دمشق وغیرہ میں مفتوحہ علاقے کے رومیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان باندھے تھے، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے انہیں، بعض صحابہ کرامؓ کے اعتراض کے باوجود بتمام پورا کیا اور فرمایا: "ہر مسلمان بھائی کا وعدہ پورا کرنے میں ہمیں پورا تعاون کرنا چاہیے۔"

حضرت ابو عبید ثقفی اور جنگ نمارق۔

فتح ایران کے سلسلے میں باقاعدہ کوششوں کا تعلق عہد فاروقیؓ سے ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جو واقعہ لکھا، یہ اگرچہ یزدگرد سوم کے عہد سے پہلے کا ہے، مگر جابان "یزدگرد سوم کے سپہ سالاروں میں بھی شامل رہا ہے۔ جنگِ نمارق عرب و ایران کی معروف جنگ تھی۔

حضرت عمرؓ نے جب اپنی خلافت کے آغاز میں ایران کی طرف عساکر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو حضرت ابو عبیدؓ ثقفی نے سپہ سالاری کے لیے اپنا نام پیش کیا جسے خلیفۃ الرسولؐ نے قبول کر لیا۔ بعض صحابہ کو ایک تابعی کے سپہ سالار بنائے جانے پر اعتراض ہوا، مگر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ابو عبید اپنے ماتحت صحابہؓ کا احترام ملحوظ رکھیں گے اور پُرجوش قیادت کا مظاہرہ کریں گے، بعد میں ایسے ہی ہوا۔ جنگِ نمارق میں ایرانی افواج کے قائد رستم، نرسی اور جابان تھے۔ آخرالذکر کو حضرت مطہر بن خفہ ربیعی نے عین جنگ کے دوران گرفتار کر لیا جب کہ اس کے ساتھ دو غلام بھی تھے۔ حضرت مطہر کو اس وقت معلوم نہ تھا کہ وہ جابان ہے اور ایرانی فوج کے قائدین میں شامل ہے۔ اس نے جب منت سماجت کی اور اپنے بڑھاپے کے پیشِ نظر جان کی امان مانگی تو حضرت مطہر نے اسے امان دے دی، البتہ اس کے غلام قبضے میں لے لیے۔ بعد میں جب اس کی حیثیت معلوم ہوئی تو مسلمانوں نے حضرت ابو عبید ثقفیؓ سے مطالبہ کیا کہ اس دغاباز دشمن کو قتل کر دیا جائے مگر حضرت ابو عبید ثقفیؓ نے حضرت مطہر کے امان دینے کے فیصلے کو بحال رکھا اور فرمایا کہ ہر مسلمان کا قول و پیمان محترم ہوتا ہے اور دوسرے اور دوسرے مسلمانوں کو اسے پورا کرنے میں معاونت کرنی چاہیے۔ اقبال کی نظم مشمولہ مثنوی رموزِ بیخودی نقل کرنے سے قبل یہ بات بیان کرنا ضروری ہے کہ حضرت ابو عبید ثقفیؓ ایرانیوں کے خلاف ایک دوسرے

معرکے کے دوران ایک جنگی ہاتھی کے پاؤں تلے آکر شہید ہو گئے تھے :

حکایت بوعبید و جابان در معنیٔ اخوتِ اسلامیہ

شد اسیرِ مسلمے اندر نبرد — قائدے از قائدانِ یزدجرد
گبر یاراں دیدہ و عیار بود — حیلہ جو و پرفن و مکار بود
از مقامِ خود خبردارش نہ کرد — ہم ز نامِ خود خبردارش نہ کرد
گفت می خواہم کہ جاں بخشی مرا — چوں مسلماناں اماں بخشی مرا
گرد مسلم تیغ را اندر نیام — گفت خونت ریختن بر من حرام
چوں درفشِ کاویانی چاک شد — آتش اولاد ساساں خاک شد
آشکارا شد کہ جابان است او — میر میر بازان ایران است او
قتل او از میر عسکر خواستند — از فریب او سخن آراستند
بو عبید آن سیدِ فوج حجاز — در وغا عزمش ز لشکر بے نیاز
گفت اے یاراں مسلمانیم ما — تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است — گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است
ہر یکے از ما امینِ ملت است — صلح و کینش صلح و کینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جان فرد — عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد
گرچہ جاباں دشمنِ ما بودہ است — مسلمے او را اماں بخشودہ است

خونِ او اے معشرِ خیر الانامؐ
بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام

ان اشعار کا ترجمہ اور مفہوم یوں ہے۔

ایک جنگ میں یزدگرد سوم کے سپہ سالاروں میں سے ایک کسی مسلمان کے ہاتھ قید ہو گیا۔ یہ آتش پرست بہت تجربہ کار، چالاک، مکار اور چالیں جاننے والا تھا۔ اس نے مسلمان سپاہی کو اپنا نام بتایا نہ مقام۔ بولا "چاہتا ہوں کہ تو میری جان بخش دے اور مسلمانوں کی طرح مجھے پناہ و امان دے دے۔" مسلمان سپاہی نے شمشیر نیام

میں ڈال کر کہا: "تیرا خون بہانا میرے لیے حرام ہے۔" بعد میں جب ایرانی پرچم چاک ہوا اور ساسانیوں کی آگ مٹی میں مل گئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایرانی فوج کا ایک قائد جابان ہے۔ لوگ اس کی مکاری کی باتیں کرنے لگے اور اپنے امیرِ لشکر سے کہنے لگے کہ اسے قتل کرنے کی اجازت دیں مگر حضرت ابو عبید ثقفیؓ جو عسکرِ اسلامی کے سپہ سالار تھے اور جن کا عزم میدانِ جنگ میں لشکر سے بے نیاز تھا، بولے: بھائیو! ہم مسلمان ہیں۔ ہم ایک ہی بربط کے تار اور صدا ہیں۔ بلالؓ اور قنبرؓ کے گلے کی صدا ہمارے نزدیک حضرت علیؓ اور حضرت ابوذرؓ کی صدا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک ملت کا امین ہے اور ہر ایک کی صلح یا جنگ ملتِ اسلامیہ کی صلح یا جنگ ہوتی ہے۔ جس ملت میں ہر فرد کے وجود کا بنیادی احساس ہو وہاں ہر فرد کا عہد و پیمان، ملت کا عہد و پیمان بنتا ہے۔ درست ہے کہ جابان ہمارا دشمن ہے لیکن اسے ہمارے ایک مسلمان بھائی نے پناہ دے دی ہے۔ لہٰذا اے خیر الانامؐ کی امت کے لوگو! مسلمانوں کی تلواروں پر اب اس کا خون بہانا حرام ہو چکا ہے۔

اقبالؔ اور وحدتِ ملیؔ

آج کل سیاسیات کی کتابوں میں وطن اور قوم کے کمی مادی عناصر بتاتے جاتے ہیں مگر اقبال نے اسلامی تعلیمات کے مطابق ہمیں وحدت ملی کے روحانی اور دینی عناصر کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ایک جغرافیائی وطن کی احتیاج مسلّم ہے۔ مگر مسلمان اس خطہ زمین سے محبت رکھنے کے باوجود اس کا پابند نہیں ہو جاتا۔ وہ رب العالمین پر ایمان رکھتا ہے اور رحمۃ للعالمین کی اُمت کا جزو بنتا ہے۔ لہٰذا سارے جہاں کے انسانوں سے بالعموم اور مسلمانوں سے بالخصوص اس کی وابستگی غیر متزلزل رہتی ہے۔ "مذہب" کے عنوان سے ایک قطعے میں علامہ اقبال نے اس نکتے کو واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کی ملّت اور قومیت کی بنیاد روحانی اور دینی ہے اور وہ ملک یا نسب پر منحصر نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین کا دامن مضبوطی سے تھامے رہیں:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی[۱]

مندرجہ بالا قطعے کا آخری شعر خصوصیت کے ساتھ توجہ طلب ہے۔ اقبال فرماتے

ہیں کہ دامن دین کو مضبوطی سے پکڑنے سے مسلمانوں کو جمعیت اور اتحاد نصیب ہوں اور اس سے ان کی ملت عالم وجود میں آتی ہے کیوں کہ منتشر اور غیر متحد افراد کسی ملت کو تشکیل نہیں دے سکتے۔

اقبال نے ملتِ اسلامیہ کے بنیادی عناصر ایسے دو عقائد بتائے ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کے کسی فرقہ یا گروہ کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ان عقائد کو ہم توحید اور رسالت، (ختم نبوت) کے نام سے جانتے ہیں۔ ان دو عقائد کی حضرت علامہ اقبال نے بڑی دل پذیر تعبیرات پیش کی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان ان دو عقائد کے مضمرات کی طرف متوجہ رہیں تو ان میں اختلافات پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

توحید :

توحید کے عام معانی یہ ہیں کہ خدائے واحد کی ذات اور صفات کو ممتاز جانا جائے، خدا کی ہی عبادت کی جائے اور دنیا کے ہر کام میں اس کو دخیل سمجھا جائے اور کسی غیر کو اس کی ذات یا صفات میں شریک نہ سمجھا جائے۔ اقبال کو ان معانی سے انکار نہیں مگر وہ خاص معانی پر بھی توجہ دلاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک خدا کو ماننے والی اُمت فکر و عقیدہ کی طرح عمل اور پالیسی میں بھی متحد و متفق رہتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خالص توحید کا عقیدہ اس وقت صرف مسلمانوں کی متاع ہے کیوں کہ دوسرے ادیان والوں نے چشمہ توحید کو گدلا کر رکھا ہے۔ مگر اس عقیدے کا لازمہ یہ ہے کہ مسلمان فکر کے ساتھ ساتھ عمل کے اعتبار سے بھی متحد ہوں اور ان کی قومی پالیسیوں میں انتشار اور پراگندگی نظر نہ آئے۔ حضرت علامہ نے ذیل کے معنی خیز قطعے کا عنوان 'توحید' رکھا ہے :

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علمِ کلام
روشن اس ضَو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام[1]

اقبال فرماتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کا مستقل نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ عقیدہ توحید کی نشرو اشاعت کرتی رہے۔ انہوں نے توحید کی دیگر برکات پر بھی لکھا ہے جیسے موحد غیر اللہ کے آگے گردن نہیں جھکاتا، وہ غم وحزن سے محفوظ رہتا ہے اور غیر معمولی قوتِ ایمان سے مالا مال ہوتا ہے۔ مگر توحید کے وحدت آمیز پہلو پر انہوں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ مثنوی رموزِ بے خودی کے آخر میں انہوں نے اخلاص یا توحید نام کی سورت (۱۱۲) کی ایک بصیرت افروز تفسیر بھی لکھی ہے۔ اس تفسیر کا مدعا یہ ہے کہ عقیدہ توحید نے مسلمانوں کو ایک متحد، مستقل اور بے نظیر ملت بنایا ہے۔ آیئے سورہ مذکور کی آیات پر ملی نقطہ نگاہ سے غور کریں:

قل ھو اللہ احد	آپ کہیں کہ اللہ ایک ہے
اللہ الصمد	اللہ بے نیاز ہے۔
لم یلد ولم یولد	نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے۔
ولم یکن لہ کفواً احد	اور اس کی برابری کا دوسرا کوئی نہیں۔

اقبال نے ان چاروں آیات کی تفسیر میں جو باتیں لکھی ہیں، ان کے اہم نکات یہ ہیں، پہلی آیت "قل ھو اللہ احد" کی توضیح میں وہ فرماتے ہیں کہ تخلقوا با اخلاق اللہ کے مطابق مسلمان اللہ کے اخلاق اور طریقہ اپنائیں اور خدائے واحد پر کامل ایمان رکھنے کی مناسبت سے خود متحد اور متفق بنیں۔ دوسری آیت "اللہ الصمد" کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی

---

[1] "ضربِ کلیم"، ص ۲۵۔

اور اجتماعی زندگی میں استغنا برتیں۔ بحیثیت فرد کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور قوم کی حیثیت سے بھی دوسروں کے دستِ نگر نہ بنیں۔ تیسری آیت کریمہ 'لم یلد ولم یولد'، مسلمانوں کو محدود وطنیت، ذات، رنگ، نسل، زبان اور اس قبیل کی ان تمام نسبتوں سے آزاد رہنے کا درس دیتی ہے جنہیں غیر مسلم ماہرین سیاسیات قومیت کے اجزا بنتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی ملت، ایک عالمگیر ملت ہے۔ چوتھی آیہ مبارکہ 'ولم یکن لہ کفواً احد' میں مسلمانوں کو ایک بے نظیر اور ممتاز قوم بننے کا اشارہ ملتا ہے کیونکہ توحید خالص کی علم بردار ملت، غیر توحیدی قوموں کے تشبیہ نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ مسلمان قوم کو متحد، بے نیاز، قیود و حدود سے آزاد اور دوسری اقوام سے ممتاز ہونا چاہیے اور سورہ اخلاص ان ہی امور کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

رسالت:

ہر نبی و رسول نے ایک ملت و قوم کی تشکیل کی ہے مگر آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، رسالت و نبوت کی اور ہی شان ہے کیونکہ آپ ختم نبوت اور عالمی رسالت کے حامل تھے۔ عقیدہ ختم نبوت کا لازمہ ہے کہ مسلمان متحد رہیں اور اپنے دین کی تجدید پر توجہ دیں یعنی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زندگی کے نئے مسائل کا حل تلاش کرتے رہیں۔ اقبال نے اپنے سات انگریزی خطبات میں سے ایک خطبہ نظام اسلام کی حرکت پذیری کے لیے مخصوص کیا ہے۔ علامہ مرحوم نے اس خطبے میں قرآن مجید، حدیث و سنتِ رسول، اجماع اور قیاس (اجتہاد) کی مدد سے تجدید دین کے اصول بتائے ہیں۔ اقبال نے رسالت محمدیہ کی مخصوص صورت (ختم نبوت) کو توحید کے بعد مسلمانوں کے اتحاد کا بہت بڑا موجب قرار دیا ہے۔ اقبال کے معنوی مرشد مولانا جلال الدین رومی (وفات ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) کے سات خطبات میں ایک خطبے میں رومی نے یوں فرمایا ہے کہ سنتِ رسول مسلمانوں کے اتحاد کا موجب رہی ہے اور رہے گی۔ حضرت علامہ اقبال نے اس بات کو ختمِ نبوت، حدیث و سنت اور عشقِ رسول وغیرہ کے حوالے سے بار بار سمجھانے کی کوشش کی ہے اقبال عصرِ حاضر میں عشقِ رسول ؐ کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ انہوں نے نبی اکرم ؐ کی ذات

سے حقیقی اُنس و وفا رکھنے کو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی پراگندگی کا مداوا بنایا ہے۔ جوابِ شکوہ کے آخری چار بند اقبال نے اسی درس کے لیے مخصوص کیے ہیں کہ عشقِ رسول ہی مسلمانوں کے اتحاد اور ان کے معنوی ارتقاء کا موجب ہے:

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے
ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے
دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ، رفعنا لک ذکرک، دیکھے
مردمِ چشمِ زمین یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا

گرمیٔ مہر کی پروردہ ، ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اسی نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح
عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تیری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تیری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں[۱]

اقبال نے مسلمانوں کو عشقِ رسول کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بعض بزرگانِ دین کا ذکر عاشقانِ رسول کے طور پہ کیا ہے مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت بلالؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت کعبؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، نواسہ رسول حضرت علی زینبی (ابنِ زینب و ابوالعاصؓ)، امام مالک، بایزید بسطامی اور امام بوصیری وغیرہ کا۔ توحید و رسالت کے عقائد کے ساتھ کئی دیگر عقائد اور شعائر منسلک ہو کر مسلمانوں کی وحدت ملی کو عملی بناتے ہیں، مذکورہ نظم میں اقبال نے فرمایا ہے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟[۲]

۱؎ بانگِ درا، ص ۲۳۱ - ۲۳۲۔ ۲؎ "بانگِ درا"، ص ۲۲۴۔

قرآن مجید اور احادیثِ رسولؐ میں مسلمانوں کی وحدتِ ملی کی واضح تلقینات اور ہدایت موجود ہیں۔ مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی قرار دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر بھائیوں کے درمیان اختلاف ہو، تو دوسرے بھائیوں کو کوشش کر کے اسے رفع کر دینا چاہیئے (آیہ ۱۰ سورہ ۴۹)۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو کسی عمارت کی اینٹوں کے شبیہ بنایا ہے کہ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے۔ اسی طرح ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو سہارا دیتا ہے، اور اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے یثرب یعنی مدینہ منورہ میں ہجرت فرما کر نبی اکرمؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان جو رشتہ مواخات قائم کیا تھا وہ اس اخوت کا عملی نمونہ تھا۔ اسلام سے قبل عربوں کا انتشار ایک معلوم امر تھا۔ وہ کئی قبیلوں میں منقسم تھے۔ نبی اکرمؐ نے اسلامی تعلیمات کے ذریعے انہیں ایک مثالی اتحاد کا حامل بنایا۔ وہ آپس میں بے حد مہربان تھے، مگر باطل قوت کے خلاف سینہ سپر ہونا ان کا معمول تھا۔ (قرآن مجید آیہ ۲۹۔ سورہ ۴۸)۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان جو مختلف قبیلوں اور فرقوں سے منسوب ہیں یہ محض شناخت کی سہولت کی خاطر ہے اور یہ نسبت کسی طرح بھی باعث فضیلت نہیں۔ کیوں کہ فضیلت تو تقویٰ اور خدا ترسی کے ذریعے ہاتھ لگتی ہے (۱۳/۴۹)۔ خدائے تعالیٰ مسلمانوں کو یہ احساس یاد دلاتا ہے کہ اس نے انہیں بھائی بھائی بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی اسلامی معاشرہ وہ ہے جس میں اتحاد و اتفاق ہو، ملی یکجہتی ہو اور بقول اقبال اخوت، حریت اور مساوات کا دور دورہ ہے۔ البتہ مسلم حیاتِ اجتماعیہ کے ان سہ گانہ اصولوں کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے کیوں کہ موجودہ زمانے میں ان الفاظ کے معانی دگرگوں ہو گئے ہیں۔ اخوت یعنی بھائی چارہ مسلمان معاشرے کے لوگ ایک دوسرے کو بھائی جانتے ہیں اور ادنیٰ اعلیٰ بالغ مسلمان بھی قابلِ توجہ مانا جاتا ہے۔ اور کسی ایک کا فیصلہ دوسروں کے لیے قابلِ احترام ہونا چاہیے۔ اقبال نے مثنوی رموزِ بے خودی میں حضرت ابو عبیدہ ثقفیؓ کا ایک واقعہ نظم کیا

ہے ۔ اس جنگ کے دوران ایرانی افواج کا ایک اعلیٰ افسر، جابان ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھ اسیر ہوا مگر کسی حیلے بہانے سے اس نے مسلمان سپاہی سے جان کی امان حاصل کر لی جابان کی اصلیت سے جب مسلمان آگاہ ہوئے تو انہوں نے حضرت ابو عبید ثقفیؓ سے مطالبہ کیا کہ اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ اس نے دھوکے سے امان حاصل کی تھی مگر مسلمانوں کے سپہ سالار نے اس مطالبے سے اتفاق نہ کیا ۔ انہوں نے فرمایا کہ جابان کو ہمارے ایک مسلمان بھائی نے پناہ دی ہے لہذا ہم پر واجب ہے کہ اس کے فیصلے کا احترام کریں ۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اخوت کا عملی پہلو یہی ہے جو اسلام کے شورائی نظام میں پنپتا رہا ہے ۔ حریت یعنی آزادی ۔ یہ آزادی بڑی جامع ہے یعنی گفتار اور عمل کی آزادی ۔ اسلام نے مسلمانوں کی بامقصد حریت کا تصور دیا اور مسلم معاشرے میں اسے نافذ کیا ۔ چنانچہ خدا و رسول کے احکام کی پابندی کے تحت مسلم معاشرہ ہر قسم کی تمدنی اور معاشرتی حریت کا حامل ہے ۔ موجودہ دور میں حریت کو جمہوریت کہہ سکتے ہیں مگر اقبال کو مغربی طرز کی "بے مادر و پدر" جمہوریت پسند نہ تھی مثلاً فرمایا :

جو دونیٔ فطرت سے نہیں لائقِ پرواز
اس مرغک بیچارہ کا انجام ہے افتاد
ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا
ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیاد
اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد[1]

یا

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

---

[1] بال جبریل ۔ ص ۲۲۲ ۔

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ[1]

مساوات یعنی برابری۔ اس سے مراد قانون کی نظر میں برابری ہے۔ اسلام کی رو سے معاشرے کا ہر چھوٹا یا بڑا شخص قانون کے سامنے جواب دہ ہے۔ تاریخِ اسلام میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کی رو سے معمولی سے معمولی مظلوم کی دادرسی کی گئی اور اعلیٰ سے اعلیٰ ظالم کو مناسب سزا دی گئی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اخوت، حریت اور مساوات کے اصولوں پر گامزن اور توحید و رسالت کے عقائد کے تقاضوں پر متوجہ ملتِ اسلامیہ کو، ہر اسلامی ملک اور پورے عالمِ اسلام کے پیمانوں پر متحد اور متفق رہنا ضروری ہے۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد[2]

اسی لیے وہ بار بار زور دیتے ہیں کہ دامن دین کو مضبوطی سے تھاما جائے:

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و ملّت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر[3]

پس پاکستان کے مسلمانوں کو اقبال نے دو طرح کی وحدت اور یکجہتی کا درس دیا ہے۔ ایک ملکی حد تک یعنی پاکستان بھر کے مسلمان ایک دوسرے کو بھائی بھائی جانیں اور ہر قسم کی علاقائی اور ذات یا برادری کی حدود سے آزاد ہو کر اسلامی اخوت کا مظاہرہ کریں۔ دوسرے یہ کہ یہاں کے مسلمان عالمِ اسلام کے دیگر ممالک کے ساتھ ممکنہ حد تک تعاون اور اتحاد رکھیں اور دوسروں کے رنج و مسرت میں اپنے آپ کو برابر کا شریک جانیں۔ تقسیمِ ہند سے قبل کے برصغیر اور اس کے بعد پاکستان کے مسلمان عالمی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ

---

[1] "ضربِ کلیم"، ص ۷۵-۷۶۔ [2] "ضربِ کلیم"، ص ۷۵-۷۶۔
[3] "بانگِ درا"، ص ۳۰۱۔

اتحاد میں پیش پیش رہے، مگر ملکی پیمانے پر مثالی اتحاد میں ابھی مزید کوششیں کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بعض غیر اسلامی تصورات اس کے سدِ راہ بن جاتے ہیں۔ اقبال کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کا انفرادی اور اجتماعی طور پر تعمیر اور تشکیل کرے اور اس مقصد کے لیے اس نے خودی اور بے خودی کا پروگرام پیش کیا ہے۔ ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلم اقلیتیں محترم اور محفوظ رہیں گی۔ اقبال نے عظمتِ انسانی کا اسلامی تصور جس طرح یاد دلایا ہے اس سے وہ بھی بہرہ مند ہوں گی۔

اسی مناسبت سے اس راقم نے سہ ماہی مجلہ "اقبال ریویو" کی جولائی ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ "ہمارے معاشرے کی تعمیرِ نو کی خاطر کامل اتحاد کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا قومی اور دینی وجود متشخص اور معین ہو سکے۔" (صفحہ ۱۷)

اقبال پاکستان اور وحدتِ ملی کی اس مختصر بحث کا خاتمہ ہم اقبال کی انگریزی یادداشتوں کے ایک اقتباس پر کر رہے ہیں جو شذراتِ فکرِ اقبال کے نام سے اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہے اور حضرت علامہ اقبال نے انہیں ۱۹۱۰ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔

"ــــــ آؤ ہم سب مل کر آگے بڑھیں، طبقاتی امتیازات اور فرقہ بندی کے بت ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیں تاکہ اس ملک کا مسلمان ایک بار پھر ایک عظیم اور بامعنی قوت کی صورت میں متحد ہوں۔ ہمارے ملی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو۔ جونہی یہ گرفت ڈھیلی پڑی ہم کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔"

اقبالؒ، اسلامی تصورِ ادب کا عظیم ترجمان

نادان ، ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہُنر کے لئے لازم ہے تگ و دَو
فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہُنرمند
شام اس کی ہے ، مانندِ سحر صاحب پر تو
وہ صاحبِ فن چاہے تو فن کی برکت سے
ٹپکے بدن مہر سے شبنم کی طرح ضَو[۱]

آج کل لفظِ 'ادب' عام طور پر دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک نثر و نظم کی جملہ اصناف کے لیے اور لٹریچر کے ہم معنی ، دوسرے اپنا اور دوسروں کا احترام کرنے اور اخلاقی لحاظ کرنے میں لفظِ ادبیات' ادب کے پہلے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اقبالؔ کے پہلے منقولہ شعر میں بھی ادب اسی مفہوم کا آئینہ دار ہے۔ دوسرے معنی کے لئے عام طور پر 'سابقوں' سے کام لیتے ہوئے با ادب اور بے ادب وغیرہ مرکب کلمات بنائے جاتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ کے ہاں 'ادب' اس معنی میں بھی وارد نظر آتا ہے جیسے :

دیں سراپا سوختن اندر طلب
انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست
بے ادب بے رنگ و بوئے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب
روزِ من تاریک می گردد چو شب

تاب و تب در سینہ افزاید مرا
یادِ عہد مصطفیٰ آید مرا (۲)

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لوئے لالا (۳)

ادب پیرایۂ نادان و داناست
خوش آنکو از ادب خود را بیاراست
اور
ندارم آں مسلماں زادہ را دوست
کہ در دانش نزود و در ادب کاست (۴)

..یہاں ہمیں ادب و ادبیات یعنی لٹریچر کے بارے میں علامہ اقبال کے افکار سے بالاختصار سروکار ہے۔ علم ادب، شعر و ادب کی عمدگی سے تخلیق کرنے والے ادبی علوم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے علم لغت، لسانی قواعد، بیان، بدیع اور معانی کے علوم کے لئے آداب (جمع ادب) البتہ رسوم اور طور طریقے کے معنی میں مستعمل رہا ہے۔ پروفیسر کارلو الفانسو نالینو (۱۸۷۲ - ۱۹۳۸ء) نے ایک تحقیقی مقالے میں(۵) مدنیتِ اسلام میں لفظ 'ادب' کے معنوی تنوع اور ارتقا سے بحث کی ہے۔ ماحصل یہ کہ جاہلی دور کے عربی ادب میں لفظ 'ادب' آبا و اجداد کے طور طریقوں کے لئے مستعمل رہا ہے۔ آج 'ادیب' بالعموم اسے کہتے ہیں جو اصنافِ نثر میں تخلیقات پیش کرے مگر دورِ جاہلی میں باپ دادا کے رسوم و اطوار اور خاندانی مفاخر کو خاطر نشیں کرنے والا شخص 'ادیب' کہلاتا تھا۔ مگر اس دور میں بھی 'ادیب' کے معنی رفتہ رفتہ پڑھے لکھے اور دانشور شخص کے ہو گئے تھے۔

قرآن مجید میں لفظ 'ادب' یا اس کے مشتقات وارد نہیں ہوئے۔ البتہ لفظ 'دأب' بمعنی مثال اور طریقہ قرآن مجید میں آیا ہے (۶) اور اس کی جمع 'اداب' ہے۔ محققین کا قیاس ہے 'دأب' مقلوب ہو کر 'ادب' بنا ہے یا اس کی جمع 'آداب' سے مفرد 'ادب' وضع کیا گیا ہے۔

ادب، ثقافت و فرہنگ کا ایک اہم جزو ہے۔ اور آدابِ زندگی اس میں ہمیشہ شامل ہوتے رہے ہے مگر ادب کا اسلامی تصور، نیکی اور شرافت کا آئینہ دار ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے یہ بات کئی مواقع پر واضح فرمائی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیمات کو پیش کرتے رہے اور سوائے ان تعلیمات کے، انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی ہے:

گر دلم آئینہ بے جوہر است
در بحرفم غیر قرآن مضمر است
ای فروغت صبح اعصار و دہور
چشمِ تو بینندہ ما فی الصدور
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پاکن مرا

میانِ آب و گلِ خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم (۷)

اقبال قرآنی تعلیمات سے مستنیر ادب و شعر کے قائل تھے اور ان کی منثور و منظوم تصانیف اس امر پر شاہدِ صادق ہیں۔

احادیث رسولؐ میں ادب، پسندیدہ طور طریقوں کے لئے وارد ہوا ہے۔ بخاری شریف میں ایسی احادیثِ پاک یکجا ملتی ہیں جن میں والدین کے اولاد کے لئے حقوق، بیواؤں، بیماروں، تنگدستوں کے حقوق، ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک، حسنِ گفتار، نرمی برتنے، حیوانات پر ترس کھانے، حسنِ اخلاق، عفو و درگزر، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے، بخل و کنجوسی سے بچنے، تعریف بیجا سے احتراز، حسد و نفاق سے دوری اختیار کرنے، بردباری اپنانے، اخوت اور بھائی چارہ، بدکاروں کی مذمت، حسِ مزاح، اصولِ ملاقات، شرم و حیا، غصے

سے پرہیز اور مہمان نوازی وغیرہ کا ذکر ہے اور ان احادیث کا عنوان 'ادب' رکھا گیا ہے۔ گویا مسلمانوں کے ادب و شعر میں ان باتوں کا ذکر ضروری امور میں سے ہے۔ عصرِ اسلامی میں 'ادب' آباء و اجداد کے طور طریقوں کے معانی کھو بیٹھا۔ مگر پہلی صدی ہجری میں اس کے معنی پسندیدہ اور محمود روش کے تھے۔ دوسری صدی ہجری سے غیر دینی علوم و فنون 'ادب' کہلانے لگے۔ عبداللہ بن المقفع (وفات تقریباً ۱۴۰ھ) نے اپنے رسالہ 'الادب الصغیر' میں یوں لکھا ہے

"اس رسالے کا مقصدِ تالیف یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے لوگوں کے افکار کی جلا ہو، ان کی معنوی بصیرت میں اضافہ ہو اور ان کی تعمیرِ قلوب ہو۔ توقع ہے کہ اسے پڑھ کر لوگ پسندیدہ کاموں اور مکارمِ اخلاق کی طرف متوجہ ہوں گے" (۸)

بعد کی صدیوں میں اسلامی قلمرو کی وسعت کے ساتھ ساتھ لفظِ 'ادب' کے معانی میں بھی تغیر آتا گیا۔ عباسیوں نے دمشق کی جگہ بغداد کو دارالحکومت قرار دیا (۱۳۲ھ) اور اس طرح عربوں پر عجمی اثرات بڑھنے لگے۔ اب 'ادب' مخصوص اور پیشہ ور افراد کی دانش اور معلومات کے ہم معنی ہو گیا (دوسری ہجری کے اواخر سے)۔ اس زمانے کی کتب جیسے ادب الکاتب اور ادب الندیم اس مفہوم کو ظاہر کرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس دانش اور معلومات میں شعر و شاعری، تصنیف و تالیف، مزاح و دل لگی اور دیگر تخلیقات جیسے لغت شناسی، انشا پردازی اور جملہ فنونِ لطیفہ شامل ہوتے گئے، تا آنکہ انیسویں صدی عیسوی کی عربی اور دیگر اسلامی زبانوں میں 'ادب' یورپ کے لفظ لٹریچر کے مترادف بن گیا۔

بہر حال تاریخ اسلام میں لفظِ 'ادب' کا ارتقاء اس بات کا مظہر ہے کہ یہ لفظ ہمیشہ مفید علوم و فنون اور اصلاحِ اخلاق اور تہذیبِ نفس کے امور کا متضمن رہا ہے۔ یہ ادب نثر میں ہو یا نظم میں 'ادب برائے ادب' نہیں بلکہ 'ادب برائے زندگی' کے عنوان کا سزاوار ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی خداداد بصیرت اور استعداد کی مدد سے عصرِ حاضر میں اسی اسلامی تصورِ ادب کی ترویج اور احیاء کی کوشش کی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک مختصر مگر فکر انگیز مقالے میں، جس کے انگریزی اور اردو دونوں متن دستیاب ہیں، (۹) ادب کے اسلامی تصور کو واضح کیا ہے۔ اُردو میں اس کا عنوان جناب

رسالتمآبؐ کا ایک ادبی تبصرہ ہے۔ اقبال اگرچہ علم معاشی کے روادار نہ تھے۔

یہ مدرسہ، یہ کھیل، یہ غوغائے روارو

اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غم تو

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں

جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو (۱۰)

مگر اپنے مقالے میں انہوں نے اس عنصرِ صداقت کو پیش کیا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے تھا۔ جاہلی دور کا عرب شاعر امرءالقیس بہت معروف ہے، وہ عصرِ اسلام سے کوئی چالیس برس پہلے گذرا، اور اس کے کلام سے مے نوشی عیش دوستی اور غیر معمولی قادر الکلامی نمایاں ہے۔ اس شاعر کے بارے میں حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا: اشعر الشعراء وقائد ھم الی النار یعنی وہ اپنے عصر کے جملہ شاعروں میں سب سے بڑا اور دوزخ کی طرف ان کا راہبر ہے۔ حضورؐ پاک نے امرءالقیس کو اس کے شایانِ شان ادبی مقام تو دیا (اشعر الشعراء) مگر اس کے جاہلی تعیش آموز اور مخربِ اخلاق مضامینِ شعر کی بنا پر اسے اور اس کے زمرے کے دیگر شعراء کو دوزخ کا مکین قرار دیا۔ پس ثابت ہوا کہ صرف قادر کلامی وجہِ شرف نہیں ہو سکتی:

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے

فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی (۱۱)

امرءالقیس کے مقابلے میں قبیلہ بنو عبس کے دورِ جاہلی کے شاعر عنترہ کا مرتبہ فروتر تھا اس نے ایک مرتبہ یہ شعر کہا تھا:

لقد ابیتُ علی الطوی واظلہ

حتی بہ کریم المآکل

یعنی میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں یہاں تک کہ میں روزیٔ حلال تک دسترس حاصل کر سکا۔

ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے صحابہ کرام سے یہ شعر سنا تو بُت پرست عنترہ سے ملنے کی خواہش

ظاہر کی اور اس شعر کی بہت تعریف فرمائی۔ اقبال فرماتے ہیں کہ شعر کا مضمون یعنی محنت اور اکلِ حلال ایک بُت پرست شاعر کے لئے سرورِ کائنات کے دل میں کشش پیدا کر دیتا ہے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ الکاسب حبیب اللّٰہ، یعنی کسب و محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔(۱۲) لہذا آپؐ نے کسب و محنت اور روزیٔ حلال کا ذکر کرنے والے بُت پرست شاعر کی بھی تعریف فرمائی۔ اقبال فرماتے ہیں۔ کہ آنحضرتؐ کا یہ مختصر ادبی تبصرہ مسلمانوں کے لئے ابدی راہنما ہے۔ شعر و ادب وہی اچھا نہیں جس میں فنی خوبیاں ہوں، بلکہ معانی اور حاصلِ گفتار پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اقبال اپنے فلسفۂ خودی کی روشنی میں 'خوب و زشت' کے بارے میں یہ حکم لگاتے ہیں کہ خودی کو مستحکم کرنے والے امور مستحسن ہیں اور اسے کمزور اور نحیف کر دینے والے غیر مستحسن۔ لہذا خوب و زشت کی حکمت پر ایمان رکھنے والے مسلمان شعراء اور ادبا کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کی تخلیقات کس نوعیت کی ہیں :

ستارگانِ فضا ہائے نیلگوں کی طرح
تخیلات بھی ہیں تابعِ طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو، وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب(۱۳)

مثنوی اسرارِ خودی میں اقبال نے شاعر کو 'خوب آفریں' اور زشت ناآشنا بنایا اور اس تصور کے برعکس کام کرنے والے شاعروں کی مذمت کی ہے :

سینۂ شاعر تجلی زارِ حُسن
خیزد از سینائے او انوارِ حُسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر

فکر او با ماہ و انجم ہم نشیں
زشت را نا آشنا، خوب آفریں

خضر و در ظلماتِ او آبِ حیات
زندہ تر از آبِ چشمش کائنات

اہلِ عالم را صلا بر خوان کند
آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

نظامی عروضی سمرقندی کی مشہور فارسی کتاب 'چہار مقالہ' میں شاعر کا مقام یہ بتایا گیا ہے کہ خوب کو ناخوب اور ناخوب کو خوب بنائے اور خرد کو بزرگ اور بزرگ کو خرد۔ مگر 'ترجمانِ حقیقت' اس تعریف کے حامی نہ ہو سکتے تھے۔ ان کے نزدیک حقیقی شاعر و ادیب وہی ہے جو اپنی صلاحیتوں کو تقدیم خودی و بے خودی پر صرف کرتا رہے۔ ذیل کے دو شعری قطعے کا عنوان 'ادبیات' ہے:

عشق اب پیرویٔ عقلِ خداداد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے

کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

منقولہ قطعہ 'ضربِ کلیم' میں سے ہے جو مختلف موضوعات پر علامہ اقبال کے خیالات کی حامل ہے۔ اس کتاب کا ایک باب 'ادبیات، فنونِ لطیفہ' ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اور شاعرِ مشرق کے پختہ تر خیالات کی حامل ہے۔ اس کتاب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا

اقبال فرماتے ہیں کہ حقیقی ادیب اور شاعر جس حالت میں بھی ہو، وہ خریدا نہیں جا سکتا - وہ بے نیازانہ زندگی گذارتا ہے - اور مال و منال پر فریفتہ نہیں ہوتا:

قماش و نقرہ و لعل و گہر چیست؟
غلامِ خوشگل و زرین کمر چیست؟
چو یزداں از دو گیتی بے نیاز ند
دگر سرمایۂ اہلِ ہنر چیست ؟ (۱۵)

دینِ اسلام کوئی خشک زاہدانہ دین نہیں کہ ادبیات اور ثقافت کی دیگر شرافت مندانہ شئون کا منکر ہو - دورِ جاہلی میں شعر و شاعری کا بے حد تداول تھا اسی لئے قرآن مجید

کی اثر آفرینی پر لوگوں کو شعر کا گمان گذرتا تھا۔(۱۶) آنحضرت ؐ خود شعر سے تاثر لیتے تھے مثلاً:

"حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شعر پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ٹوکا کہ حرم میں تو شعر پڑھ رہا ہے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمر اس کو چھوڑ دو۔ فانہ علیھم من رشق النبلی۔ یعنی یہ شعر ان کافروں کے لئے تیروں کی سختی سے زیادہ سخت ہے۔" (۱۷)

نفیر نام کا مکی شاعر آنحضرت ؐ کو سخت ایذائیں دیتا رہا۔ فتح مکہ مکرمہ کے موقع پر بھی وہ اپنی گستاخی سے باز نہ آیا تو آنحضرت ؐ کے ایما پر حضرت علیؓ نے اسے قتل کر دیا۔ اس کی بیٹی اس وقت ایسے دردناک اشعار پڑھنے لگی کہ آنحضرت ؐ بھی رونے لگے۔ نفیر کی نعش کی طرف اشارہ کر کے آپ نے فرمایا: یہ محمد رسول اللہ ؐ کا فعل ہے۔ پھر آپ نے اپنی اشک بار آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "یہ فعل محمد ؐ بن عبداللہ کا ہے۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ مکہ مکرمہ کا کوئی مزید شخص قتل نہ کیا جائے۔ (۱۸)

مسلمانوں نے عجمی، مغربی اور یونانی علوم و فنون سے بھرپور استفادہ کیا اور خود دوسروں کو بھی متاثر کیا مگر جیسا کہ خواجہ حالی نے بھی فرمایا۔ قرونِ اولیٰ کا عربی شعر و ادب اخلاق و شرافت اور دردمندی کا مظہر رہا ہے:

عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی
نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانے نے جن کی فصاحت تھی مانی
مٹا دی عزیزوں نے ان کی نشانی
سب ان کے ہنر اور کمالات کھو کر
رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر
ادب میں پڑی جان ان کی زباں سے
جلا دین نے پائی ان کے بیاں سے
سناں کے لیے کام انہوں نے لساں سے
زبانوں کے کوچے تھے رکھو کر ستاں سے

ہوئے ان کے شعروں سے اخلاق صیقل

پڑی ان کے خطبوں سے عالم میں ہلچل

البتہ بعد میں قرآن مجید کی تعلیمات ترک کر دینے اور مخربِ اخلاق مضامین کو نظم کرنے سے عالمِ اسلام کے شعر و ادب کا نقشہ جدید اردو شاعری کے بانی کے الفاظ میں یہ ہے:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر

عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہو علم و دیں جس سے تاراج سارا

وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے

عبث جھوٹ بکنا گر ناروا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے

مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائینگے سارے

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے (۱۹)

قرآن مجید کی سورۃ الشعراء اور ان کے مقلدینِ فکر کو گمراہ اور سرگردانِ عمل بتایا گیا مگر اہلِ ایمان اور نیک سرشت شعراء اس مذمت سے مستثنیٰ کیے گئے ہیں۔ ایک معروف حدیث قدسی ہے کہ ان من البیان لسحراً و ان من الشعر لحکمۃ۔ پس ادباء کی سحر بیانی اور شعراء کی حکمت آفرینی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہر حکمت شعر و ادب اسلام کی رو سے ——— تخلقوا باخلاق اللہ ——— (اللہ کے اخلاق اپناؤ) کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ علامہ اقبال کے سے قادر الکلام مسلمان ادبا اور شعراء نے مسلمانوں کو ہی نہیں، پورے عالمِ انسانی کو مخاطب کیا ہے۔ اقبالؔ نے اپنے عالمی مقام کو اپنی اولین مثنویوں سے بیان کرنا شروع کر

دیا تھا۔

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بر بست و چشمِ ما گشاد
بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است
ایں جرس را کاروانِ دیگر است
از درونِ کارگاہِ ممکنات
برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات

در سکوتِ نیم شب نالاں بُدم
عالم اندر خواب و من گریاں بُدم
جانم از صبر و سکوں محروم بود
وردِ من یا حیّ یا قیوم بود
آرزوئے داشتم خوں کردمش
تا ز راہِ دیدہ بیروں کردمش
سوختن چوں لالہ پیہم تا کجا
از سحر دریوزِ شبنم تا کجا
اشکِ خود بر خویش می ریزم چو شمع
با شبِ یلدا در آویزم چو شمع
یک نفس فرصت ز سوزِ سینہ نیست
ہفتہ ام شرمندہ آدینہ نیست

ادبیات ثقافت کا ایک جزو ہیں اور اسلامی ثقافت کی مختلف شئون جیسے فتوت وجواں مردی[20] سے اثر پذیری کا مغربی مستشرقین نے بھی اعتراف کیا ہے[21]۔ علامہ اقبال نے مغربی ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور انتقادات لکھے ہیں جیسے :

فسادِ قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک وخیالِ بلند و ذوقِ لطیف (۲۲)

اپنے سات انگریزی خطبات میں سے ایک کو علامہ اقبال نے ثقافتِ اسلامی کی روح کے لئے وقف کیا۔ مثنوی بندگی اور ضربِ کلیم میں مختلف فنونِ لطیفہ کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی توضیح ملتی ہے۔ اقبال کا مدعا یہ ہے کہ دینِ اسلام کے حرکی اور قوت بخش تصورات مسلمانوں کی ثقافت خصوصاً اس ملت کے ادب میں منعکس ہوں (۲۳)

حکمت وفلسفہ را ہمتے مردے باید
تیغِ اندیشہ بروئے دو جہاں آختن است
مذہبِ زندہ دلاں خوابِ پریشانے نیست
از ہمیں خاک جہانِ دگرے ساختن است

جب ایسا ہو جائے تو شعر کے اسرار میں بقول اقبال نغمۂ جبریل یا بانگِ سرافیل مضمر ہونے لگتی ہے۔ مدعا یہ کہ ایسا شعر پیغامبرانہ الہامات اور قوتِ بیداری کا مظہر ہوتا ہے :

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل (۲۵)

اسلامی ادب کا اصل سرمایہ عربی میں ہے مگر اردو ترکی اور فارسی زبانیں بھی اہم تر

سرمایۂ ادبِ اسلامی سے مالا مال ہیں۔ قرآن مجید کے اثرات یوں تو مسلمانوں کی سب زبانوں اور بولیوں پر ہیں مگر عربی پر اس کتابِ عظیم کے عجیب اثرات نظر آتے ہیں۔ متاخر عربی شعراء میں ولید ابوالفضل، ابو ماضی، عبدالحسن کاظمی، ابو شفیق جبری، عبدالغنی عراقی، عزالدین تنوخی، حسن کامل الصیرفی[۲۶] حافظ اور شوقی[۲۷] اپنی فکر اسلامی کے لئے معروف ہیں۔ ترک شعراء میں توفیق فطرت اور ضیا گوک الپ پاشا نے اپنے ہم زبانوں کو متاثر کیا جبکہ فارسی میں بہارؔ، عارفؔ اور اشرفؔ کے نام ممتاز رہے ہیں۔ اُردو کے قومی شعراء میں حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ کے نام سرفہرست ہیں، البتہ یہ سعادت علامہ اقبال کو ملی کہ وہ حکیم الامت اور شاعر مشرق ملقب ہوئے۔ وہ خود تو دانائے راز تھے ہی، انہوں نے مشرق کے لوگوں میں مزید دانائے راز پیدا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ جاوید نامہ میں بھرتری ہری اقبال سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

اے کہ گفتی نکتہ ہائے دل نواز
مشرق از گفتارِ تو دانائے راز (۲۸)

علامہ اقبال فن کے نقطۂ کمال پر پہنچتے رہے اور ان کی شاعری کے علاوہ نثر بھی شعریت سے خالی نہیں مگر انہوں نے ہر صورت میں اپنے پیغام یعنی ادبِ اسلامی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔ اب ان کے کلام کا بہت تھوڑا ایسا حصہ باقی رہا جو مسلمانوں کی اہم تر زبانوں میں ترجمہ نہیں ہوا۔ اس طرح وہ اب صرف عرب شعراء سے ہی مخاطب نہیں کہ:

بگو از من نوا خوانِ عرب را
بہائے کم نہادم لعلِ لب را
ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم
سحر کردم صد و سی سالہ شب را (۲۹)

بلکہ ان کا یہ تصورِ اسلامی اب جملہ مسلمان شعراء و ادبا کو پہنچ رہا ہے کہ:

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری 'جزویست از پیغمبری'
ہاں سُنا دے محفلِ ملّت کو پیغامِ سروش
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

حوالے اور وضاحتیں:

(۱) ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، اشاعتِ چہارم لاہور، جنوری ۱۹۷۹ء صفحہ ۶۲۹

(۲) جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی اشاعتِ سوم لاہور، مارچ ۱۹۷۸ء، صفحہ ۹۳

(۳) بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو صفحہ ۳۱۸

(۴) ارمغانِ حجاز، کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۹۸۱

(۵) دیکھیں سہ ماہی اردو کراچی بابت جنوری ۱۹۷۰ء میں راقم الحروف کے ہاتھوں اس مقالے کا ترجمہ: لفظ ادب کا مفہوم۔

(۶) قرآن مجید آیہ ۱۱ سورہ ۳، ۵۲ : ۸، ۵۴ : ۸، ۳۱ : ۱۰

(۷) رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال، فارسی صفحات بالترتیب ۱۴۸، ۲۳۰

(۸) [illegible] محولہ بالا

(۹) مثلاً سید عبدالواحد معینی مرحوم کی مرتبہ کتب 'تھاٹس اینڈ ریفلکشنز آف اقبال' اور 'مقالاتِ اقبال' ہیں ان دونوں کتابوں کو شیخ محمد اشرف مرحوم نے لاہور سے شائع کیا تھا۔

(۱۰) حوالہ نمبر ۱ بالا

(۱۱) بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اُردو صفحہ ۳۴۲

(۱۲) اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی میں (کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۲۳) اس حدیث کو شعر میں اس طرح تضمین کیا ہے:

آنکہ خاشاکِ بتان از کعبہ رفت

مرد کاسب را حبیب اللہ گفت

(۱۳) ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اُردو صفحہ ۵۴۲۔

(۱۴) کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ (۳۶-۱۵) ارمغانِ حجاز، ایضاً صفحہ ۱۰۱۹۔ (۱۶) مثلاً قرآن مجید آیہ ۵ سورہ ۲۱ اور ۶۹ : ۳۶

(۱۷، ۱۸) معارف اقبال مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، کراچی ۱۹۷۸ء صفحات بالترتیب ۲۲، ۴۷

(۱۹) مسدسِ حالی طبع تاج کمپنی لمیٹڈ (س ن) لاہور صفحہ ۱۷، ۲۰۷

(۲۰) دیکھیں سہ ماہی اقبال لاہور بابت اپریل ۱۹۷۸ء میں میرا مقالہ۔

(۲۱) میراثِ اسلام (انگریزی) میں پروفیسر گب، ادبیات اسلامی کے موضوع پر مقالہ دیکھیں۔

(۲۲) ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اُردو صفحہ ۵۳۳

(۲۳) مقالات، شائع کردہ نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد (۱۹۸۰ء) میں میرا مقالہ: اقبال اور اسلامی ثقافت۔

(۲۴) زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۹۱۴۔

(۲۵) ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اُردو صفحہ ۵۹۴، ۵۹۵

(۲۶ اور ۲۷) دیکھیں سہ ماہی رسالہ 'بصائر' اور 'رجحان' کراچی بالترتیب اکتوبر ۱۹۶۳ء اور اپریل ۱۹۶۹ء

(۲۸) جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۵۸۷

(۲۹) ارمغانِ حجاز، ایضاً صفحہ ۹۶۴

(۳۰) بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اُردو صفحات بالترتیب ۵۳، ۱۹۰ - (ابد کی لوح تربیت شمع اور شاعر)

اقبالؒ، خودی آموز مفکرین کے زمرے میں

ایک اصطلاح کے طور پر لفظ "خودی" موجودہ صدی کے دوسرے دھے میں ایک شاعر اور مفکرؒ کی زبردست تبلیغ کے نتیجے میں مثبت اور محمود معانی کا حامل ہوتے لگا ورنہ اس سے قبل یہ بالعموم کبر و غرور اور رعونت و نخوت کا مفہوم رکھتا رہا ہے۔ اب اس لفظ کو خود شناسی عرفان ذات، انا النفس یا الیغو کے مترادف ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی حال "بیخودی" کا ہے جو قومی اور ملی مفادات کی خاطر خودی سے اجتماعی کام لینے کی ایک اصطلاح بن گئی ہے ورنہ اس کے معانی کچھ خود فراموشی کے قریب رہے ہیں اور اس ضمن میں فارسی اور اردو شعرا کے دواوین سے متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ہم یہاں بات انسان تک محدود کرتے ہوئے اس کی 'خودی' کو موضوع گفتگو بناتے ہیں اور دیگر موجودات کی خوبیوں سے صرف نظر کرتے ہیں۔ انسان اس کائنات کی سب سے اعلا و اشرف مخلوق مانی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے غیر معمولی امکانات اور قوتوں سے نوازا ہے۔ خودی اور خودشناسی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان امکانات کو پہچانے اور ان سے ایسا کام لے کہ اپنی دنیا و عقبیٰ سنوار جائے۔ ہم یہاں دین اسلام کے نقطہ نظر پر متوجہ ہیں۔

قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کی آخری الہامی کتاب اور ابدی صحیفہ ہدایت ہے۔ اس کتاب عظیم میں خالق، اس کی تخلیقات (کائنات) اور انسان کا رابطہ و تعلق احسن اور واضح تر صورت میں ملتا ہے۔ اس کتاب ہدیٰ کے مطابق خالق نے کائنات کو پیدا کیا۔ بعض غیر مرئی مخلوقات بھی اس کائنات میں موجود بلکہ اس کے انتظام و انصرام میں مصروف ہیں۔ مگر خالق کل شئی کا خلیفہ اور نائب انسان ہے جس کے لیے یہ کائنات اور اجرام فلکی مسخر کیے گئے ہیں۔ یہ کائنات با مقصد اور ایک ایسی مدت کے لئے تخلیق کی گئی ہے جس کا علم اس کے خالق

کو ہے۔ انسان اس کائنات کی نہایت ذمہ دار مخلوق ہے جسے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور اس کے نیک و بد اعمال کے نتیجے ابدی صورت اختیار کریں گے۔ اس کے احساس ذمہ داری کا کمال یہ ہے کہ اس نے وہ عظیم امانت الٰہی اٹھا رکھی ہے جسے افلاک، زمین اور پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے۔ کئی مفکرین اسلام نے اس امانت کو عرفان ذات یا خودی بتایا ہے قرآن مجید آفاق کے علاوہ انفس کا مشاہدہ کرنے اور نفس کے اندر آیاتِ خالق تلاش کرنے کی دعوت دیتا ہے جو صریحاً خود شناسی کی تعلیم ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ۔

اے ایمان والو! اپنے نفس و خودی کا خیال رکھو۔ تم راہ ہدایت پر ہو تو گمراہ شخص تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

یہ آیہ کریمہ نوید دے رہی ہے کہ خود شناس مومن اشخاص، ابلیسانِ خاکی و ناری کے ذریعہ سے گمراہ نہ ہوں گے کہ:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ

یہ بات بھی توجہ طلب رہنی چاہیے کہ نفس و خودی کے تغیرِ احسن کو خدا نے انسانوں کی سرنوشت کی تبدیلی اور نجات کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

انسان کامل اور اعظم خودی شناس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنہیں "اسراء" اور معراج کی نعمتیں ملیں اور ذات احدیت کے دیدار کے باوجود جو "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" کا مظہر کامل بنے رہے اور جمالی دہلویؒ کے بقول ؎ (۹۴۲ھ)

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوہ صفات   تو عین ذات می نگری و در تبسمی

خودی کی تلقین کی حامل احادیث کئی ہیں، اور سیرت رسولؐ سراپا خودی آموز ہے۔ ہم یہاں ایک جملہ نقل کریں جو کبھی حدیث اور کبھی بعض صحابہؓ یا بزرگان دین کے اقوال کے طور پر معروف رہا ہے۔ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ"۔ معمولی تامل کرنے والا شخص بھی یہی کہے گا کہ عرفان ذات کو عرفان رب پر مقدم ہونا چاہیے۔ قرآن مجید اور احادیث رسولؐ میں فضائل اخلاق کسب کرنے اور رذائل سے اجتناب کرنے کی بالترتیب جو تلقین اور انتباہ ملتی

اس کی توضیح و توجیہہ یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے خودی ساز اعمال کی حمایت اور خودی شکن امور کی مذمت فرمائی ہے۔

خودی اور مفکرین اسلام، کا عنوان بڑی تفصیل کا متقاضی ہے مگر ہم ایک مختصر مقالے کی حد تک اس بات کو محدود کریں گے۔ تاریخ اسلام کی چودہ صدیاں بیت گئیں اور ان میں لاتعداد مفکرین عالم وجود میں آتے رہے۔ ان سب صلحاؒ و علماؒ اور فقہاؒ و صوفیا کے آثار و افکار ہم تک نہیں پہنچے۔ معاریف و مشاہیر میں سے بھی بعض کی طرف ہی ہم اشارہ کر سکیں گے۔

تفکرِ اسلامی کی تاریخ سے معتزلہ اور اشاعرہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اشاعرہ کی ایک بحث خودی کے تصور سے کچھ تعلق ضرور رکھتی ہے۔ اس مکتب کے بانی ابوالحسن اشعری نے "جوہر" کی بحث کا آغاز کیا جو مدتوں مفکرین اور صوفیا کو متوجہ کرتی رہی۔ اشاعرہ کی نظر میں کائنات "جواہر" سے مرکب ہے جن کے مزید اجزا نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ خالق کائنات نئے جواہر تخلیق کرتا رہتا ہے۔ روحِ انسانی بھی ایک جوہر یا اعلاتر مادہ ہے جو فنا پذیر نہیں ہے۔

یہاں سے دیگر مفکرین بالخصوص صوفیا کو روح و نفس کی بقا اور اس کی صفات کے بارے میں بحث کرنے کی تحریک ہوئی۔ قرآن مجید میں روح کو امرِ ربی کہا گیا ہے۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔

گو بعض مفسرین اس آیت میں مذکور روح سے حضرت روح الامینؑ مراد لیتے ہیں، مگر صوفیا اس بحث میں مصروف رہے کہ روح عالم امر یعنی (لاہوت) سے ہے جبکہ بدن عالمِ خَلق یعنی (ناسوت) سے ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْن۔

ابوالعلا عفیفی نے ابن عربی کے فلسفہ متصوف پر اپنی کتاب میں اس قسم کی بحث حسین بن منصور حلاج سے بھی منسوب کی ہے، مگر ان کی "کتاب الطواسین" میں یہ باتیں مفقود ہیں۔ البتہ اپنے قول "انا الحق" کی وہ یہاں یہی توجیہہ کرتے نظر آتے ہیں کہ نفسِ انسانی یا خودی حق ہے۔ گو اس نص نے انہیں مصلوب کروایا اور مدتوں اس قول کی مذمت بھی ہوتی رہی مگر بعد میں اس قول کی وحدت وجود یا وحدت شہود کے مطابق تعبیرات ہونے لگیں۔ اب

ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن ہوں کہ علامہ اقبالؒ، انا الحق ان کے نزدیک "خودی حق" ہے، کے مترادف ہے۔

حضرت داتا گنج بخش (سید علی ہجویری) کی کتاب "کشف المحجوب" موضوع تصوف پر غالباً پہلی طبع زاد کتاب ہے۔ اس گنجینۂ علم و دانش میں روح و نفس کی بڑی مفصل بحث ملتی ہے۔ ہم یہاں اس کتاب کے ایک اردو ترجمے سے اقتباسات دیں گے:

"تمام محقق صوفیا اس امر پر متفق ہیں کہ نفس وہ ہے جس کے ذریعے اخلاقِ رذیلہ اور افعالِ خبیثہ کے ارادے پیدا ہوں اور یہ ان افعال رذیلہ کا سبب ہے اور افعال خبیثہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معاصی دوسرے اخلاق رذیلہ جیسے تکبر، حسد، بخل، خشم، حقد اور مثل اس کے تمام ایسے ناستودہ افعال جو شرع و عقل بُرے بتائے تو ریاضت و مجاہدہ سے صوفی ان اوصاف کو اپنے آپ سے دفع کرتا ہے ..... اور حقیقتِ انسان کی تشریح میں بہت سے اقوال ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں بھی بہت سے قول ہیں۔ اسم انسان کیا چیز ہے۔ اور انسان کہلانے کا کون سزاوار ہے اور اس کا علم ہر طالبِ حقیقت پر فرض ہے۔ اس لیے کہ جو اپنے سے ہی جاہل ہے، وہ غیر سے جاہل تر ہو گا..... مَنْ جَهِلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ بِالْغَيْرِ اَجْهَلُ۔ (کشف المحجوب، اردو ترجمہ نسخہ سمرقند از ابوالحسنات سید محمد احمد قادری لاہور ۱۹۷۸ء مطبوعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن ص ۳۶۶ تا ۳۶۸)

صوفیا کی دیگر کتب میں اس قسم کی بحثیں ملتی ہیں۔ جہاں ابن مسکویہ تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق، میں اشاعرہ کی سی بحث کرتے ہیں وہاں امام محمد غزالیؒ "کیمیائے سعادت" اور احیاءُ علوم الدین" میں اسے عارفانہ رنگ دیتے ہیں۔ نفس یا خودی کی حقیقت پر جن دوسرے مسلمان مفکرین نے خصوصی توجہ دلوائی ہے ان میں ابن حلاج کے مرشد شیخ جنید بغدادیؒ مولانائے رومؒ اور شیخ احمد فاروقی سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں گو ابنِ عربی اور عبدالکریم الجیلی کے نظریۂ انسان کامل (حقیقتِ محمدیہ) کی بھی ایک سے زیادہ توجیہات ممکن ہیں۔ وحدت وجود اور وحدت شہود (عبدیت) کے نظریات بھی خودی سے ہی مربوط ہیں، نفی کی صورت میں ہوں یا اثبات کی کیفیت میں۔

وحدت شہود کا تصور ہمیں شیخ علاء الدولہ سمنانی کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ جو ابن عربی کے نظریہ وحدت وجود کے مخالف تھے۔ مگر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدت کا تصور واضح تر کیا۔ وحدت وجود کے دیگر مخالفین میں امام ابن تیمیہؒ، ابن خلدون، علامہ ابن حجر العسقلانی، ابراہیم البقاعی اور اس دور میں علامہ اقبالؒ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ وحدت وجود کی یہ مخالفت کیوں ہے اور وحدت شہود کی حمایت کس خاطر؟

ابن عربی کہتے ہیں کہ وجود ایک ہی ہے جو خالق کا ہے، اور مخلوقات کے وجود میں آنے کے باوجود حقیقی وجود واحد ہی ہے۔ ان کے نزدیک خالق اور کائنات کی نسبت "عینیت" کی ہے۔ ان کے نزدیک اعیان ثابتہ نے خارجی وجود کا خلعت ہی نہیں پہنا۔ دوسرے الفاظ میں وہ خدا اور کائنات میں خط امتیاز نہیں کھینچتے۔ ایسی صورت میں انسان کی جداگانہ خودی کا تصور کیسے ابھرے؟

ابن عربی کا نظریہ انسان کامل ان کی کتاب "فصوص الحکم" میں بیان ہوا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کی علت تخلیق حقیقت محمدیہ ہے اور انسان کامل حضرت محمدؐ ہی ہیں۔ اس نظریے کو شیخ عبدالکریم الجیلی نے اپنی کتاب الانسان الکامل، کا موضوع بنایا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک ابتدائی مقالے میں اس نظریے کی تلخیص پیش کی تھی۔

اب رہا وحدت شہود کے نظریے کی طرف ایک اشارہ۔ وحدت وجود کو ہمہ اوست کہتے ہیں اور وحدت شہود کو ہمہ از وست یا عبدیت۔ وحدت وجود میں ماسوا اللہ کی نفی ہے اور خدا، عین عالم۔ وحدت شہود یا عبدیت، وحدت وجود اور ظلیت کے بعد کا مقام ہے۔ مکتوب امام ربانی کا ایک اقتباس بات کو واضح کر دے گا:

"پہلے میں وحدت وجود کا معتقد تھا کیوں کہ بچپن ہی سے میں اسے بربنائے استدلال جانتا تھا، اور اس کی صداقت پر یقین کامل رکھتا تھا۔ لیکن جب سلوک اختیار کیا تو پہلی مرتبہ وحدت وجود ایک ادراک روحانی کی حیثیت سے منکشف ہوئی اور میں نے برائی العین اس کا مشاہدہ کر لیا۔ میں عرصے تک اس مقام میں رہا اور تمام معارف جو اس مقام سے متعلق ہیں، مجھے حاصل ہو گئے۔ مجھ پر منکشف ہو گیا کہ وحدت وجود ایک ادنیٰ مقام ہے

ہے اور میں ایک بالاتر مقام پر پہنچ گیا ہوں یعنی مقام ظلیت پر۔۔۔۔ میری آرزو تھی کہ میں مقامِ ظلیت ہی میں رہوں کیوں کہ ظلیت کو وحدت وجود سے ایک نسبت تھی۔ اس میں اپنے تئیں اور اس عالم کے تئیں خدا کا ظل محسوس کرتا تھا لیکن فضل خداوندی دستگیر ہوا اور میں ایک اعلا مقام یعنی مقام عبدیت پر فائز ہو گیا۔۔۔۔"

حضرت مجدد لکھتے ہیں کہ ماسوا اللہ اور اللہ کی نسبت عبد اور آقا کی ہے۔ ماسوا اللہ عبد ہے مگر اس کے وجود کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح ان کی گفتگو خودی انسانی کا اثبات کرتی ہے۔

تصوف ایک عملی طریق تربیت رہا ہے۔ صوفیا نفس و خودی سے ہی متعلق رہے ہیں دور انحطاط کے صوفیا کی بے عملی، بعض صوفیا کا ترک دنیا، افراط زہد اور بے جا انکساری وغیرہ بے شک خودی شکن اعمال تھے، مگر عجمی تصوف کے علی الرغم اسلامی تصوف کو ہم یک قلم خودی سوز نہیں کہہ سکتے۔ صوفیا کے احوال 'دہ گانہ' مراقبہ، قرب، محبت، خوف، رجا، شوق انس، اطمینان، مشاہدہ اور یقین نیز مقامات ہفت گانہ، توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، توکل اور رضا میں خودی آموز امور کی کمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا تزکیۂ اخلاق اور حق گوئی اور بے باکی کے مظہر رہے ہیں۔

صوفی شعرا میں تعلیمات خودی کے لحاظ سے مولانا جلال الدین رُومی کا نام ممتاز ہے۔ رومی کے ہاں وحدت الوجودی اشعار بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں مگر وہ بالعموم انسانی عظمت اور خودی کی وسعت کے ترجمان رہے ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ اقبال اور ایرانی رومی شناس، پروفیسر بدیع الزماں، فروز انفر نیز ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ رومی کو غیر وحدت الوجودی بتاتے رہے ہیں۔ رومی کی پنج گانہ کتب خطبات و مکتوبات، دیوان کبیر یعنی (دیوان شمس تبریزی) فیہ ما فیہ اور مثنوی شریف میں خودی کی تلقینات موجود ہیں۔ مثلاً فیہ ما فیہ میں رومی کی ایک گفتگو کو مترجم نے خودی کی اہمیت کا عنوان دیا ہے۔ رومی کی اس گفتگو میں ہے کہ انسان کسی چیز کو بھول جائے تو حرج نہیں، مگر اسے خودی فراموش نہیں ہونا چاہیے۔ رومی یہاں عظمت شخصیت انسانی کے سلسلے میں دو

آیات قرآنی کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک وہ جس میں خدا نے جملہ اولادِ آدم کو بزرگی و عظمت دینے کا ذکر کیا ہے اور دوسری وہی جس میں انسان کے بارِ امانت تحمیل کرنے کا ذکر ہوا ہے رومی فرماتے ہیں کہ انسان کی تعریف "عرض" ہے مگر اس کی خودی جوہر کا حکم رکھتی ہے۔ خودی اور خود شناسی کے موضوع پر مثنوی معنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

خویشتن نشناختِ مسکیں آدمی
از فزونی آمد و شد در کمی
خویشتن را آدمی ارزاں فروخت
بُرد اطلس خویش بَر دَلقے بدوخت
منگر ایں را کہ حقیری یا ضعیف
بنگر اندر ہمتِ خود اے شریف
قیمتِ ہر کالا می دانی کہ چیست
قیمتِ خود را ندانی احمقی است
سَعدُہا و نَحسُہا دانستہ ای
ننگری سعدی تو یا ناشُستہ ای؟
بہر ایں پیغمبرؐ آں را شرح ساخت
کانکہ خود بشناخت یزداں را شناخت
اے خنک آں را کہ ذات خود شناخت
اَندر اَمنِ سرمدی قصرے بساخت
من غلامِ آنکہ نفروشد وجود
جز بداں سلطان با افضال وجود

یعنی آدمی بیچارے نے خود کو نہ پہچانا۔ اس طرح اس کی بڑائی جاتی رہی اور وہ ذلت میں آپہنچا۔ آدمی نے خودی سستی بیچی، وہ اُطلس لے گیا اور اسے گُدڑی پر پیوند کر دیا۔ اے عظیم! خود کو حقیر یا کمزور نہ جان۔ اپنی جرأت اور خودی پر متوجہ رہ تو ہر چیز کی قیمت تو

جانے اور اپنی خودی کی ارزش نہ پہچانے، یہ صریح نادانی ہوگی حضرت رسول اکرمؐ نے تفصیل سے فرمادیا ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" مبارک ہے وہ شخص جس نے اپنی ہستی و خودی کو پہچانا (اور) ابدی امن وسکون کے مقام میں اپنے لیے قصر و محل بنا لیا۔ میں اس شخص کا غلام ہوں جو صاحب افضال و اکرام وجود یعنی (خدا) کے سوا کسی کے سامنے اپنی گردن خم نہ کرے۔

جیسا کہ تصوف کی بعض کتب اور کتب الفُتُوّۃ (فُتُوّت ناموں) کے مطالعے سے واضح ہے، مسلمانوں میں پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ایک عظیم نظام مُروّج رہا ہے جسے اَخِیت، جواں مردی، فُتُوّت یا آئین جواں مرداں وغیرہ سے موسوم کرتے رہے ہیں۔ تصوف کے شبیہ اس نظام میں انفرادی اخلاقی اصلاح پر توجہ دی جاتی رہی اور خوددار اور غَیُور انسان پرورش پاتے رہے۔ ان فِتیان اور جواں مردوں نے بعد میں عظیم اجتماعی خدمات انجام دی ہیں۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ نظام جوانمردی، خودی اور بیخودی دونوں کی تعلیمات کو مُتضمّن رہا ہے۔ اس نظام کے بارے میں عربی اور فارسی میں کئی باتیں دستیاب ہیں اور ان میں کئی مفکرین اسلام کے افکار و آرا منقول ملتے ہیں۔ ان کتابوں میں تصوف، نظام اخلاق اور مسلک جواں مرداں کے رابطہ وتعلق کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہاں ہم شیخ نجم الدین زرکوب تبریزی کے فُتوّت نامے سے چند اشعار نقل کر دیتے ہیں:۔

فتوت چیست؟ در بازار معنی
ز اخلاق حمیدہ کارواں است
فتوت گلستانے داں سراسر
مروت ہمچوں گل در گلستاں است
کسے کو چشم معنی باز باشد
فتوت در ہمہ اشیاء رواں است
فتوت بوستاں و شرع چوں تُخم
طریقت چوں، درخت بوستاں است

فتوت وار آں باشد کہ اورا
اگر مال است و گرجاں در میاں است

حضرت میر سید علی ہمدانی معروف بہ شاہ ہمدان کے رسالہ "فتوتیہ" کو راقم المعروف نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے نزدیک اخی، فتی یا جوانمرد وہ ہے جو غیور اور صاحب خودی ہو یعنی بقول اقبال:

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

کتبِ اخلاق کا عظیم سرمایہ فارسی زبان میں ہمیں ملتا ہے۔ ان کتابوں پر یونانی فلسفیانہ افکار کا اثر بھی موجود ہے مگر بیشتر مباحث تعلیمات اسلام پر مبنی ہیں۔ ان کتب میں فضائل و رذائل اخلاق کی بحث اور افراط و تفریط سے بچنے کی تلقین ملتی ہے۔ خودی سازی کی تعلیمات کا احاطہ کرنے کی خاطر ان کتب کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔ ہم یہاں اہم تر کتب اور ان کے مصنفین کا نام لکھے دیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مصنف مفکرینِ اسلام کے لقب کے سزاوار ہیں:۔

۱۔ قابوس نامہ مؤلفہ امیر عُنصر المعالی زیاری اس میں تربیت شخصیت اور جواں مردی اپنانے کی بحثیں بھی ہیں۔

۲۔ سیر الملوک یا سیاست نامہ۔ مصنفہ ابو علی حسن نظام الملک طوسی جو سلاجقہ کے نامور وزیر تھے۔

۳۔ کیمیائے سعادت نیز نصیحۃ الملوک از امام محمد غزالی خود شناسی کی جامع بحث کی کتابوں میں موجود ہے۔

۴۔ سراج الملوک فی العدل والسلوک از ابو بکر محمد طرطوشی اس عربی کتاب کے، مقدمہ ابن خلدون پر واضح اثرات موجود ہیں، تقی الدین محمد نے اسے فارسی میں ترجمہ کیا تھا

۵۔ مکارم اخلاق بقلم رضی الدین ابو جعفر نیشاپوری اس کتاب کے ۳۰ باب ہیں۔

۶۔ اخلاق ناصری مؤلفہ خواجہ نصیر الدین طوسی تہذیب اخلاق کا بابِ اول تعمیرِ خودی

کے سلسلے میں جب کہ دوسرے دو باب تدبیرِ منزل اور سیاستِ مُدُن کے بارے میں ہیں۔

۷۔ مکارم اخلاق از سید محمد نور بخش جو تصوف اور اخلاق کی تعلیم کا امتزاج پیش کرتی ہے۔

۸۔ رَوضۃ الواعظین از معین الدین مسکین فراہی۔ اس میں بھی تصوف و اخلاق کا امتزاج ہے۔

۹۔ اخلاق مُحسنی یا محسنین نیز فتوت نامہ سلطانی مؤلفہ ملا حسین واعظ کاشفی سبزواری

۱۰۔ اخلاق جلالی مؤلفہ علامہ جلال الدین دوانی شیرازی۔ اُس مصنف کی کتاب ''زورا'' کے حوالے سے اقبال نے اپنے تیس انگریزی خطبے میں حقیقتِ زماں سے بحث کی ہے۔ ہم یہاں نمونے کے طور پر ان کی کتاب کی روشنی میں ''خودی'' کا استشہاد کردیں۔

اخلاق جلالی کا نام ''لوامع الاشراق فی مکارمُ الاَخلاق'' ہے۔ یہ کتاب بھی اخلاق ناصری کی طرح تین ابواب یا لوامع میں مُنقسَم ہے ـــــ تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مُدُن و تدبیر پادشاہی۔ پہلا حصہ دس، دوسرا چھ اور تیسرا سات لمعات یعنی ذیلی بحث مباحث اور بعض مربوط ضمنیات میں منقسم ہے۔ کتاب کے آغاز میں کائنات کے بامقصد تخلیق ہونے، انسان کے خلیفۃ اللہ اور بارِ امانت کے حامل ہونے کی بحث ہے اور مصنّف یہ دو معروف شعر بھی نقل کرتا ہے:۔

بار وجود خویش بتابد دلم زضُعف !
لیکن ز بارِ عشق کشیدن ضعیف نیست
آسمان بار امانت نتوانِست کشید
قرعہ فال، بنام منِ دیوانہ زَدَند

علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے مگر صاحب دل و خودی، انسان کو ہم فرشتے سے برتر کہہ سکتے ہیں۔ اور آدمی محض آدمی صورت ہونے کی بنا پر اس

شرف کا استحقاق نہیں رکھتا۔

آئمہ سنت وجماعت، اتفاق نمودہ اند براں کہ خواص بشر از خواص ملک افضلست:
گر آدمی متقی از ملک گرد بسری ـــــ کہ سجدہ گاہِ ملک خاک آدمی زادست۔

قرآن مجید میں انسان کا شرف اور اس کی رذالت کمالِ بلاغت اور جزالت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ

اخلاق جلالی کا یہ قطعہ گویا ان ہی کی تفسیر ہے:

آدمی زادہ طرفہ معجونست
از فرشتہ سرشتہ وز حیوان
گر کند میلِ ایں، شود کم ایں
ور کند قصدِ آں، شود بہ ازاں

"خودی" کے نقطۂ نظر سے اخلاق جلالی، کا لامع اول (تہذیب اخلاق) زیادہ اہم ہے۔ اس میں وہ فضائل بیان ہوئے ہیں جو اخلاق اور خودی کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں نیز وہ رذائل بھی جو مخالفِ اخلاق اور خودی سوز ہیں۔ آٹھویں اور نویں لامع میں مصنف ایسے اخلاق کی تاکید کرتا ہے جو شخصیت میں اعتدال اور توازن پیدا کرے۔ فضائل ہوں کہ رذائل وہ افراط اور زیادتی تک پہنچ جائیں تو مزاج دنائیت کی طرف ہو جاتا ہے اور شخصیت و خودی غیر متعادل اور بے ہنگم بن جاتی ہے۔ دسویں لامع میں مصنف رذائلِ اخلاق جیسے حیرت، جہالت اور دعوی ہمہ دانی، بددلی، خوف، حرص و شہوت، غم و حزن اور حسد کا علاج بتاتے ہیں۔ البتہ تدبیر علاج میں ہمیں قرآن مجید، احادیث رسولؐ اور مسلم فلاسفہ اور حکما کے ساتھ ساتھ یونانی فلاسفہ کے استدلالات بھی ملتے ہیں۔ مسلمانوں نے یونانیوں کی کتب کے عربی میں تراجم کروائے تھے اور "اخلاق جلالی" کی قبیل کی کتابوں میں ارسطو یا افلاطون کے اقوال بزبان عربی یوں منقول ملتے ہیں جیسے کسی بزرگ کے سخنِ حکمت کو فارسی کتاب میں نقل کیا گیا اور اس کے بعد اس کی توضیح کی گئی ہے۔ جس

شاعر مفکر کی طرف ہم نے اپنی گفتار کے آغاز میں اشارہ کیا، دراصل یہ سعادت اسے ہی نصیب ہوئی کہ قرآن مجید اور احادیثِ رسولؐ یا کتبِ مسلمین میں سے خودی کے گوہر ہائے آبدار نکالے اور انہیں پوری چمک دمک کے ساتھ پیش کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر مفکرینِ عالم کے افکار و نظریات کا صحیح پس منظر اور پیش منظر بھی بتائے —— اب ہمیں اس پیغام برِ خودی کے افکار کو دیکھنا ہے۔ اُن کے خودی اور بے خودی کے تصورات اہلِ پاکستان، ملت اسلامیہ بلکہ پورے عالم انسانی کے لیے ایک نعمتِ غیر مُترقبہ ہیں۔

"حضورِ عالم انسانی" بھی ان کا پیغام اسی قبیل کا ہے:

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز
بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز

مگو با من خدائے ما چنیں کرد
کہ شستن می تواں از دامنش گرد
تہ و بالا کن ایں عالم کہ در وے
قمارے می بَرَد نامرد از مرد

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر
کجا بودے اگر دریا نبودے

"...... علامہ اقبال نے وحدت الوجود کے جامد و ساکن نظریہ کے ردعمل کے طور پر عالم اسلام میں "خودی" کا ایک حرکی اور عملی نظریہ پیش کر کے تاریخ تصوف اسلام میں ایک جدید اور پُر عظمت باب کا اضافہ کیا اور مسلمانوں پر وہ احسانِ عظیم کیا جسکے بارِ مِنّت سے وہ تاقیامت سُبکدوش نہ ہو سکیں گے۔ ان سے قبل صوفیائے کبار میں سے جُنید بغدادیؒ

مولانا رومیؒ، اور مجدد الف ثانیؒ نے خودی کے اس سربستہ راز اور زندہ حقیقت کی ایک جھلک ضرور دیکھی تھی اور انہوں نے علی الترتیب اپنے اعمال، کلام اور مکاتیب میں مختلف پیرایہ میں اس کا اظہار بھی کیا تھا لیکن قدرتِ کاملہ نے اس نظریہ کی تکمیل درحقیقت علامہ اقبال کے لیے اٹھا رکھی تھی......"

حضرت اقبال کا تصورِ خودی اتنا جامع ہے کہ ایک مقالے کے جزو میں تو کجا، وہ ایک ضخیم و قطور کتاب میں بھی نہیں سما سکتا۔ مثنوی اسرارِ خودی کی تمہید میں جو کچھ وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں وہ دراصل تصورِ خودی کی ہمہ گیریت پر بھی صادق آتا ہے:

قطرہ از سیلاب من بیگانہ بہ
قُلزُم از آشوب اُو دیوانہ بہ
در نمی گُنجد بجُوُ عمّانِ من
بحرہا باید پئے، طوفان من

مکتوبات اقبال مظہر ہیں کہ وہ کالج کی تعلیم کے زمانے سے خود شناسی کے موضوع پر سوچتے رہے۔ ۱۹۰۰ء میں عبدالکریم الجیلی پر لکھا ہوا ان کا مقالہ بھی اس موضوع کا آئینہ دار ہے۔ ۱۹۰۴ء میں "قومی زندگی" کے عنوان سے انہوں نے اردو میں جو مقالہ لکھا وہ بھی فرد و قوم کے مسائل پر ان کی عمیق توجہ کا آئینہ دار ہے۔ یورپ میں قیام کے دوران (1905 تا ۱۹۰۸ء) انہوں نے کئی تقاریر کیں اور مقالے لکھے۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء" بھی عام روش کی تحقیق ہیں۔ اس میں تفکر بھی ہے اور الجیلی پر ان کا مذکورہ مقالہ اس کا ایک جزو بن گیا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے علی گڑھ میں جو تقریر کی اور جس کا ملخص اردو ترجمہ "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظریہ کے عنوان سے متداول رہا، وہ بھی خود شناسی کی بالخصوص افراد و ملل کے عروج و زوال کے اصولوں کے حوالے سے آئینہ دار ہے۔ غالباً اس سال وہ خودی پر لکھنے کے بارے میں مصمم تھے۔ چنانچہ اپنی انگریزی یادداشتوں میں جو "شذراتِ فکرِ اقبال" کے نام سے موسوم ہیں، انہوں نے شخصیت کی بقاء کے عنوان سے یوں لکھا تھا:

شخصیت کی بقا کوئی کیفیت نہیں بلکہ ایک طریق عمل ہے، میرا خیال ہے کہ روح و بدن کی تفریق نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کئی مذہبی نظام اس باطل تفریق پر مبنی ہیں۔ انسان اصلاً ایک توانائی، ایک قوت یا قوتوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے عناصر کی ترتیب میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ ان قوتوں کی ایک مخصوص ترتیب کا نام شخصیت ہے۔ یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ آیا یہ ترتیب محض اتفاقی ہے۔ میں اسے فطرت کے حقائق میں سے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیا قوتوں کی یہ مخصوص ترتیب جو ہمیں اتنی عزیز ہے، بعینہٖ قائم رہ سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ قوتیں جس طرح زندہ، صحت مند شخصیت میں عمل پیرا ہیں، اس رخ پر ان کا عمل جاری رہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات ممکن ہے .... ہمیں چاہیے کہ فعلیت کی ان تمام صورتوں سے دست بردار ہو جائیں جو شخصیت کو تحلیل کرنے پر مائل ہوں، مثلاً عجز و انکسار، قناعت، غلامانہ فرماں برداری وغیرہ۔ ان کے برخلاف بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سخاوت اور اپنی روایات و قوت پر جائز فخر ایسی چیزیں ہیں جو شخصیت کے احساس کو مستحکم کرتی ہیں۔ شخصیت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ لہٰذا اس کو خیر مطلق قرار دینا چاہیے اور اپنے تمام اعمال کی قدر و قیمت کو اس معیار پر پرکھنا چاہیے۔ خوب وہ ہے جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبائے اور بالآخر اسے ختم کر دینے کی طرف مائل ہو.... شخصیت کی بقا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے حصول کے لیے جد و جہد ضروری ہے۔ یہ خیال جو یہاں پیش کیا گیا، دور رس نتائج کا حامل ہے۔

اقبال نے بعد میں "شخصیت" کے لیے خودی کی اصطلاح اختیار کی مگر جو خیال منقولہ اقتباس میں ہے وہ بعد میں بھی ان کے پیش نظر رہا۔ مثلاً خوب و ناخوب کا معیار خودی ہونے کے بارے میں کوئی بیس برس بعد انھوں نے یوں فرمایا ہے:

ستارگانِ فضا ہائے نیلگوں کی طرح
تخیلات بھی ہیں تابعِ طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو، وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب

اقبال نے مناسب سمجھا کہ تصورِ خودی کو بزبان شعر بیان کریں، کیوں کہ شعر نثر سے مؤثر تر ہوتا ہے۔ پہلے انہوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا بعد میں تراکیب اور اُسلوب بیان کی آسانی کے پیش نظر فارسی کا انتخاب کیا۔ مثنوی اسرار خودی سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ انگلستان سے شائع کروایا۔ اس سے قبل ۱۹۱۸ء میں اقبال نے مثنوی رموز بیخودی شائع کردی جو دراصل اسرار خودی کا ہی تکملہ ہے۔ پہلی مثنوی میں فرد کی خودی کے نشوونما کے اصولوں سے بحث ہے اور دوسری میں فرد کے قوم کے کام آنے کے سلسلے میں اور قوم کی تشکیل و تعمیر کے بیان میں اسلامی عقائد اور اصولوں سے اِستشہاد۔ اقبال بجا طور پر تحدیث نعمت کرتے ہیں کہ تاریخ اسلام میں خودی اور بیخودی کے تصورات جامع تر صورت میں پیش کرنے کی سعادت اُن ہی کو ملی ہے "خودی" افکارِ اقبال کا محور ہے۔ اور اس لئے اقبال اس خاص تصور سے اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ اور اس فلسفے کو بجا طور پر اپنی ابدی شہرت و بقا کا موجب بناتے ہیں:

مُرا ذوقِ خودی چُوں انگبین است
چہ گویم وارداتِ من ہمیں است
نخستیں کیفِ اُورا آزمودم
دِگر بر خاوراں قسمت نمودم

پس از من، شعرِ من خوانند و دریابند و میگویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

مثنوی اسرار خودی کی اشاعت اول کے موقع پر اقبال نے اردو میں جو دیباچہ لکھا تھا اشاعت ثانی سے انہوں نے اسے حذف کر دیا مگر اس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی یا "انا" یا "میں"، جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت، مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتاد طبع پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اس نتیجے کی طرف مائل ہیں کہ انسانی "انا" محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے........

مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک "انا" ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے، مگر مسئلہ انا کی تحقیق و

تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب نما ثلث ہے اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی اس نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اُندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدُ الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی (عیسوی) کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ اس مسئلے (وحدت الوجود) نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علمائے قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمہ اور حکما میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ..... ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دل ربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی شعرا میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقتِ حال سے آگاہ تھے مگر باوجود اس بات کہ ان کا کلام شاہد ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان حالات میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے عملی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا......

ان کے نزدیک خودی ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہے۔ وہ احساس خودی کے بیدار کرنے کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بالخصوص بیدار اور فعال بنانا چاہتے تھے اور عراقی کے اس قبیل کے اشعار کا سحر شعر کی رنگینی کے ذریعہ سے ہی توڑنا چاہتے تھے:

اوّل ابنست و آخرش، داتی کہ چیست

خود را، از خودی، خود بپرداختن است

اقبال نے تصور خودی کو اس طرح ارتقا دیا کہ وہ تعلیمات اسلامی پر مبتنی و استوار ہو مگر دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے ذوق اور مسلک کے مطابق اس سے مستفید ہو سکتے ہیں اس سلسلے میں انگریزی خطبات اقبال (بالخصوص خطبہ چہارم) کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے۔

اقبال نے فلسفۂ خودی مثنوی اسرار خودی اور فلسفہ بیخودی مثنوی" رموز بے خودی" سب پیش کیا مگر بعد میں مدت العمر وہ ان فلسفوں اور تصورات کو نت نئے اسالیب کے ذریعے سے بیان کرتے رہے۔ اقبال نے بھی معلمین اخلاق کی طرح فضائل و رذائل بتائے ہیں۔ ام الفضائل ان کے نزدیک "خودی" ہے

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی
گراں بہا تو، حفظِ خودی سے ہے، ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال فرماتے ہیں، نظام عالم کی اساس خودی پر ہے۔ عمدہ اہداف و مقاصد خودی کو ارتقا دیتے ہیں۔ جذب حب و عشق بالخصوص مردان کامل کی محبت آتشِ خودی کو شعلہ ور کرتی ہے۔ اقبال نفیِ خودی کے تصور، دوسروں کا بیجا احسان اٹھاتے، اور ادب و شعر برائے زندگی سے روگردانی کو رذائل اور منفی قوتیں بتاتے ہیں جن سے احتراز ضروری ہے۔ تربیت خودی کے تین مرحلے ہیں:۔ اطاعت، ضبط نفس، اور نیابت الٰہی۔

اطاعت سے مراد، اوامر و نواہی اسلامی کی اطاعت ہے جو انسان کو مجبوری سے مختاری کے مقام پر لا پہنچاتی ہے:۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرَو

ضبطِ نفس، کے عنوان سے اقبال نے دراصل عبادات و شعائر اسلامی کی، حکمتیں سمجھائی ہیں۔ عقیدہ توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے موضوع پر اسرار خودی کے ۲۲، اشعار ایک ضخیم کتاب کے مطالب رکھتے ہیں:

ایں ہمہ اسبابِ استحکام تُست
پختہ و محکم اگر اسلام تست
اہلِ قوت شو زوردِ یا قوی
تا سوارِ اشترِ خاکی شوی

نیابت الٰہی کا مرحلہ دراصل پہلے دو مرحلوں سے گزرنے کا نتیجہ ہے۔ اقبال تقویم خودی کے لیے متداول قوت، خطر پسندی جہاد و کوشش، قومی روایات سے وابستگی اور جذبہ تسخیر کائنات کی اہمیت بتاتے ہیں۔ مثنوی رموزِ بیخودی میں فرد اور ملت کے رابطے کا بیان ہے اور مسلمانوں کے اساس ارکان، توحید و ختم رسالت، کی حکمتوں کی وضاحت۔ توحید، مومن کو نومیدی اور غم و خوف سے نجات دیتی ہے جبکہ رسالت ختم رسالت، مسلمانوں کی ابدیت اور ان کے غیر معمولی اتحاد و یگانگت کی مظہر ہے۔ اسلام کی اساس تعلیمات اخوت، حریت اور مساوات ہیں۔ مسلمان ایک عالمی امت ہیں اور کسی محدود مکانیت و وطنیت کی پابند نہیں۔ قرآن مجید کی ابدیت کا وعدہ فرما کر خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کی ابدیت کی بھی ضمانت دے دی ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیرت رسولِ اکرمؐ کا اتباع کریں۔ قرآن مجید کو اپنا آئین حیات عملاً مانیں اور حرم کعبہ کی پاسبانی کو اپنا فرض جانیں۔ عقیدۂ توحید ایک اساسی عقیدہ ہے اور ایک اسلامی حکومت کو اس کی نشر و اشاعت کرنی چاہیے۔ اس مثنوی کے آخر میں اقبال قومی تاریخ اور مقام مادریت کی اہمیت پر توجہ دلاتے ہیں۔ ضمیمے کے طور پر ہمیں سورۂ اخلاص کی تفسیر بھی یہاں ملتی ہے۔ اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانانِ عالم متحد ہوں بے نیازی برتیں اور دوسروں کے دست نگر نہ بنیں وطنیت کی حدود سے خود کو بالا تر جانیں اور ایک بے نظیر اور اعلا و برتر قوم بننے کی کوشش کریں۔

مثنوی "اسرارِ خودی" کی اشاعت اول پر دیباچہ لکھتے وقت اقبال ایک دائرے کا ذکر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیمات اسلامی اور مقدم

مفکرین اسلام کے افکار کے ذریعے سے ایک دائرہ وضع کیا جا سکتا ہے جس کا مرکزی خط یا نقطہ خودی ہو اور ایک نصف دائرے میں فضائل رکھے جائیں اور دوسرے میں رذائل بلکہ افراط و تفریط دکھانے کی خاطر اس دائرے کے مزید گوشے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس دیباچے میں اقبال نے بعض مغربی اقوام کی قوت عمل اور ذوق و خودی کی تعریف کی ہے مگر من حیث المجموع وہ کسی مفکرِ مغرب کے خوشہ چیں نہیں۔ ہاں مفکرین اسلام سے استفادے کا انہیں خود اعتراف ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام ان کا توضیحی خط اس ضمن میں بے حد اہم ہے۔ اقبال نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار میں خودی کی ہمہ گیریت بتائی ہے۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک شعور خودی بیداری ذات کا موجب ہے اور خود شناس انسان دنیا میں مفید اور تعمیری انقلاب لاتے رہے اور اب بھی لا سکتے ہیں۔

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فروغالِ محمود سے درگذر
خودی کو نگہ رکھ، ایازی نہ کر

یہ ہے مقصدِ گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اقبال بیک وقت اردو اور فارسی کے بے نظیر شاعر، ایک مفکر، متکلم، ایک عظیم فلسفی اور ایک صاحب فکر و نظر سیاستدان تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو اپنی جداگانہ حیثیت اور ایک علیحدہ مملکت اسلامی کے قیام کا واضح تصور دیا۔ عالم اسلام کو اتحاد کا جو درس انہوں نے دیا اس میں غیر معمولی اثر اور اپیل ہے۔ جیسا کہ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی فرمایا "تحریک پاکستان کے فکری رہنما علامہ اقبال ہی تھے نظریۂ پاکستان یوں تو وہی نظریۂ اسلام کے نفاذ کا جذبہ ہے، مگر عصری تقاضوں کے مطابق اس نظریے کی واضح خد و خال ہمیں تصانیف اقبال میں ہی نظر آتے ہیں اور اس لیے تصانیف اقبال اہل پاکستان کے لیے غیر معمولی رہنما اور فکر و عمل کو متحد و یکجا رکھنے والی قوت ہیں، مگر افکار اقبال کے دائرے کا نقطہ پرکار "خودی" ہے — انفرادی اور اجتماعی (بیخودی) دونوں صورتوں میں۔ یہ بات قابل توجہ رہنی چاہیے کہ علامہ اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کا اپنا خطبہ الہ آباد، جس میں تصور پاکستان پیش کیا گیا،
اس آیۂ قرآنیہ پر ختم کیا تھا جس سے انہوں نے تصور خودی اخذ کیا تھا: آپ نے فرمایا۔
"مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ اسلام ہی تھا جس نے مشکل وقت میں مسلمانوں کی مدد کی ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ اگر آپ آج بھی اپنے تصور کو اسلام پر مرکوز کر دیں اور اس سے زندگی و خودی کی امنگ حاصل کریں تو آپ کی پراگندہ اور منتشر قوتیں از سر نو مجتمع ہو جائیں گی اور آپ انتشار و نفاق کی ہلاکت گاہ سے بچ کر ایک عظیم اور فعال قوت کے طور پر نمایاں ہو سکیں گے ..... مگر اس کی خاطر آپ کو نفس واحد کی طرح اجتماعی "انا" کا احساس بھی پیدا کرنا ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے:
"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ؕ"

حواشی اور حوالے

(۱) واذ قال ربک للملٰئکۃ إنی جاعل فی الارض خلیفہ (۲ : ۳۰)

(۲) وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا (۱۳ ، ۴۵)

(۳) وما خلقنا السموات والارض وما بینہما الا بالحق (۱۵ : ۸۵)

(۴) وما خلقنا السموات والارض وما بینہما الا بالحق واجل مسمی (۴۶:۳)

(۵) انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت والارض والجبال (۳۳ : ۷۲)

(۶) وفی الارض ایات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون (۵۱ : ۲)

(۷) دیکھیں سورہ ناس (۱۱۴) ۔ علامہ اقبال کے ہاں یہ اصطلاح بہت مروج ہے، بالخصوص ارمغان حجاز میں ۔

(۸) دیکھیے خطبات اقبال (خطبہ ۴) میں اس شعر کی توصیف اقبال :

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی

(۹) اقبال - (ب ج)

(۱۰) بشیر احمد ڈار : -- A study in Iqbal's Philosophy
طبع ثانی ۱۹۷۱ء از شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ص ۱۰۰ تا ۱۰۹ ۔

(۱۱) مثلاً دیکھیں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر "تفہیم القرآن" ج ۳

(۱۲) Mystical Philosphy, Muhyiddin Ibn-Al Arabi

(۱۳) The Idea of Personality in Sufi'sm

(۱۴) عربی کتاب التصوف کی توضیح "شرح تصوف" (شارح نے ۴۴۳ھ میں انتقال کیا ہے)

(۱۵) ابن الکربلائی کی کتاب روضات الجنات وجنات الجنان میں ان کا ذکر دیکھا جائے۔
ج ۱، تہران ۱۹۶۵ء

(۱۶) یہ مقالہ اقبال کے انگریزی مقالات کے کئی مجموعوں میں موجود اور ۱۹۷۷ء میں دوسرے

دو مقالوں کے ساتھ یہ حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے (اقبال اکادمی دکن کے ذریعے)

(۱۷) نظریۂ توحید از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی - لاہور ۱۹۴۷ء (طبع دوم) - ص ۷۶ -

(۱۸) ان دونوں کی اشاعت ترکی اور ایران میں ہوئی اور راقم الحروف نے انہیں اردو میں ترجمہ کیا ہے -

(۱۹) ملفوظات رومی - طبع سوم ۱۹۷۹ء (ادارۂ ثقافت اسلامیہ) صفحہ ۳۸ تا ۴۰ (مترجم عبدالرشید تبسم)

(۲۰) ولقد کرمنا بنی آدم وحملناهم فی البر والبحر... (۱۷ : ۷۰)

(۲۱) منقول از : (الف) گفتۂ رومی - مؤلفہ پروفیسر عبدالمجید یزدانی ، لاہور - ۱۹۷۶ء -

(ب) اقبال کے شعری مآخذ مثنوی رومی میں - از پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی - لاہور ۱۹۷۷ء -

(۲۲) دیکھیں مسلمان علما کی بین الاقوامی کانفرنس میں میرا مقالہ " نظام فتوت ، چودہ سو سالہ تاریخ اسلام میں " مقالات کانفرنس جلد ہشتم (۱) صفحہ ۱۴۷ تا ۱۸۷ - (مارچ ۱۹۸۱ء)

(۲۳) ماہنامہ فکر و نظر - اسلام آباد مارچ ۱۹۷۱ء

(۲۴) دیکھیں میرا مقالہ " فارسی کتب اخلاق " ایضاً ستمبر ۱۹۸۰ء

(۲۵) اخلاق جلالی - مطبوعہ نول کشور پریس - ۱۹۰۱ء صفحہ ۲۳ -

(۲۶) ارمغان حجاز : خودی -

(۲۷) اسلامی تصوف اور اقبال - اقبال اکادمی ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۶۵ -

(۲۸) مکتوب مورخہ ۳ فروری ۱۹۱۹ء بنام اکبر الہ آبادی -

(۲۹) دیکھیں خواجہ حسن نظامی کے نام مکتوبات اقبال (اقبال نامہ ج ۲)

(۳۰) اصل متن کے لیے مجلہ تحقیق پنجاب یونیورسٹی لاہور بابت اکتوبر ۱۹۸۰ء - ملاحظہ ہو - اقبال میوزیم میں موجود اس متن کو ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے شائع کروایا ہے -

(۳۱) Stray Reflections جنہیں ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے ۱۹۶۱ء میں لاہور سے شائع کروایا ہے -

(۳۲) شذرات فکر اقبال ترجمہ از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء)

(۳۳) مکتوب اقبال نوشتہ ۱۶ اگست ۱۹۲۸ء بنام تمکین کاظمی — "انوار اقبال" صفحہ ۱۰۶

(۳۴) ایضاً بنام غلام قادر گرامی مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۱۷ء

(۳۵) مشمولہ مقالات اقبال ۔ مرتبہ سید عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی ۔

(۳۶) کتاب کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے : تشکیل جدید الہیات اسلامیہ از سید نذیر نیازی مرحوم لاہور ۱۹۵۸ء ۔

(۳۷) اصل موضوع پر شذرات فکر اقبال میں یہ حکیمانہ جملے ملتے ہیں :

"ضبط نفس افراد میں ہو تو خاندانوں کی تعمیر ہوتی ہے، قوموں میں ہو تو سلطنتیں قائم ہوتی ہیں ۔" شذرات فکر اقبال ۱۷ء ۔ صفحہ ۱۳۶ ۔

(۳۸) اشارہ ہے : ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ۔ (۳ : ۱۳۹)

(۳۹) اقبال نامہ ۔ ج ۔ ۱، مرتبہ شیخ عطاء اللہ : آخری خط — ترجمہ از انگریزی ۔

(۴۰) آیۂ کریمہ پہلے نقل ہو چکی ہے ۔ (آیہ ۱ ۔ سورہ ۵) —

کتابیات (منتخب)

(۱) اقبال نامہ ۔ حصہ اول ۱۹۴۵ء، اور حصہ دوم ۱۹۵۱ء لاہور (شیخ محمد اشرف مرحوم)

(۲) اسلامی تصوف اور اقبال ۔ از ڈاکٹر ابو سعید نور الدین ۔ اقبال اکادمی ۔ طبع دوم ۱۹۷۷ء ۔

(۳) انوار اقبال ۔ مرتبہ بشیر احمد ڈار ۔ اقبال اکادمی ۔ طبع دوم ۱۹۷۷ء

(۴) اخلاق جلالی از جلال الدین دوانی صدیقی ۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۔ ۱۹۰۱ء ۔

(۵) اقبال اور مسلک تصوف از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء

(۶) اقبال کے شعری مآخذ مثنوی رومی میں ۔ از پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی، اقبال اکادمی ۱۹۷۷ء ۔

(۷) اقبال کا نظریۂ اخلاق از سعید احمد رفیق۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور (س ن)۔

(۸) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (جلد دوم) پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور، ۱۹۷۲ء۔ باب سوم از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔

(۹) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (ترجمہ) از سید نذیر نیازی۔ بزم اقبال۔ لاہور، ۱۹۵۸ء۔

(۱۰) تفہیم القرآن (تفسیر) جلد سوم۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

(۱۱) روضات الجنان و جنات الجنان (جلد ۱) از ابن الکربلائی ـــ مرتبہ جعفر سلطان القرائی۔ تہران ۱۹۶۵ء

(۱۲) روح مکاتیب اقبال۔ از محمد عبداللہ قریشی۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء

(۱۳) شذرات فکر اقبال ترجمہ از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۷۳ء

(۱۴) مقالات اقبال۔ مرتبہ سید عبدالواحد/ محمد عبداللہ قریشی ـــ طبع دوم۔ آئینہ ادب، لاہور۔ ۱۹۸۱ء۔

(۱۵) کلیات اقبال اردو/ کلیات اقبال فارسی۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

(۱۶) مقالات کانفرنس (جلد ۸ حصہ ۱) پاکستان قومی ہجری کمیشن۔ اسلام آباد۔ مارچ ۱۹۸۱ء
نظام فتوت از ڈاکٹر محمد ریاض۔

(۱۷) ملفوظات رومی۔ اردو ترجمہ عبدالرشید تبسم (طبع سوم) لاہور۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۷۹ء

(۱۸) فکر اقبال از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ بزم اقبال۔ لاہور ـــ (طبع چہارم) ۱۹۶۸ء۔ باب ۱۳، ۱۸۔

(۱۹) گفتۂ رومی مرتبہ محمد عبدالمجید یزدانی۔ لاہور۔ مکتبہ معین الادب۔ ۱۹۷۶ء

(۲۰) نظریۂ توحید مرتبہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ لاہور ۱۹۴۷ء

21. The Idea of Pesonality in Sufi'SM. By Dr. R. A. Nicholson

22. Gabrial's Wings : By Prof. Dr. A. Schimmel Leiden-1963.

23. A Discussion on Iqbal's Philosophy of Life By Dr. Shuja Namus, Lahore (Lion Press) 1948

24. The Reconstruction of Religious Thought in Islam : By Iqbal : Sh. Mnhammad Ashraf 1865E

25. A study in Iqbal's Philosophy By B A. Dar : Sh. Ghulam Ali & Sons, 1971 (2nd Ed.)

26. Stary Reflections (Iqbal) Ed. By Dr. Javid Iqbal. Sh. Ghulam Ali & Sons Lahore - 1961

مجلّے:

(۱) مجلہ "تحقیق" پنجاب یونیورسٹی، لاہور - اکتوبر ۱۹۸۰ء

(۲) ماہ نامہ "فکر و نظر" اسلام آباد - بابت مارچ ۱۹۷۱ء نیز ستمبر ۱۹۸۰ء

The Quartery 'Iqbal' Lahore, April 1958 ! Sources of Iqbal's idea of the Perfect Man — By Aziz Ahmad

---

اقبالؒ کا تصورِ علم و تعلّم

حرف اقرا' حق بما تعلیم کرد
رزق خویش از دست ما تقسیم کرد[۲]

دینِ اسلام، علم و تعلم کا ایک غیر معمولی محرک و مشوق دین ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مقام قرآن مجید نے متعلّم[۳] بتایا ہے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خالق کائنات نے کائنات کے جملہ ظاہری اور باطنی حجابات اُٹھا دیے تھے مگر وہ پھر بھی مزید علم و دانش کے طالب رہے۔

گرچہ عین ذات را بے پردہ دید
"رب زدنی[۴]" از زبان او چکید[۵]

اس دین نے چودہ سو سال قبل، تعلیم کی خاطر سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کی تلقین کی[۶] اور دین کے تقاضے سمجھنے کی کوشش کو یکے از مقاصد تعلیم قرار دیا[۷]۔ اس دانش پرور دین کی برکات کے نتیجے میں ہر عمر کے پڑھے لکھے اور مفکر مسلمان علم اور تعلیم کے جملہ پہلوؤں پر غور کرتے رہے اور اپنے نتائج فکر صفحات پر منتقل بھی کرتے رہے۔ ابونصر فارابی (وفات ۳۳۹ھ)، ابن سینا (۴۲۸ھ)، امام محمد غزالی (۵۰۵ھ) ابن طفیل اندلسی (۵۹۵ھ)، ابن خلدون (۸۰۸ھ) اور شاہ ولی اللہ (۱۱۷۶ھ) کے نظریات علم و تعلم پر کافی لکھا جاتا رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے چودہ سو برسوں میں یہی انگشت شمار ماہرین تعلیم پیدا نہیں کیے۔ ابھی کئی دوسرے حضرات کے افکار کو منصۂ شہود پر لانے کی ضرورت ہے۔

گمان مبر کہ بپایان رسید کار مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است[۸]

عصرِ حاضر کے مفکرین اسلام میں علامہ اقبال (علیہ الرحمہ) کا مرتبہ و مقام بلا نزاع بے حد بلند ہے اور انہوں نے زندگی کے جملہ امور کے بارے میں نہایت جامع تصورات دیئے ہیں۔ ان تصورات میں تعلیم اور اس کے متعلقات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں کئی مقالے بلکہ کتابیں لکھی گئی ہیں[۹]۔ تاہم حضرت علامہ کی بعض نئی تحریریں شائع ہو رہی ہیں جن سے مباحث کی نئی راہیں کھل رہی ہیں نیز نئے مسائل تعلیم کے تناظر میں افکارِ اقبال بے حد گرہ کشا نظر آتے ہیں۔

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا، قندیل[۱۰]

علم جامع و نافع

علم کا جامع و نافع تصور یوں تو حضرت علامہ کی کئی اردو اور انگریزی تحریروں سے متبادر ہے۔ مگر اس سلسلے میں ان کے سات انگریزی خطبات[۱۱] کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"[۱۲] کے پہلے خطبے کا عنوان "علم اور دینی واردات"[۱۳] ہے اور دوسرے خطبے "دینی واردات کے مشاہدے کی فلسفیانہ جانچ"[۱۴] کے بیشتر حصے میں بھی "علم" ہی موضوعِ بحث ہے۔ ان مباحث پر حضرت علامہ برسوں غور کرتے رہے۔ چنانچہ ان کی ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء کی بعض تحریریں ان مباحث کے ہیولیٰ[۱۵] کی آئینہ دار نظر آتی ہیں۔ ان متخصصانہ مباحث کی تلخیص کا بھی کوئی مختصر مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ان دو خطبوں کے ذریعے اقبال نے ماٰخذ و مصادرِ "علم" مثلاً وحی الٰہی، علم نفسی، عقل اور حواسِ خمسہ ہی واضح نہیں کیے، انہوں نے یقینی علم و تحقیق کو اسلامی نظام تعلیم کا مقصد اعظم بتایا ہے۔ یعنی شک و ظن سے گزر کر علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے مقام تک جا پہنچنا۔ یقین کی یہ اقسامِ ثلاثہ اجمالاً قرآن مجید میں مذکور ہوئی ہیں[۱۶] اور کئی صوفیہ نے بھی ان کی تشریح کی ہے۔ مثلاً شیخ اکبر ابن عربی اندلسی (۶۳۸ھ) کے رسالہ "اصطلاحات الصوفیہ" میں ہے:

"علم الیقین ما اعطاہ الدلیل، عین الیقین ما اعطتہ المشاھدۃ

والکشیف، حق الیقین ما حصل من العلم بما ارید له ذلک المشہود"[17]

ذیل کی دو بیتی میں اقبال کس لطافت سے "ظن" سے یقین کی طرف آنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ہمائے علم تا افتد بدامت | یقین کم کن، گرفتار شکے باش
عمل خواہی؟ یقین را پختہ تر کن | یکے جوئے و یکے بین و یکے باش[18]

موجودہ علوم و فنون کا خاصہ یہ ہے (خصوصاً مغربی ماہرین تعلیم کی اکثریت کے پیش نظر کہ انسان کو عمر بھر شک و ارتیاب کی وادیوں میں سرگرداں رکھے۔ اقبال کا یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو بالخصوص اور دوسروں کو بالعموم ظن و تخمین کے بے ثمر فتنے[19] سے آگاہ کیا اور علم و تعلم کے راہ رووں کو یقین و ایمان کے فوائد بتائے۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے | یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا | تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم | جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا | بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی[20]

نقطۂ پرکار حق، مردِ خدا کا یقیں | اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز[21]

اقبال دینِ اسلام کے مخلص اور صادق ترجمان رہے۔ البتہ انہیں نے اپنی خداداد فکر کی مدد سے ایک خاص فلسفۂ مذہب پیش کیا جو اہل عالم کی توجہ مبذول کر رہا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم نے "روح اقبال" کے آخر[22] میں اس فلسفے کا ایک خلاصہ لکھا ہے اور ڈاکٹر محمد معروف نے اس پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے[23] اس فلسفے میں "علم و تعلم" کا ایک خاص مقام ہے۔

یہاں تعلیم و تدریس کے پیشے سے اقبال کی وابستگی کے ماہ و سال گنوانے کی ضرورت نہیں۔ علم و تعلم کے بارے میں ان کے مقالوں اور مکاتیب کی باتیں بھی معروف ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے انگریزی میں ایک ڈائری لکھی جس میں ان کے مختلف تاثرات ملتے ہیں[25] یہ ڈائری بھی علم و تعلم کے کئی پہلوؤں کو محیط ہے مثلاً ایمان یا یقین کے بارے میں ہے:

"یقین بہت بڑی قوت ہے۔ میں جب دیکھوں کہ میرے نظریے پر کسی کو یقین ہے تو اس کے بارے میں میرا اپنا ایمان و اعتبار بے حد بڑھ جاتا ہے۔" (مذکورہ ڈائری حوالہ ۲۵ صفحہ ۹) جس نظریے کی طرف اقبال اشارہ کر رہے ہیں وہ نظریہ "خودی" ہے جسے اس ڈائری میں انہوں نے "شخصیت" Personality لکھا ہے[۲۶]۔ مقصد تعلیم کے بارے میں انہوں نے لکھا:

"قانون حیات کیا ہے؟ جہد پیہم۔ پس تعلیم کا مقصد کیا ہو؟ ظاہر ہے کہ جہد حیات کے لیے تیاری" (صفحہ ۸۹)۔ اس مقصد تعلیم سے کسی ماہر تعلیم کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کوئی پانچ برس بعد ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرار خودی پہلی بار شائع ہوئی، تو اس مقصد کو اقبال نے بایں طریق بیان فرمایا:

آگہی از علم و فن مقصود نیست — غنچہ و گل از چمن مقصود نیست
علم از سامان حفظ زندگی است — علم از سامان تقویم خودی است
علم و فن از پیش خیزان حیات — علم و فن از خانہ زادان حیات[۲۷]

علم (جمع علوم) آج کل Science کے لیے مستعمل ہے یا ......
Knowlege کی خاطر۔ علامہ اقبال کے ہاں اس کے یہ دو معانی بھی ہیں اور اس سے ماورا وہ معانی بھی جو اصل عربی لفظ "علم" میں سماتے ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے "علم"، عمل سے وابستہ ہو کر زیادہ محترم بنتا ہے اور علامہ اقبال نے بھی خطبات کے دیباچے میں اسکی طرف اشارہ کیا ہے[۲۸]۔ ذات باری تعالیٰ کی صفات میں "علم" بھی ہے[۲۹]۔ قرآن مجید میں علم بہ معنی حکمت بھی وارد ہوا ہے[۳۰]۔ علم نور ہے اور جہالت، ظلمت و تاریکی[۳۱]۔ علم، حق (صداقت) کے مترادف ہے جو اسلام کے بھی مترادف ہے[۳۲]۔ لہذا جس اسلام کو اقبال فقر غیور[۳۳] بتاتے ہیں، اسے "دین" بھی کہا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں علم و جسم کی قوت[۳۴] اور علم کی جہالت پر برتری کے لیے کئی آیات[۳۵] موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علم کی فوقیت ہی کے باعث فرشتوں کو حضرت آدم کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تھا۔ جب ابوالبشر اشیا کے خواص و حقائق کے علم سے مکمل طور پر بہرہ مند ہوئے تھے[۳۶] تو اولاد آدم کے علوم و فنون میں بڑھتے

رہنے اور تسخیر کائنات میں کامیاب ہوتے رہنے پر تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اقبال، علم اور سائنس کو "علم حق" قرار دیتے ہیں۔ مردان حق علم حق سے صحیح استفادہ کرتے رہے مگر اہل یورپ اس علم کے ذریعے نوع انسانی کے خاتمے کے درپے ہیں۔

ہر چہ می بینی ز انوار حق است / حکمت اشیا ز اسرار حق است
ہر کہ آیات خدا بیند حر است / اصل این حکمت ز حکم "انظر" است [۳۷]
بندۂ مومن ازو بہروز تر / ہم بہ حال دیگران دل سوز تر
علم چون روشن کند آب و گلش / از خدا ترسندہ تر گردد دلش [۳۸]
علم اشیا خاک ما را کیمیاست / آہ، در افرنگ تاثیرش جداست
عقل و فکرش بے عیار خوب و زشت / چشم او بے نم، دل او سنگ و خشت
علم ازو رسواست اندر شہر و دشت / جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانش افرنگیان تیغے بدوش / در ہلاک نوع انسان سخت کوش
با خسان اندر جہان خیر و شر / در نسازد مستیٔ علم و ہنر
آہ از افرنگ و از آئین او / آہ از اندیشۂ لا دین او
علم حق را ساحری آموختند / ساحری نے، کافری آموختند [۳۹]

دو قسم کے علم و تعلم۔

تفہیم اقبال کی اساسیات سے بے بہرہ لوگ اقبال پر تضاد بیانی کا یا غیر معمولی ابہام کا الزام لگاتے رہتے ہیں مگر ایسے الزامات خود ان کی کور ذوقی کی دلیل بنتے ہیں۔ دراصل اقبال نے مسائل حیات کے منفی پہلوؤں کی مذمت کی ہے اور مثبت باتوں کی حمایت پھر ان کے بعض خاص الفاظ، تعبیرات یا اصطلاحات ہیں جیسے عقل، خرد، زیرکی اور دانش برہانی مترادف ہیں اور علم (بالحواس) بھی اسی معنی میں ہے جبکہ وجدانی یا مشاہداتی علم کو وہ "عشق" قرار دیتے ہیں یا علم حق۔ الہٰیات اسلامیہ کی تاریخ میں کئی مفکروں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے علم اور تعلم کے بارے میں افکار پیش کیے اور ان میں اقبال کی سربلندی کی وجہ ان کے تصوّر کی جامعیت ہے۔ وہ یکطرفہ نہیں، ہمہ جہت بات

کرتے ہیں۔ انہوں نے سائنسی تجربی دور میں معذرت آمیز لہجہ اختیار کیے بغیر اسلام کی فکری اور ایقانی روح کا اثبات کیا ہے۔ انہوں نے بانگ دہل اعلان کیا کہ دینی افکار ابدی ہیں اور سائنس یا فلسفے کے تصورات ان افکار کے مقابلے میں متغیر بھی ہیں اور فروتر بھی۔[۳۹] اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام نے ایک حقیقی اور تحقیقی (مبنی بر حق) نظام پیش کیا ہے۔ لہذا یونانی و عجمی تصورات، خواہ فلسفہ کے روپ میں آئیں یا تصوف کے لبادے میں، وہ اسلام کے اصولوں پر پرکھے جائیں گے اور اس معیار و محک پر رد یا قبول ہوں گے۔ پس اقبال اگر دو قسم کے علم و تعلم کی بات کریں تو اس پر بھی اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ کہیں انہیں اپنے تصورات کے نمونے نظر آئے ہیں اور کہیں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے، علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ[۴۰]

مجھ کو معلوم ہیں پیران حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص، تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف[۴۱]

اقبال کے ایک مکتوب سے ان کا مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ ایک مقالہ نگار نے اُسے خواجہ غلام السیدین کے نام منسوب بتایا ہے مگر ان کے نام اقبال کے مکاتیب میں یہ خط

مل نہیں سکا۔

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنی میں استعمال کیا ہے مگر علم، علم حق کی ابتدا ہے۔ وہ علم، جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم حق کی آخری منزل ہے، اس کا دوسرا نام عشق ہے"[۴۴]

یہ اقتباس علم و عشق کے ربط کو ظاہر کرتا ہے یعنی کہیں عشق کے ساتھ مذکور علم، علم حق کی ابتدا ہے اور کبھی اس کی آخری منزل۔ اقبال نے اپنے کئی اشعار میں علم با عشق اور علم بے عشق سے اپنا مفہوم ظاہر کرنے کی سعی کی ہے۔ علم بے عشق، سیکولر یا لادین نقطۂ نظر ہے جبکہ علم با عشق دینی نقطۂ نظر۔ اقبال علم با عشق کے حامی ہیں:

گفت حکمت را خدا خیر کثیر　　ہر کجا این خیر را بینی، بگیر

علم را بر اوج افلاک است رہ　　تا ز چشم مہر بر کندد نگہ

دل اگر بندد بحق، پیغمبری است　　ور ز حق بیگانہ گردد، کافری است

علم را بے سوز دل خوانی شر است　　نور او تاریکی بحر و بر است

عالمے از غاز[۴۴] او کور و کبود　　فرودینش برگ ریز ہست و بود

ز نشش ابلیس را یارے شود　　نور نار از صحبت نارے شود

از جلال بے جمالے الاماں　　از فراق بے وصالے الاماں

علم بے عشق است از طاغوتیاں　　علم با عشق است از لاہوتیاں

بے محبت علم و حکمت مردہ　　عقل تیرے بر ہدف ناخوردہ[۴۵]

جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، اقبال کے ہاں لفظ "تحقیق" (غالباً شعر میں) علم حق یا عشق کے کچھ کچھ مترادف استعمال ہوا ہے۔

کلام و فلسفہ از لوح دل فرو شستم　　ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق[۴۶]

علم و ہم شوق از مقامات حیات　　ہر دو می گیرد نصیب از واردات

علم از تحقیق لذت می برد　　عشق از تخلیق لذت می برد

صاحب تحقیق را جلوت عزیز — صاحب تخلیق را خلوت عزیز
چشم موسیٰ خواست دیدار وجود — ایں ہمہ از لذت تحقیق بود
"لن ترانی"[۴۷] نکتہ ہا دارد دقیق — اندکے گم شو دریں بحر عمیق[۴۸]

خودی سے رابطہ۔

علامہ اقبال کے افکار کا مرکزی نقطہ یا محور خودی ہے۔ انہوں نے بار بار اس امر کی یاد دہانی کروائی ہے کہ وہ ہر مسئلہ حیات کو خودی کی تقویت یا تضعیف کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں:

مرا ذوق خودی چون انگبیں است — چہ گویم واردات من ہمیں است
نخستین کیف او را آزمودم — دگر بر خاوران قسمت نمودم[۴۹]

حیات و موت نہیں التفات کے لائق — فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود[۵۰]

خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال — کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں[۵۱]

لہذا ان کے تصور تعلم و علم میں ایسی کوئی بات مستحسن نہیں ہو سکتی جو مرگ خودی کی علامت ہو۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ بہرطور، اقبال کے ہاں خوب و ناخوب کا پیمانہ یہی خودی ہے:

ستارگان فضا ہائے نیلگوں کی طرح — تخیلات بھی ہیں تابع طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحب فراز و نشیب — یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل — جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب[۵۲]

مثلاً اقبال مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے بھرپور اور سرشار حد تک استفادے کے مؤید اور حامی ہیں مگر وہ مسلمانوں کے لیے اہل مغرب یا دوسروں کی تمدنی اور ثقافتی غلامی اور تقلید کے ہرگز روادار نہ تھے۔ علم و تعلم لوازم زندگی ہیں لہذا یہ زندگی کو ناخوش اندام کیوں بنانے لگے۔ اقبال ہر حال میں مسلمانوں کو یہی ہدایت کرتے رہے کہ وہ اپنی اسلامی

تشخص برقرار رکھیں اور ہر مسئلہ زندگی کو اسلام کی اساسیات (توحید و رسالت) کے مطابق دیکھیں ۔ اسلامی نقطہ نظر بھی ہے اور علم و تعلم کے میدان میں اسے اپنانے کا نام اسلامی نظام تعلیم ہو سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں علی گڑھ میں علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں بزبان انگریزی جو خطبہ دیا تھا[۵۳] اور جس کے اہم مطالب "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے اردو میں (ترجمہ از مولانا ظفر علی خاں مرحوم) ملتے ہیں[۵۴]، پیش نظر رکھا جا سکتا ہے ۔ اقبال اس معاملے میں سعید حلیم پاشا مرحوم (وفات ۱۹۲۱ء) کے ہمنوا تھے جن کے دو مقالے "ToIslamia" اور "مسلم معاشرے کی اصلاح" معروف ہیں[۵۵]۔ اقبال نے پاشا مرحوم کی زبانی جاوید نامہ (فلک عطارد) میں یوں فرمایا ہے :

غربیاں را زیرکی ساز حیات — شرقیاں را عشق راز کائنات[۵۶]
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود — نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بند — عشق را با زیرکی آمیزده[۵۷]
طرفگیہا در نہاد کائنات — نیست از تقلید تقویم حیات
زندہ دل خلاق اعصار و دہور — جانش از تقلید گردد بے حضور
چون مسلمانان اگر داری جگر — در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہاں تازہ در آیات اوست — عصر ہا پیچیدہ در آنات اوست
بندۂ مومن ز آیات خداست — ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چون کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش ....[۵۸]

مندرجہ بالا اشارے مظہر ہیں کہ علامہ اقبال نے دراصل اسلام کے تصور علم و تعلم کو فنی آب و تاب کے ساتھ، عصری تقاضوں کے مطابق پیش کیا ہے تاکہ اس تصور کے اپنانے والوں کی جذباتی، جسمانی، ذہنی، روحانی معاشرتی نشوونما ہوتی رہے ۔ ضرب کلیم کے حصہ "محراب گل افغان کے افکار" کا پانچواں قطعہ کس قدر سبق آموز اور معانی خیز ہے ۔ اس پر یہ تشنہ رہ ختم کیے دیتے ہیں ۔

یہ مدرسہ یہ کھیل، یہ غوغائے روارو — اس عیش فراواں میں ہے ہر لحظہ غم نو
وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں — جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو
ناداں، ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے — اسباب ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دو
فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنرمند — شام اس کی ہے مانند سحر صاحب پرتو
وہ صاحب فن چاہے تو فن کی برکت سے — ٹپکے بدن مہر سے شبنم کی طرح ضو ۵۹

شواہد و مراجع -

۱- اقرأ باسم ربك الذی خلق - آیہ ۱ - سورہ ۹۶ - یہ اور بعد کی آیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی ہے جو غار حرا میں نازل ہوئی تھی۔

۲- مثنوی اسرار خودی، کلیات اقبال فارسی، طبع لاہور ۱۹۷۳ء - صفحہ ۴۷ -

۳- جیسے - یتلوا علیھم آیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ -
۳ : ۱۶۴

۴- وقل رب زدنی علماً - ۱۱۴ : ۲۰

۵- پیام مشرق، تمہید (پیشکش)

۶- اس حدیث کی سند جیسے بھی ہو مگر کتنی مشہور ہے کہ اطلبوا العلم ولو کان بالصین -

۷- طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ..... الخ ۹/۱۲۲

۸- پیام مشرق حصہ افکار، قطعہ حیات جاوید -

۹- خواجہ غلام السیدین کی انگریزی کتاب کی تہذیب و تلخیص محمد احمد صدیقی نے "اقبال کے تعلیمی نظریات" نام کی کتاب میں کی ہے (مطبوعہ کراچی) - ۱۹۷۸ء، نیز اقبال اکادمی لاہور نے محمد احمد خاں کی کتاب "اقبال اور مسئلہ تعلیم" شائع کی ہے -

۱۰- بال جبریل، کلیات اقبال اردو مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۵۵ -

۱۱- The Reconstruction of Religous Thought in Islam

۱۲- اردو ترجمے کا نام، مترجم سید نذیر نیازی مرحوم - بزم اقبال لاہور - ۱۹۵۸ء

۱۳- Knowlege and Religious Experience.

۱۴- The Philosophical Test of the Revelation of Religious Experience

۱۵- مثلاً Islam a Moral and Political Ideal کے عنوان کا مقالہ جو کئی مجموعوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ہندوستان ریویو کی ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء کی اشاعتوں میں شامل تھا۔

۱۶- سورہ ہائے واقعہ، حاقہ اور تکاثر وغیرہ میں۔

۱۷- مجلہ معارف اسلامی تہران - اپریل ۱۹۶۹ء صفحہ ۷۹۔

۱۸- پیام مشرق، لالہ طور (رباعیات)۔ علامہ اقبال نے اپنی ڈائری Stray Reflections. میں ۱۹۱۰ء میں اس بات کو یوں لکھا تھا:

"آپ کی اگر یہ خواہش ہو کہ دنیا کے شور و غوغا میں آپ کی صدا قابل توجہ ہو تو آپ کی روح پر ایک ہی تصور مستولی رہنا چاہیے۔ یک مقصدی شخص سیاسی اور اجتماعی انقلاب پیدا کرتا ہے حکومتیں وجود میں لاتا ہے اور دنیا کو نظم و آئین دیتا ہے۔"

کتاب مذکورہ صفحہ ۱۵۵۔ اس کتاب کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے مرتب کر کے ۱۹۶۱ء میں لاہور سے شائع کروایا تھا۔ "شذرات فکر اقبال" اس کے اردو ترجمے کا نام ہے۔ (لاہور، ۱۹۷۳ء، مجلس ترقی ادب)

۱۹- قرآن مجید میں "ظن" کو بے حقیقت اور گناہ آمیز کام بتایا گیا ہے۔ ۱۲:۴۹، ۲۸:۵۳

۲۰- بانگ درا، نظم طلوع اسلام (چاروں شعر) دیکھیں گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلہ راوی بابت اپریل ۱۹۷۴ء میں میرا مقالہ: اقبال کا درس یقین۔

۲۱- بال جبریل، نظم مسجد قرطبہ۔

۲۲- ۱۹۷۶ء کا اضافہ شدہ ایڈیشن، دہلی۔ صفحات ۴۳۱ تا ۴۴۰، اقبال کا فلسفہ مذہب

۲۳- The Religious Philqsoply of Iqbal. لاہور ۱۹۷۸ء

۲۴- مجلہ "علم کی وسنک" علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد مئی تک جولائی ۱۹۸۱ء

میں میرا مقالہ ملاحظہ ہو: اقبال کی تعلیمی راہنمایاں۔

۲۵۔ دیکھیں اوپر مرجع نمبر ۱۸۔

۲۶۔ کتاب مذکور صفحہ ۱۷ تا ۲۰۔ عنوان Personal Immortality

۲۷۔ مثنوی مذکور، کلیات اقبال فارسی صفحہ ۱۷۔

۲۸۔ پہلا ہی جملہ یوں ہے:

The Quran is a book which empasises "deed" rather than Idea.

۲۹۔ قرآن مجید میں کئی موقعوں پر خدائے تعالیٰ کو عالم، علام اور علیم کہا گیا ہے۔

۳۰ تا ۳۲۔ بالترتیب۔ ۱۴ : ۲۸، ۱۲۰ : ۲ اور ۲۴۷ : ۲ وغیرہ

۳۳۔ لفظ "اسلام" سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقر غیور"

ضرب کلیم، قطعہ اسلام، کلیات اقبال اردو صفحہ ۴۹۳۔

۳۴۔ دیکھیں جناب طالوت کا ذکر ۲۴۷ : ۲

۳۵۔ مثلاً ۱۱ : ۵۸

۳۶۔ وعلم آدم الاسماء کلہا..... الخ ۳۱ : ۲

۳۷۔ قرآن مجید میں دو درجن سے زیادہ بار لفظ "انظر" (دیکھ) کے ذریعے قارئین کو مختلف امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے مگر اقبال نے یہاں افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت" (۱۷/۸۸) کی طرف اشارے کا حاشیے میں خود ذکر دیا ہے۔

۳۸۔ تلمیح ہے انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (۲۸ : ۳۵) کی طرف

ج۔ مثنوی پس چہ باید کرد، کلیات اقبال فارسی صفحہ ۸۳۹، ۸۴۰

۳۹۔ پہلا خطبہ دیکھ لیا جائے۔

۴۰۔ اقبال خطبات میں اسلام کو Anti-Classical. یعنی یونانی تصورات کے خلاف بتاتے ہیں۔

۴۱۔۴۲ ضرب کلیم، حصہ تعلیم و تربیت نظم تعلیم اور نظم دین و تعلیم

۴۳۔ ماہنامہ ماہ نو لاہور ستمبر ۱۹۷۷ء (اقبال نمبر) صفحہ ۲۷ مقالہ از فیاض محمود

۴۴۔ غاز یا گاز [illegible] شعر کا ترجمہ یوں ہوگا (بغیر سوزدل حاصل کیے علم کی گیس سے ایک جہان تاریک اور درد آمیز ہوجاتا ہے۔ ایسے علم کی فصل بہار، عالم وجود کی خزاں ہے۔

۴۵۔ جاوید نامہ، فلک عطارد۔ پہلا منقولہ شعر پیام مشرق کی تمہید سے لے کر یہاں دوبارہ شامل کیا گیا ہے اور اس میں آیۂ قرآنی کی طرف تلمیح ہے : ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیراً (۲ : ۲۶۹)

۴۶۔ زبور عجم حصہ دوم۔ غزل ۴۶

۴۷۔ قرآن مجید ۱۴۲ : ۷ ۔

۴۸۔ جاوید نامہ، فلک عطارد (منتخب اشعار)

۴۹۔ مثنوی گلشن راز جدید (زبور عجم) تمہید

۵۰۔ ضرب کلیم، حصہ تعلیم و تربیت ۔

۵۱۔ ارمغان حجاز، حصہ ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

۵۲۔ ضرب کلیم، کلیات اقبال اردو صفحہ ۵۴۱، ۵۴۲

۵۳۔ مکمل متن دیکھیں مجلہ تحقیق لاہور بابت اکتوبر ۱۹۸۰ء میں :

Muslim Community a Sociological Study.

۵۴۔ اس ترجمے میں بعض حصوں کا اختصار کیا گیا ہے ۔

۵۵۔ دیکھیں سہ ماہی اقبال ریویو (حال لاہور) بابت جولائی ۱۹۷۱ء میں میرا مقالہ "اقبال اور سعید حلیم پاشا"۔

۵۶۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد یوسف (مرحوم) کا مقالہ "علم و عشق" ملاحظہ ہو اقبال ریویو جولائی ۱۹۶۳ء

۵۷۔ اقبال نے عقل و عشق کے امتزاج کی کئی جگہ تلقین کی ہے ۔

۵۸۔ جاوید نامہ، فلک عطارد (بزبان سعید حلیم پاشا)

۵۹۔ کلیات اقبال، اردو صفحہ ۶۳۹ ۔

ج ۔ مثنوی پس چہ باید کرد،

اقبالؒ اور معاشرے کی تعمیرِ نو

اقبال نے کوئی اکسٹھ برس عمر پائی اور اس کا بیشتر حصہ انہوں نے عالمی اور اسلامی معاشرے کی اصلاح اور تعمیرِ نو کی خاطر وقف کر دیا۔ بے شک وہ عظیم فلسفی اور شاعر تھے۔ مگر اُن کی مصلحانہ شان کو ان کے پیغام سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی پہلی "مثنوی اسرارِ خودی" میں انہوں نے اپنی مصلحانہ حیثیت کے بارے میں نہایت خوش اسلوبی سے بتا دیا ہے۔ ان کا کام انسانی معاشرے کو عام طور پر اور اسلامی معاشرے کو خاص طور پر خطاب کرنا ہے:

بہرِ انسانی چشمِ من شبہا گریست ۔۔۔ تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
من کہ ایں شب را چو مہ آراستم ۔۔۔ گردِ پای ملت بیضا ستم

ہم یہاں اقبال کے پیغام کو اسلامی معاشرے کی اصلاح تک محدود رکھیں گے' اور یہ اسلامی معاشرہ وہ ہے جو اقبال کا مخاطب اول تھا۔ ہماری مراد برصغیر کے مسلمانوں کے معاشرے سے ہے۔ اقبال نے جس مسلمان معاشرے سے خطاب کیا' وہ غلامی کی زنجیرِ دل میں جکڑا ہوا تھا۔ اقبال کے نغمات نے آزادی کی تڑپ کو تیز سے تیز تر کر دیا اور چند ہی برسوں میں شاعر کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی کہ

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک ۔۔۔ بزمِ گل کی ہم نفسی' بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز ۔۔۔ اس چمن کی ہر کلی دردآشنا ہو جائے گی

درسِ آزادی کو بار آور ہوتے دیکھ کر اقبال نے مسلمانوں کو ایک نئے وطن کی تاسیس و تشکیل کا تصور دیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں آپ

---

(۱) ایک تقریر

نے جو خطبہ صدارت پیش کیا، وہ ملک پاکستان کی اساس بنا اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں آپ نے مسلمانوں کو ایک ممتاز معاشرہ بنانے کا مشورہ دیا آپ کا ارشاد تھا: اگر ہم چاہتے ہیں کہ برصغیر میں اسلام کا ایک زبردست تمدن باقی رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں میں اپنی مرکزیت قائم کر سکیں اور یہاں کے مسلمان ان کے معاشرے کی صورتیں جلوہ گر ہوں۔" آپ عالم تصور میں اس معاشرے سے مخاطب رہے ہیں۔ یہ معاشرہ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے طور پر حکمرانوں کا معتوب، اور ہندو اکثریت کے تعصبات کا نشانہ تھا اس نے بالعموم تن آسانی، قناعت اور تن بہ تقدیر، اپنا مسلک بنا رکھا تھا۔ اور افتراق و نفاق کی روش پر چل رہا تھا، اور نتیجہ ظاہر تھا۔ اقبال نے اپنے معجز نظام کلام کے ذریعے، ان خرابیوں کو دور کرنے کی خاطر سارا زور قلم صرف کر دیا۔

اقبال نے اپنے پیغام کا تانا بانا اسلامی تعلیمات کے ذریعے ہی تیار کیا، مگر اس میں ایسی اجتہادی شان اور جزالت فکر سے کام لیا کہ طبائع نے اسے پند و عظ نہ جانا اور سنجیدگی سے توجہ کی۔ کوئی دو سال قبل ایران کے شہر مشہد میں اقبال کے بارے میں ایک فکر انگیز کتاب "دانائے راز" کے عنوان سے چھپی ہے۔ اس کے مصنف پروفیسر احمد احمدی بیر جندی ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں مشہد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین یوسفی نے اقبال کی فکری جولانیوں اور جدت آفرینیوں کے بارے میں بڑی دل لگتی باتیں لکھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اقبال مشرق و مغرب میں ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نہ خشک واعظ ہیں اور نہ کھو کھلے فلسفی مولانا رومی کے ساتھ غیر معمولی عقیدت اور ارادت رکھنے کے باوجود اقبال کی دنیا ہی دوسری ہے۔ اسلامی تعلیمات کو فارسی اور دیگر زبانوں کے شعرا نے اپنے اشعار میں افراط سے سمویا ہے مگر اقبال اس معاملے میں از اول تا آخر منفرد ہے۔ آپ نے اسلامی حقائق اور معارف کو اس طرح بیان فرمایا، کہ وہ ان کے عمیق تدبر اور بلند اجتہادی فکر کے مبرہن ہیں"[1] ہم ذرا آگے چل کر اسلامی تعلیمات کے بارے میں اقبال کے ایک اجتہادی

---

[1] دانائے راز، صفحہ

نظریئے کا ذکر کریں گے بہر حال اقبال کا مخاطب مسلمان معاشرہ غلامی اور پسماندگی کے علاوہ افتراق اور پراگندگی کا شکار تھا وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان متحد و متفق نہ ہوں، وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اسی خاطر انہوں نے اتحاد و یگانگت کے درس کو نہایت تنوع اور بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے اسلام کی اساس اول "توحید" کو عملی طور پر اپنانے پر زور دیا۔ نظری حیثیت سے توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ایک خدا کی ذات اور اس کی جملہ صفات پر ایمان رکھا جائے۔ توحید ہی نے انسانوں کو باطل کے آگے سر جھکانے سے باز رکھا اور ہر دور میں اشرف المخلوق کو اس کا مقام یاد دلایا۔ اقبال نے جس طرح اسلام کے تمام ظاہری شعائر پر لکھا، اسی طرح توحید کے اس مفہوم پر بھی، مگر آپ نے اسلام کے اساس اول کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا۔ عملی پہلو یہ ہے کہ دعویداران توحید میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کامل یگانگت، اتحاد اور فکر و عمل کی وحدت کارفرما ہو۔ افتراق و نفاق اقبال کی نظر میں، دعویٰ توحید کے منافی ہے۔ مثنوی اسرار و رموز[۱] میں فرماتے ہیں۔

سود از توحید احمر می شود
خویش فاروق و ابوذر می شود

ملت از یک رنگئی دلہا ستی — روشن از یک جلوہ این سینا ستی
قوم را اندیشہ ہا باید یکی — در ضمیرش مدعا باید یکی
جذبہ باید در سرشت او یکی — ہم عیار خوب و زشت او یکی
گر نباشد سوز حق در ساز فکر — نیست ممکن این چنین انداز فکر

آپ نے علماء اور متکلمین سے خطاب فرمایا ہے کہ انہوں نے توحید کے اس وسیع مفہوم سے چشم پوشی کی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو فکر و عمل کی وحدت کے عظیم سرچشمے سے محروم کر رکھا ہے فرماتے ہیں:

---

(۱) اسرار و رموز، صفحہ ۱۷۲، ۱۸۲، ۱۹۳

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے ؟ فقط اک مسئلہ علمِ کلام
روشن اس ضَو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ! تیری سپہ دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہیں نہ ملا نہ فقیہہ
وحدتِ افکار کی، بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

توحید چونکہ کوئی فروعی اور اختلافی مسئلہ نہیں (اگرچہ آج کل دیگر اساسی مسائل کی طرح اسے بھی غریب منبر کی خاطر ایک دوسرے انداز میں اختلافی مسئلہ بنا دیا گیا ہے) اس ضمن میں اقبال فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان معاشرے میں (اور ظاہر ہے کہ ہمارا معاشرہ اسی قبیل کا ہے) اس تصور کی خاطر خواہ تنقید وتشید کی جائے۔ علامہ مرحوم نے توحید کی برکت کے تابع، فکر و عمل کے اتحاد کا درس دیا، وہ ہمارے لئے آج لمحہ فکریہ فراہم کر رہا ہے۔ افتراق اور نفاق نے ہمیں ایک بہت بڑے بحران سے دو چار کیا، اور نفاق اور پراگندگی کا یہ دور دورہ اگر پورے طور پر ختم نہ ہوا، تو خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اقبال فرماتے ہیں کہ توحید کے عملی پہلو کو ہمارے نظام تعلیم کا جزو بنایا جائے اور نونہالان ملت کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ اتحاد فکر و عمل کے بغیر، ہم نہ معاشرے کی تعمیر نو کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی متحدہ تمدن کو قبول کرنے والی قوم بن سکتے ہیں۔ اگر ملکی سطح پر ہم بے عملی اور عدم یگانگت کا شکار ہوں تو بین الاقوامی طور پر ہمارا وقار کیونکر بلند ہوگا؟

آنکہ در تکبیر راز بود تست　　　حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست
می ندانی آیۂ ام الکتاب　　　امت عادل ترا آمد خطاب؟

آب و تاب چہرۂ ایام تو — در جہاں شاہد علی الاقوام تو
اینکہ در مدینہ بپیچد یک نفس — سرے از اسرار توحید است وبس
یک شو و توحید را مشہود کن — غائبش را از عمل موجود کن"(۱)

یہاں ضمناً معاشرے کی مناسبت سے فرد کا ذکر کر دیا جائے۔ فرد اور معاشرے کا ذکر علم مدنیات میں ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس تلازمے کے بارے میں علامہ کے بعض اشعار امثال سائرہ کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے، ملت کے مقدر کا ستارا

فرد کے لئے اقبال نے خودی کا اور افراد یعنی مجموعی معاشرے کی خاطر 'بے خودی' کا لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ اقبال معاشرے کی تعمیر نو کی خاطر مسلح، با استعداد اور مصروفِ عمل افراد کے جو اوصاف ہیں۔ انہیں اس مقصد کی خاطر نوجوانوں کو بار بار یاد دلاتے ہیں اور ان کی بڑی توقعات وابستہ رہی ہیں۔ نوجوانوں کو اقبال نے جاوید نامہ کے آخری حصے "سخنی بہ نژادِ نو" خاص طور پر اور اپنی ہر تصنیف میں عام طور پر مخاطب کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے رہے کہ نوجوان ان کے پیغام سے خاص طور پر بہرہ مند ہوں۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — میرا عشق، میری نظر بخش دے
جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو مری یہی ہے — مرا نور بصیرت عام کر دے

اقبال ان نوجوانوں اور عام افراد کی اصلاح و تہذیب کے ذریعے ایک متحد الفکر اور متحد القوت معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس معاشرے میں فرد، نیابت خداوندی اور قربت الٰہی کا احساس پیدا کرتا ہے اور پورا ماحول ان کے درج ذیل دو شعروں کی تصویر بن جاتا ہے کہ۔

فرد از توحید لاہوتی شود ملت از توحید جبروتی شود

اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکی است

خیمہ ہائے ما جدا، دلہا یکی است[1]

معاشرے میں اضطراب و بے چینی کی ایک اور وجہ سیاسی استبداد اور حریت کا عدم احساس ہے۔ اقبال کے معاصر معاشرے کو غیر ملکی آمروں سے شکایت تھی اقبال استبداد کی ہر صورت کے ملوکیت ہو یا آمریت بے حد خلاف تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے مغرب کے جمہوری نظام پر سخت تنقید کی ہے، اور وہ ایسے کسی قانون پر کلیتاً صاد نہیں کر سکتے۔ جو ان کے نظامِ فکر اور اسلامی معاشرے سے تطابق نہ رکھتا ہو۔ وہ خوب سے خوب تر کے طالب تھے۔ گو بادی النظر میں اقبال جمہوریت کے خلاف تھے مگر دراصل وہ اس جمہوریت کے خلاف تھے جو مغرب میں رائج ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اس میں بندے کو گننے کا عمل تو ہوتا ہے مگر تولنے کا نہیں۔ پھر آزادیٔ افکار سے بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد[2]
گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ

رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا طریقہ
آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ[3]
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار

سر فرانسس ینگ ہسر بنڈ کے نام علامہ کا ایک مفصل خط جو ۳۰ جولائی ۱۹۳۰ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں چھپا، بڑا معروف اور فکر انگیز ہے۔ ہمارے معاشرے کی تعمیر نو میں جمہوریت کی اہمیت سب پر واضح اس ضمن میں علامہ مرحوم کے خط کا منقولہ ذیل اقتباس ہمارے معاشرے کے ہر طبقے، اربابِ اقتدار، حزبِ اختلاف اور عام لوگوں کی خاطر لمحۂ فکریہ

---

(۱) جاوید نامہ، صفحہ ۲۲۶ (۲) بالِ جبریل

(۳) ضربِ کلیم

اور تازیانہ فعالیت فراہم کرتا ہے۔ جمہوریت میں ایسی تمام خواہشات و شکایات کو پھر سے ابھرنے کا موقع ملتا ہے، جنہیں آمریت کے دور میں دبا دیا گیا ہو یا پورا نہ کیا گیا ہو۔

"جمہوریت ایسی آرزوں اور تمناؤں کی موجد ہوتی ہے جو بسا اوقات ناقابلِ عمل ہوتی ہیں اور اس کے ذریعے لوگ اپنے مسائل کے ایسے حل قبول کر لیتے ہیں۔ جو معیاری نہیں ہوتے مگر حالات ان کے قبول کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ جمہوری طرز حکومت میں طرح طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انسانی تجربہ شاہد ہے، کہ کام کرنے والوں کی خاطر یہ دقتیں ناقابل حل نہیں رہتیں جمہوریت کے بارے میں میرا یہی اعتقاد ہے کہ اس کے ذریعے جملہ امور کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔"[1] اقبال کے اس فرمان کی روشنی میں، ہمیں چاہیے کہ جمہوریت کی اساسات کو راسخ تر کریں، اور جمہوری اقتدار کی پامالی سے ہمارے معاشرے کو ماضی میں جو تلخ تجربات ہوئے ہیں ان کا اعادہ نہ کریں۔

علامہ اقبال نے سیاسی اور معاشی مسائل کا بالعموم ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ سیاسی استحصال معاشی استبداد کا پیش خیمہ ہے، اور اقبال کے محبوب ترک راہنما محمد سعید حلیم پاشا (م ۱۹۲۱ء) کی نظر میں دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔[2] پاشائے موصوف فرماتے ہیں کہ، ایک استحصال کے ذریعے دوسرے کو کام میں لاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کا بھی یہی شیوہ ہے، وہ معاشی دباؤ کے ذریعے سیاست میں دخیل ہوتے ہیں، اور اس ضمن میں پاکستان کے سیاسی اور معاشی حالات سب کے سامنے ہیں۔ اقبال نے جہاں سیاسی حریت اور جمہوری آزادی کا پیغام دیا، وہاں آپ نے معاشی مساوات، عدم استحصال اور اسلام کے اقتصادی نظام کی تنقید اور تبدیل کی خاطر مفید مشورے دیے ہیں۔ البتہ یہ امر افسوس ناک ہے کہ یوم اقبال کا اہتمام کرنے والے بعض سرمایہ دار، اپنے ہم مذہب و ہم وطن افراد کا استحصال کرنے سے باز نہیں آتے، حالانکہ ان کی اقبال دوستی کا پہلا تقاضا یہی تھا کہ غریبوں کے استحصال کو ترک

---

(۱) صدف اقبال، مطبوعہ لاہور، صفحہ ۱۷۱۔

(۲) دیکھیے میرا مقالہ، ماہنامہ المعارف لاہور، جولائی ۱۹۷۱ء۔

کر سکتے ۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اقبال کو معاشیات سے خاطر خواہ دلچسپی تھی۔ اُن کی پہلی منظم تصنیف "علم الاقتصاد" ہے جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب پروفیسر مارشل کے معاشی نظریات سے کسی قدر ہم آہنگ ہوتے کے باوجود، اقبال کی جدت فکر کی غماز ہے۔ برصغیر کے معاشی حالات مثلاً آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کے مطالعہ کی خاطر یہ کتاب اب بھی سُود مند ہے۔ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۸ء میں علامہ موصوف انگلستان اور جرمنی میں قیام پذیر تھے۔ آپ کا موضوع مطالعہ و تحقیق فلسفہ اور قانون تھا۔ اس کے باوجود آپ معاشیات کے دروس میں شامل ہوتے رہے اور یہ امر بھی علم الاقتصاد سے آپ کی دلچسپی کا مظہر ہے۔ اس گذارش سے مدعا یہ ہے کہ معاشی مسائل پر اقبال کا اظہار نظر، قیاسات پر مبنی نہیں، اس کے پیچھے ایک حد تک مہارت فن بھی پوشیدہ ہے۔

اقبال سرمایہ دارانہ نظام سے بے انتہا متنفر تھے۔ اس خاطر کہ اس نظام کی بنیاد ہی کمزوروں کے استحصال پر رکھی گئی ہے۔ آپ سوچتے تھے کہ کبھی برصغیر میں اسلامی معاشرہ قائم ہو، تو نظام اسلام کے تقاضوں کے مطابق مسلمان معاشی طور پر خوشحال رہ سکیں۔ تاسیس پاکستان سے ان کا مقصد قانون اسلامی کی تنفیذ تھی تاکہ دیگر امور کے علاوہ مسلمان معاشی عدل و انصاف سے بہرہ مند ہو سکیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں اقبال نے یہی بات لکھی کہ ایک جداگانہ مملکت کا قیام اس لئے بھی ضروری ہے کہ مسلمان معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور کوئی ان کا استحصال نہ کر سکے۔

علامہ کی زندگی کے دوران روس سے سرمایہ داری کے خلاف ایک مؤثر آواز اٹھی (ظاہر ہے کہ بعد میں یہ آواز موثر ہوتی گئی) یہ آواز جسے بالشویزم، کمیونزم اور دوسرے نام بھی دیئے جاتے ہیں، مگر چونکہ معاشی مساوات کی یہ صدا، اسلام کے فلسفہ عدل سے اثر پذیر نظر آتی تھی اس خاطر علامہ نے اس سے دلچسپی لی۔ اقبال کی وسیع النظری کو بعض سطح بیں ان کی تضاد بیانی قرار دیتے ہیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ اقبال کو روسیوں کی معاشی مساوات پسند تھی مگر اُن کی لادینیت اور دہریت ناپسند تھی۔ آپ کے اس قسم کے ملے جلے جذبات کی عکاسی جاوید نامہ

اور ضرب کلیم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس آخری کتاب کی نظم اشتراکیت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قوموں کی روش سے مجھے یوں ہوتا ہے معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ 'قل العفو' میں پوشیدہ ہے ابتک
اُس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار [۱]

جاوید نامہ اور پس چہ باید کرد میں آپ نے اس بات کی قوی امید ظاہر کی ہے کہ اہل روس منزل 'لا' سے نکل کر وادی الا میں آجائیں گے۔ ایک مقام پر تو ملت روسیہ کو اپنی عاقبت کی فکر کرنے کی آپ نے تلقین بھی کی ہے۔

کردہ ای کار خداوندان تمام
بگذر از 'لا' جانب الا خرام

در گزر از لا اگر جوینده ای
تازه اثبات گیری' زنده ای

چیست قرآن؟ خواجه را پیغام مرگ
دستگیر بندۀ بے ساز و برگ

ہیچ خیر از مردک زرکش مجو
لن تنالوا البر حتی۔۔

سر فرانسس ینگ ہسبینڈ کے نام علامہ موصوف کے مکتوب کا ذکر ہو چکا۔ اس میں بھی آپ اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر روسی اخستر آ خدا کو اپنا شعار بنالیں، تو ان کا معاشی نظام اسلام سے اقرب ہو جائے گا۔ اس گذارش سے عیاں ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نظام افکار میں معاشی عدل و انصاف کی نہایت اہمیت ہے۔ آپ غریبوں، مسکینوں، مفلوک الحالوں اور مظلوموں کے بے انتہا حامی تھے اور فرماتے ہیں۔

بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی
بجلال تو کہ در دل دگر آرزو ندارم [۲]

نیز: اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

ہمارے معاشرے کی تعمیر نو کی خاطر کامل اتحاد کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا قومی اور دینی وجود

۱؎ ضرب کلیم صفحہ ۱۳۸ ۲؎ زبور عجم صفحہ ۵۷

مشخّص اور معیّن ہو سکے۔ اس کے ساتھ نوجوانوں کی مناسب تربیت سیاسی آزادی اور معاشی عدم مساوات کی بغاوت ضرورت ہے۔ اگر ہم نے مخلصانہ ان خطوط پر معاشرے کی تعمیر نو کی کوشش کی تو ہمیں خدائے تعالیٰ کی فتح و نصرت نصیب ہو گی۔ موجودہ اوضاع و احوال میں روح اقبال گویا ہمارے معاشرے سے مخاطب ہے۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

عبث ہے، شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

لہ ارمغان حجاز، صفحہ ۲۵۳۔

اقبالؔ اور معاشرتی انصاف

علامہ اقبال نے برعظیم کی عملی سیاست میں صرف چند سال تک حصّہ لیا، مگر یہ امر مسلّم ہے کہ تقسیمِ ہند اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے قیام کے لیے سب سے پہلے مؤثر آواز اٹھانے کی سعادت ان ہی کو نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس تصوّر کو شرفِ قبولیت بخشا۔ تصوّرِ پاکستان کے ضمن میں بعض ایسے لوگوں کا نام لیا جاتا ہے جنہوں نے ۱۹۳۰ء سے قبل تقسیمِ ملک کی باتیں کی تھیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد سے قبل ایسی کوئی تجویز نمایاں صورت میں پیش نہیں ہوئی تھی، اور یہ اقبالؔ کا صدارتی خطبہ ہی تھا جس نے برعظیم کے مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ فراہم کیا اور انہوں نے بجن العزم کی گلبانگ بلند کی۔ تحریکِ پاکستان میں اقبال کی مجموعی خدمات کو بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے چند جملوں میں ایجاز سے بیان فرما دیا ہے۔ 'خطوط اقبال بنام جناح' (انگریزی) کے تعارف میں آپ نے لکھا ہے: "اقبال کے خیالات مجموعی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے، ان کے گہرے مطالعے اور غور و خوض کے بعد میں بھی آخر میں ان ہی نتائج تک پہنچا جو سر محمد اقبال کی نظر میں باصواب تھے۔ یہ وہی تصورات تھے جو بعد میں مسلمانانِ ہند کی متفقہ رضامندی کی صورت میں عمل پذیر ہوئے اور ان ہی کے مطابق لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے وہ قرارداد منظور کی جسے 'قراردادِ پاکستان' کہا جاتا ہے۔" بانیٔ پاکستان کے ان فرمودات اور دیگر معاصر شواہد کی روشنی میں اقبال اور پاکستان کے نام باہم مربوط اور لاینفک ہیں اور رہیں گے۔

معاشرتی انصاف، معاشی، سیاسی اور تعلیمی ہر اعتبار سے تقاضائے انسانیت ہے

اور اقبال اسے دینِ فطرت، اسلام، کی رو سے بروئے کار لانے کے متمنی تھے۔ اقبال نے کبھی عالمِ دین اور فقیہہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور ان کا یہ قول تھا کہ:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

یہ ان کی کسرِ نفسی ہے۔ ان کا سرمایۂ فکر و نظر اساساً اسلام پر ہی استوار ہے اور شرق و غرب کے سب نظریات سے آگاہ ہوتے کے باوجود جو کوئی اساسیاتِ اسلام سے نابلد ہو وہ علامہ مرحوم کے افکار و آرا کے عمق کو نہ سمجھ سکے گا۔ یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ معاشرتی انصاف کے ضمن میں اقبال کے مباحث کا زمینہ فراہم کیا جا سکے۔

اقبال کو برِ عظیم کے مسلمانوں کی پس ماندگی اور ان کے ساتھ کی جانے والی معاشرتی ناانصافیوں کا شدت سے احساس تھا اور انہوں نے اپنی نثر و نظم کے ذریعے اس صورتِ حال کے خلاف بھرپور آواز بلند کی۔ ان کے تصورِ پاکستان کا ایک لازمہ معاشی بہبود کی عملی صورت سوچنا تھا۔ چنانچہ قائد اعظم کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں آپ نے لکھا تھا۔

"ہماری سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کی عمومی فلاح و بہبود کی خاطر کبھی نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ وہ برابر روبہ انحطاط ہیں۔ ان کا یہ عام احساس ہے کہ ان کی غربت و افلاس کی وجوہ ہندوؤں کی سود خواری اور نظامِ سرمایہ داری ہے۔ ایک تیسری وجہ غیر ملکی تسلط ہے مگر مسلمانوں نے ابھی اس پر زیادہ سوچا نہیں۔ بہر حال اس معاشی مسئلے کا حل اسلام کے پاس ہے اور اس دین میں ہر شخص کی باوقار روزی کا حق محفوظ ہے، مگر اس دین کے اصولوں پر ایک آزاد اسلامی ریاست میں ہی عمل ہو سکتا ہے ...." اس اقتباس سے واضح ہے کہ اقبال کو ایک آزاد اسلامی ریاست کے تصور میں ہندو مہاجنوں، نظامِ سرمایہ داری اور غیر ملکی استعمار پسندوں سے نجات کی صورت نظر آ رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسلام کے معاشرتی نظام کی تشکیل کے امکانات بھی روشن نظر آتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا۔ اقبال کو اس نظام کی مادیت و

الحاد سے بغایت نفرت تھی مگر چونکہ سرمایہ داروں کی مخالفت اور غریبوں کی حمایت ان کو عزیز تھی، اس لیے انہوں نے اس نظام کی جزواً تعریف بھی کی ہے۔ وہ خوش تھے کہ اس کا ایک جز، نظامِ اسلام کی عملی تعبیر پیش کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ ملت روسیہ لا سے گزر کر الّا کی منزل کی طرف بھی آ جائے۔ ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اور مثنوی "پس چہ باید کرد" میں فرماتے ہیں:

روس را قلب و جگر گردیدہ خون
از ضمیرش حرفِ 'لا' آمد برون

آیدش روزی کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

در مقامِ 'لا' نیاساید حیات
سوئے 'الّا' می خرامد کائنات

معاشرتی انصاف سے وابستگی کا مظہر اقبال کا ایک ایسا شعر ہے جسے میں غریبوں اور کمزوروں کی حمایت کا حلف نامہ کہتا ہوں۔ خدا سے خطاب کرتے ہوئے اقبال رب العزت کے جلال کی قسم کھاتے ہیں کہ ان کا مقصد وحید، کبوتروں کو عقاب دیکھنا ہے:

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

کبوتر، ممولا یا کنجشک دراصل عقاب، شاہین یا شاہباز جیسے قوی پرندہ کے مقابلے میں کمزوری کا استعارہ ہے۔ "بالِ جبریل" کے دو شعر ہیں:

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

گرما دو غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور عام محنت کشوں کی حمایت میں اقبال کا زورِ قلم دیکھنے کے لیے "پیامِ مشرق" کا حصہ "نقشِ فرنگ" دیکھیے جس میں کارل مارکس، مزدک، قیصر ولیم بادشاہِ جرمنی، کوہکن (فرہاد یعنی مردِ مزدور) حکیم آگسٹس کونت فرانسیسی اور

لینن کے مکالمات کی صورت میں انھوں نے استحصال زدہ انسانی طبقات کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی و دل سوزی دکھائی ہے۔

بانگِ درا میں حضرتِ خضر بندۂ مزدور کو پیغامِ انقلاب دیتے نظر آتے ہیں:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

"بالِ جبریل" میں لینن (خدا کے حضور میں)، فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا (فرشتوں سے) وہ سہ گانہ انقلابی نظمیں ہیں جن پر اشتراکی سر دُھنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان نظموں کے بعض اشعار انقلاب آور شان رکھتے ہیں مثلاً:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

علم و دانش کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

مگر ان نظموں میں خدا، فرشتوں اور ایمان کے ذکر سے واضح ہوتا ہے کہ شاعرِ مشرق، اسلام کے نظامِ معیشت کی صدا بلند کر رہا ہے نہ کہ اشتراکیت کی۔ ایک معاصر مصنف کے الفاظ میں "ایک غیر اشتراکی اور مومن شاعر، معاشرے کے مظلوم طبقے کی حمایت اور سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کی مخالفت میں بادی النظر میں اشتراکیت کا ایسا حامی نظر آتا ہے کہ اشتراکی شاعر اس سے کوسوں پیچھے نظر آئیں[1]۔" اقبال نظامِ سرمایہ داری کے بے حد مخالف تھے۔ وہ اس نظام کو بدل دینے کا درس دیتے ہیں۔ اس کو ناپائیداری کا فیصلہ سناتے ہیں

---

[1] مظہر الدین صدیقی The Image of the Wes in Iqbal
بزمِ اقبال لاہور ص

اور کہیں کہیں اس نظام کے رو بہ انحطاط ہونے کے آثار دیکھ کر خورسند نظر آتے ہیں:

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

مگو با من خدای ما چنیں کرد! کہ شستن می توان از دامنش گرد

تہہ و بالا کن ایں عالم کہ در وی قماری می برد نامرد از مرد

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا

نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت میں اقبال ساہوکاروں، بینک کاروں، کارخانہ داروں بے رحم امراکے ہی خلاف نہ تھے بلکہ ان کے وابستگان بھی، صوفی ہوں یا ملّا، فقیہہ ہوں یا مفتی، ان کی نظر میں معتوب اور قابلِ ملامت تھے۔ اس گروہ کے بعض لوگ اپنے فوائد کی خاطر نظامِ سرمایہ داری کی توجیہات و تاویلات کرتے رہے ہیں اور اسی لیے اقبال نے کہا ہے کہ:

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر

"جاوید نامہ" کے "آنسوئے افلاک" میں خطاب بہ جہاں میں فرماتے ہیں:

از ملوکیت جہان تو خراب تیرہ شب در آستینِ آفتاب

آنکہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست فکرش از بی مرکزی آوارہ ایست

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سودخوار و والی و ملّا و پیر

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اقبال نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کا موازنہ کیے بغیر، انسانی ہمدردی کے شاعرانہ جوش میں آ کر اشتراکیت کی حمایت کر دی ہے،[۱] اور عشق کی عقل پر برتری کے اپنے نظریہ پر عمل کیا ہے۔ اور ایک مصنّف کا کہنا ہے کہ اقبال نے اشتراکیت اور اسلام کے ظاہری تشابہ سے دھوکا کھا کر اشتراکیت کی حمایت کی ہے اور انہیں معاشرتی

Cantwell Smith Modern Islam in India P. 120

۱۔ Iqbal Singh An introdution to the life and works of Muhammad Iqbal

انصاف معاشی انقلاب سے سنجیدہ انداز میں دلچسپی ہی نہ تھی۔ یہ بالکل مہمل باتیں ہیں۔ اقبال نے علم الاقتصاد (۱۹۰۳ء) لکھ کر معاشیات سے اپنی دلچسپی ابتدا میں ہی دکھادی تھی "گفتارِ اقبال" (مرتبہ محمد رفیق افضل) میں اشتراکیت کی مخالفت اور جزوی حمایت کے بارے میں اقبال کے طویل بیانات موجود ہیں۔ ۱۹۱۷ء کے بعد مدتوں اشتراکیت موضوعِ بحث رہی اور برصغیر کے ممتاز مجلّوں (مثلاً معارف اعظم گڑھ) میں اس نظام اور سرمایہ داری کے طویل تقابلی مطالعے پیش کیے جاتے رہے ہیں[۱]۔ ان حالات میں کیا اقبال جیسا بے بدل ذہین وفطین شخص ان مطالعات ومباحث سے بے نیاز رہ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اقبال نے شعوری طور پر سرمایہ داری اور اشتراکیت کی مخالفت کی ہے اور مؤخرالذکر نظام کی جزوی حمایت بھی۔

مسئلہ ملکیتِ زمین، معاشیاتِ اسلامی کا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور اصلاحاتِ اراضی کی کوششوں کے ضمن میں اس مسئلے پر ہمارے ہاں کافی لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ مسئلہ تین 'ز' کے فتنوں میں سے ایک ضرور ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

سرگزشتِ آدم اندر شرق وغرب — بہرِ خاکے فتنہ ہائے حرب وضرب
یک عروس و شوہرِ او ما ہمہ — آں فسوں گر، بے ہمہ، ہم، با ہمہ
عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است — نے از آنِ تو، نہ از آنِ من است

اس مسئلے پر اقبال نے نہ فقہی بات کی ہے اور نہ ہم ان کی بات کو دقیق فقہی مباحث میں شامل کر سکتے ہیں۔ مگر وہ زمین کے عام استفادے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بڑی زمینداریوں کے سخت خلاف تھے اور بہ شکل ملکیتِ زمین کے قائل کہے جا سکتے ہیں۔ ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو انہوں نے پنجاب کونسل میں بڑی زمینداریوں کی مخالفت اور چھوٹے مزارعین کی حمایت میں ایک معرکۃ الآرا تقریر کی تھی۔ "ارمغانِ حجاز" میں وہ اسلامی نظامِ معیشت کے بارے میں فرماتے ہیں:

---

[۱] خصوصاً مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے مقالے۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

بالِ جبریل کا ایک قطعہ "الارض للہ" اسم با مسمّٰی ہے۔ جب زمین اور اس کے محاصل دستِ قدرت میں ہیں، اور زمیندار اس کے مالک کیسے؟

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں — تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

جاوید نامے کا ایک عنوان 'ارض مِلکِ خدا است' ان کے اسی نظریہ کا مظہر ہے:

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دِہ خدایا، نکتہ ای از من پذیر — رزق و گور از وی بگیر، او را مگیر
باطنِ 'الارض للہ' ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

معاشی مسائل پر ان راہنماؤں کے ساتھ اقبال بڑی دلسوزی سے کہتے ہیں کہ مسلمان غیر استحصالی قرآنی معاشرہ تشکیل دیں جس میں معاشرتی انصاف اور مادی خوشحالی کے ساتھ ساتھ روحانیت کا دور دورہ ہو۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت — فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

مثنوی 'پس چہ باید' میں فرماتے ہیں۔

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم — تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن — نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن
کس نگردد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

مندرجہ بالا سطور "اقبال کے پاکستان" میں معاشرتی انصاف کا ایک خاکہ فراہم کرتی ہیں جو اس حقیقت کا مظہر ہے کہ معاشرتی انصاف میں جسم و روح کے دونوں تقاضے پیشِ نظر رکھنا ہے۔ اگر روحانی تقاضے نظر سے اوجھل ہوں اور معاشرہ روحِ ایمانی سے محروم ہو تو محض مادی ترقی، مصورِ پاکستان کی روح کو مسرور نہیں کر سکتی۔

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب　　تو اگر از رقصِ جان گیری نصیب
سرِّ دینِ مصطفیٰؐ گویم ترا　　هم بقبر اندر دعا گویم ترا

علامہ اقبالؒ کا عسکری آہنگ

علامہ اقبال کے "ترانہ ملی" کے عربی ترجمے[1] کی الجزائری مجاہد، فرانسیسیوں کے خلاف نبرد آزمائی کے دوران بڑے وسیع پیمانے پر رجز خوانی کرتے رہے۔ اس ترانے کا رجزیہ لہجہ بڑا نمایاں ہے۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلالؒ کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری — تھمتا نہ تھا کسی سے سَیل رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم — سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو — تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو — اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم — ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

کلامِ اقبال کا عسکری پہلو بڑا نمایاں ہے۔ اقبال شاعرِ زندگی ہیں اور زندگی میں جہاد و قتال کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہم جنگ کی آزمائشوں کے دوران اقبال کا پُرجوش کلام سن کر نئے ولولے لیتے ہیں، مگر بعد میں اس آہنگ کی افادیت فراموش کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض نام نہاد نقاد طنز یہ انداز میں شعرِ اقبال کو بگل اور طبل و عَلَم والا کلام بتاتے ہیں، عسکری آہنگ و لہجے کا کلام جوشِ ایماں کا مظہر ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کے کلام سے معاشرے کے تمام طبقے بہرہ مند ہوتے اور لطفِ خاص محسوس کرتے ہیں۔ افواج و

---

[1] مترجم استاذ الصاوی الشعلان۔ ترانہ ملی کے پہلے شعر کا ترجمہ یوں ہے:

الصین لنا والعرب لنا — والهند لنا والکل لنا
اضحی الاسلام لنا دیناً — وجمیع الکون لنا وطناً

عساکر کو اس کلام سے بہرہ مند ہونے کا خاص استحقاق ہے اور رہے گا۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال افغانستان کے دورے پر گئے، تو کابل میں نادر شاہ افغان کے اشارے پر ایک فوجی دستے نے ان کے مشہور فارسی مستزاد 'از خوابِ گراں' کی دھن پیش کی تھی۔ لوگ اگر فارسی سمجھتے ہوں تو اس مستزاد کے معانی اور اس کی دھن کی اثر آفرینی ان پر واضح ہو گی۔ ہم اس کے سات میں سے صرف دو بند توجہ دلانے کی خاطر نقل کرتے ہیں:

خاور ہمہ مانندِ غبارِ سرِ راہے است　　یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہے است
ہر ذرّہ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است　　از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دلاویزیِ افرنگ　　فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ　　معمارِ حرم، باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

اقبال نے 'ترانۂ ملی' کے ایک مصرعے میں مسلماں کی مجاہدانہ زندگی کی پوری تاریخ سمو دی ہے:۔ "تیغوں کے سایے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں"۔ اقبال مثنوی اسرار خودی میں فرماتے ہیں کہ اصلاح یا دفاع کے لیے جہاد ناگزیر ہے مگر اس کا مقصد رضائے الٰہی ہونا چاہیے نہ کہ جوع الارض۔ نظم "شکوہ" میں اقبال جہاد و قتال کے کیا عمدہ مناظر پیش کرتے ہیں۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں　　خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں　　کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی　　کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی
ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے　　اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے　　سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی — بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے — زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے
تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے — شہر قیصر کا جو تھا[۱] اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ — کاٹ کے رکھ دیے کفّار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟ — کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

وہ نظم 'شمع و شاعر' میں مسلمانوں کو کس قدر مؤثر جذبۂ جہاد دیتے ہیں:

شعلہ بن کے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

وہ گیارہ سالہ عرب لڑکی فاطمہ بنت عبد اللہ کی شہادت پر ۱۹۱۲ء میں بے حد دل گرم ہوئے۔ یہ لڑکی طرابلس میں مسلمان غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی اور اقبال نے فرمایا:

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

'جوابِ شکوہ' کا یہ شعر کس قدر رجز آفریں ہے:

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے — نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

اقبال معرکۂ خیر و شر کو ایک بدیہی اور تقاضائے فطرت کا عمل بتاتے ہیں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی[۲]
نہال ترک ز برقِ فرنگ بار آورد — ظہورِ مصطفوی را بہانہ بولہبی است[۳]
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے — وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی وہی عنتری[۴]

اقبال کا مردِ مومن یا مردِ فقیر حقیقت میں ایک سپاہی اور مجاہد ہے۔ وہ اپنی نگاہ یا شمشیر سے مخالفوں کو زیرِ اثر کر لیتا ہے۔ اقبال کے مردِ مجاہد کے سامنے بادشاہ بھی ہیچ ہیں۔ چند اشعار نقل کرتے ہیں:

---

۱ یعنی قسطنطنیہ (استنبول)
۲ ارتقا (بانگِ درا)
۳ پیامِ مشرق (مےباقی)
۴ میں اور تو (بانگِ درا)

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا | یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی
فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ | فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی | ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ | ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی رض
آئینِ جوانمرداں، حق گوئی و بے باکی | اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے | جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اقبال اپنے عسکری لہجے میں مسلمانوں کی عظیم جنگوں اور مسلمان جنگجوؤں کے کارنامے سموتے ہیں تاکہ اس عصر کے مسلمان بھی "فقرِ غیور" کی اہمیت محسوس کریں:

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود | نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر | از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقر را تا ذوقِ عریانی نماند | آں جلال اندر مسلمانی نماند

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر دوامِ جہاد کے بارے میں فرمایا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر دوامِ جہاد کے بارے میں فرمایا تھا "میری امت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا، نہ کسی عادل کا عدل اُسے ختم کر سکے گا نہ کسی ظالم کا ظلم"[۱]۔ جہاد دست و بازو اور قلم و زبان سے ہر طرح ممکن ہے اور اس کے کئی مدارج ہیں۔ اقبال مشہور مسلمان سپہ سالاروں جیسے حضرت علی رض، حضرت خالد رض بن ولید، طارق بن زیاد، محمود غزنوی اور سلطان ٹیپو کے حوالے سے مسلمانوں میں عسکری روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حضرت علی رض علم و فضل کے اعتبار سے "بابِ مدینۃ نبی ص" تھے مگر علم و فضل کے اس اعلیٰ مرتبے کے باوجود اسد اللہ الغالب، حیدرِ کرار اور فاتح خیبر بھی تھے۔ اقبال کئی مواقع پر حضرت علی رض کی اس شانِ کراری سے استناد کرتے ہیں اور بزدل بنا دینے والے اور نری موشگافیاں سکھانے والے علم سے پناہ مانگتے ہیں۔ ذیل کے

---

[۱] سیرت سرورِ عالم جلد اوّل از سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۵۳۴

اشعار میں بے نظیر نکتے ملتے ہیں:

من آن علم و فراست با پرکاہی نمی بینم	کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را
بہر نرخی کہ ایں کالا بگیری سود مند افتد	بزورِ بازوئے حیدرؓ بدہ ادراکِ رازی را[1]

می شناسی معنیٔ کرار چیست ؟	این مقامے از مقاماتِ علیؓ است
امتاں را در جہانِ بے ثبات	نیست ممکن جز بکراری حیات[2]

میرے لیے ہے فقط زورِ حیدریؓ کافی	نصیب ترے فلاطوں کی تیزیٔ ادراک[3]

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے	اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر[4]

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری[5]

عشق با نانِ جویں خیبر کشاد	عشق در اندام مہ چاکے نہاد[6]
گلستانے نہ خاکِ من برانگیز	نم چشمم بخون لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغ علیؓ را	نگاہے دل چو شمشیر علیؓ تیز[7]

سیف اللہ حضرت خالد بن ولید کا ذکر بھی اقبال کے ہاں کئی مواقع پر آیا ہے۔ ایک مقام پر اقبال ان کے حوالے سے مسئلہ جبر و قدر پر بحث کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اطاعتِ کامل سے انسان کی قوتِ اختیار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت خالدؓ بن ولید کو کسی جنگ میں شکست نہیں ہوئی اور انہوں نے کبھی اپنی مجبوری و بے چارگی

---

[1] زبورِ عجم [2] مثنوی مسافر

[3] بالِ جبریل [4] بانگِ درا

[5] جاوید نامہ، شرح اسرار معراج [6] [7] ارمغانِ حجاز، حضور رسالت مآب

کا شکوہ نہیں کیا۔ دراصل جو مردِ مومن امرِ خداوندی کا مطیع ہو، تقدیر اس کی تدبیر بن جاتی ہے:

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ — لرزہ از نیروئے او ابلیس و مرگ
جبرِ دین مرد صاحب ہمت است — جبرِ مردان از کمال قوت است
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر — جبر مردِ خام را آغوشِ قبر
جبرِ خالدؓ عالمے برہم زند — جبرِ ما بیخ و بنِ ما بر کند
کارِ مرداں است تسلیم و رضا — بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا[1]

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟[2]

طارقؒ بن زیاد، سلطان محمود غزنویؒ اور سلطان ٹیپو شہیدؒ وغیرہ کا ذکر اقبال کے ہاں جوشِ جہاد، اسلام کی عالمگیریت، شوقِ شہادت اور مبارزانہ منہاج کے سیاق میں ملتا ہے۔ صرف چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟ — ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست!
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت — ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی!
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

---

[1] جاوید نامہ، فلکِ مشتری [2] ارمغانِ حجاز

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے — نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

گنبدے در طوف او چرخِ بریں — تربتِ سلطانِ محمود است ایں
برقِ سوزاں تیغ بے زنہار او — دشت و در لرزندہ از یلغارِ او
زیرِ گردوں آیتِ اللہ رایتش — قدسیاں قرآں سرا بر تربتش

اقبال اپنے عسکری لہجے میں ایک درویش اور جسور پرندے "شاہین" کی مثال دیتے ہیں اور اس کی زبانی حکمتِ جہاد و مبارزہ واضح کرتے ہیں مثلاً:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربِ غازیانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

تو دانی کہ بازاں ز یک جوہر اند — دلِ شیر دارند و مشتِ پرانہ
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش — جسور و غیور و کلاں گیر باش

فارسی کے یہاں متعدد اشعار "پندِ باز بہ بچۂ خویش" گویا عسکری لائحہ عمل ہیں۔ ایک دوسری نظم میں شاہین نے ماہی (مچھلی) کو جو جواب دیا، اس کا ایک مصرع پاکستان ایئر فورس نے اپنا "سمبل" بنا رکھا ہے:

زد بانگ کہ شاہینم و کارم بزمیں چیست — صحراست کہ دریاست تہِ بال و پرِ ماست

بگذرز سرآب و بہ پہنائے ہوا ساز ایں نکتہ نبیند مگر آں دیدہ کہ بیناست [1]

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان حق کے علم بردار ہیں اور خالص توحید اب ان ہی کی میراث ہے۔ لہٰذا "نکتہ توحید" کی مشکلات بیچ توجیہ طلب نہیں۔ انہیں حق و باطل کی آویزش کی لذت سے آگاہ ہونا چاہیے:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے!
سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشاد شرق و غرب تیغ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر [3]

"ضربِ کلیم" کو اقبال نے "اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف" کا عنوان دیا ہے۔ اس کا سرنامہ ہی کس قدر رجماسہ نما ہے:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل، نہ جل ترنگ!

قطعہ "جہاد" میں وہ اہلِ یورپ پر طنز کرتے ہیں کہ خود تو وہ غرقِ اسلحہ ہو رہے ہیں مگر اسلام کے تصورِ جہاد کو وہ ایک فرسودہ بات قرار دے رہے ہیں۔

تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

---

[1] پیامِ مشرق

[2] بہ جوئی گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلات لا الٰہ را! (ارمغانِ حجاز)

[3] ضربِ کلیم (نکتۂ توحید) اور بالِ جبریل (غزل ۵ حصہ دوم)

اقبال توحید کے عملی تقاضوں پر توجہ دلاتے رہے ہیں۔ "توحید" کے منجملہ تقاضوں میں سے دو یہ ہیں کہ مسلمان فکر کے علاوہ عمل اور پالیسی میں بھی متحد ہوں اور ماسوا اللہ سے بے خوفی اُن کا شعار ہو۔ ذیل کا قطعہ "توحید" بھی ضرب کلیم میں ہے:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو — خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میرِ سپہ! تیری سپہ دیکھی ہے — قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام[1]
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ — وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

"بالِ جبریل" کی ایک غزل کے بعض اشعار بھی عسکری تفکر کے آئینہ دار ہیں:

میرِ سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف — آہ وہ تیرِ نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف
صحبتِ پیرِ رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی — اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگ "لاتخف"[2]

اقبال کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ ایمانِ کامل، عشق و مستی اور فکرِ غیور کی متاع سے مالا مال ہو:

خرقۂ "لاتحزنوا" اندر برش — "انتم الاعلون" تاجے بر سرش[3]

عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور — خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم[4]

وہ در اصل سراپا عمل انسانوں کے حویا تھے اور ایسے انسان مجاہدین و معیار ترین میں ہی

---

[1] قل ھو اللہ (سورۂ توحید یا اخلاص کے ابتدائی کلمات) یعنی توحید

[2] قرآن مجید ۲۰/۶۸: قلنا لاتخف انک انت الاعلیٰ

[3] ایضاً ۳: ۱۳۹: ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

[4] رموزِ بے خودی، ضرب کلیم (غزل)

مل سکتے ہیں :

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شراب "الست"
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟[۱]

قطعہ "مستی کردار" میں وہ صوفی، ملاّ اور شاعر سب کو ناقدِ عمل قرار دیتے ہیں :

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — ملاّ کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار[۱]

ذیل کا شعر ایسے معلوم ہوتا ہے کسی بحری حکمتِ عملی کے ماہر نے لکھا ہے :

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے — فرنگ رہگذرِ سیل بے پناہ میں ہے[۲]

اقبال کو جنگ و جہاد میں مادی وسائل کی اہمیت سے انکار نہیں، مگر قوتِ ایمان ان کے نزدیک زیادہ اساسی اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ اگر سینے میں "دلِ بیدار" نہ ہو تو وسائل سے کچھ نہیں بن پڑتا۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی — ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
کافر ہے مسلماں[۳]، تو نہ شاہی نہ فقیری — مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
مومن ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں[۴] — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی[۵]

کلامِ اقبال کے "عسکری آہنگ" کے بارے میں یہ چند اشارے قلم برداشتہ لکھے گئے۔ علامہ اقبال کو بھی اپنی شاعری کے اس پہلو کا احساس تھا جبھی وہ سپاہی یا امیرِ جنود نہ ہوتے ہوئے بھی (ضربِ کلیم میں) اپنے صاحبِ مبارزہ ہونے پر فخر کرتے ہیں اور اس فخر کو

۱، ۲ ضربِ کلیم — ۳ بالِ جبریل
۴ یعنی نام نہاد مسلماں — ۵ ضربِ کلیم، بالِ جبریل

ہم بجا کہیں گے :

اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نے امیرِ جنود
مقابلہ تو زمانے کا خوب کرتا ہوں

عساکرِ پاکستان نے اپنا شعار "ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ" بنایا ہے اور اقبال کے کلام کا کافی حصہ ان ہی امور کا مبین ہے۔ عسکری اصلاحات اور تلازمات کی بھی حضرت دانائے راز کے ہاں فراوانی ہے اور کیوں نہ ہو، انہوں نے دینِ اسلام کو "فقرِ غیور" کے طور پر متعارف کروایا ہے :

زندگانی کے لیئے نارِ خودی نور و حضور
روح اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی

گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود

دوسرا نام اس دین کا ہے "فقرِ غیور"[1]
لفظ "اسلام" سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر

پاکستانی زبانوں میں پشتو غالباً "مارشل شاعری" کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ علامہ اقبال افسوس کرتے تھے کہ وہ پشتو نہیں جانتے ورنہ وہ پشتو مارشل آہنگ کو اردو یا فارسی میں منتقل کرتے۔ خوش حال خاں خٹک (وفات ۱۱۰۰ھ - ۱۶۸۹ء) کی شاعری کے انگریزی تراجم سے انہوں نے استفادہ کیا اور اس کی لے کو "جاوید نامہ" (آں سوئے افلاک) اور "بالِ جبریل" میں سمویا[2]۔ اس مبارز شاعر کے بارے میں انہوں نے ایک مقالہ بھی لکھا تھا جو سہ ماہی اسلامک کلچر، مطبوعہ حیدر آباد دکن کی مئی ۱۹۲۸ء کی اشاعت میں شامل تھا[3]۔ "ضربِ کلیم" کے آخر میں انہوں نے محراب گل افغان کے فرضی نام سے بیس قطعے

---

[1] ضربِ کلیم : قطعۂ اسلام۔ اس سے قبل کے قطعے "فقر و ملوکیت" میں ہے :

ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم
فقرِ جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے

[2] جاوید نامہ: گفتگوئے احمد شاہ ابدالی با زندہ رود۔ بالِ جبریل: خوش حال خان کی وصیت

[3] متن دیکھیں مثلاً سید عبدالواحد معینی کے مرتبہ: تھاٹس اینڈ ریفلکشنز آف اقبال (لاہور، طبع ثانی ۱۹۷۳ء)، صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۴)

Kushhal Khan Khattack, The Afghan Warrior Poet,

لکھے جو پشتو مارشل آہنگ سے ماخوذ ہیں۔ ان قطعات کے کئی اشعار عسکری آہنگ کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے ایک انتخاب پر ہم اس مختصر بحث کو ختم کر دیتے ہیں:

باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظِ بدن کے لیے روح کو کر دوں ہلاک
اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

محرمِ خودی سے جس دم ہوا فقر
تو بھی شہنشاہ، میں بھی شہنشاہ
قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی، سلطاں کی بارگاہ

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دمِ پرواز سرتاپا نظر

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لیے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا؟
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا؟

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری
خود دار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ — اے بندۂ مومن تو بشیری، تو نذیری

اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسّر — جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی
در معرکہ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت — اے بندۂ مومن تو کجائی؟ تو کجائی؟
خورشید، سراپردۂ مشرق سے نکل کر — پہنا مرے کہسار کو ملبوسِ حنائی

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں — ہمت ہو پَر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اُس کا آسماں — زیرِ پَر آگیا تو یہی آسماں، زمیں

گُلِ لالہ کی ادبی روایات اور اقبالؒ

گُلِ لالہ یا اس کی تصاویر اہل علم وفضل کی نظر سے اکثر گزری ہوں گی۔ اسکے درخت کے شاخ و برگ خشخاش کے درخت کی مانند بلکہ اس سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ "لالہ" لغت میں "آلالہ" بھی مذکور ہے۔ عموماً یہ مرطوب آب وہوا میں، کوہستانی علاقوں اور ندی نالوں کے کنارے لگایا جاتا ہے۔ "لالہ" کی متعدد اقسام ہیں مگر معروف تر نام دو ہیں: لالۂ بیابانی، صحرائی یا پیکانی جو خودرو ہوتے ہیں، اور مارچ کے آخر یا اپریل کے وسط تک اُگ آتا ہے۔ یہ سرخ رنگ کا اور اس کی خوبصورت پتیوں میں دھبے اور داغ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لالہ کو "شقائق" یا "لالہ نعمانی" (لالہ خونیں) کہتے ہیں۔ یہ تخم کاری یا اس کی جڑوں کو کاٹ کر زمین میں دبا لینے سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے لالہ میں قدرتی حسن ہے اور دوسرے میں مصنوعی اور زیادہ سُرخی۔

فارسی زبان و ادبیات میں "لالہ" کی روایات بڑی، ہمہ گیر اور مرغوب رہی ہیں۔ علامہ علی اکبر دہخدا مرحوم (متوفی ۱۹۵۶ء) نے اپنے لغت نامہؒ میں ان روایات سے خاطر خواہ بحث فرمائی ہے۔ "لالہ" اور "لال" (سرخ) میں معنوی رابطہ موجود ہے۔ پہلوی زبان میں "آل یا آل" کے معنی سرخ کے ہیں۔ اس صورت میں الالہ یا آلالہ گویا ال اور لالہ کو مدغم کرکے بنایا گیا ہے (آلِ لالہ) اور اس کے معانی مطلق طور پر "سرخ پھول" (گل یا گلِ سرخ) کے ہیں۔ بابا طاہر عریاں ہمدانی (پانچویں صدی کے مشہور عارف اور شاعر) کی کردستانی لہجے میں ایک دوبیتی ہے:

الالہ کوہساران ہفتہ ای بی — بنفشہ جوئباران ہفتہ ای بی
منادی می کرد شہر و بہ شہرو — وفای گلعذاران ہفتہ ای بی

سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے دربار کا ملک الشعراء عنصری بلخی (م ۴۳۱ھ)

کہتا ہے :

دو لب چو نار کفیدہ دو لب چو سوسن مرخ   دو رخ چو نار شگفتہ دو برگ لالۂ لال

غرض "لالہ" فارسی ادبیات میں "گل مرخ" کے مترادف استعمال ہوا ہے۔ "لالہ" موسم بہار کے اوائل میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے "گلِ بہاری یا گل نخستین" ہے۔ اس کا رنگ "ارغوانی" اور پتیوں کے کنارے سرخ ہوتے ہیں۔ اس خاطر اکثر شاعروں نے اسے معشوق کے لبوں، سرخ شراب، "خون یا دل خون شدہ" سے تشبیہہ دی ہے۔ حکیم فردوسی طوسی (م ۴۱۱ھ) قصۂ زال میں رودابہ کے حسن کے بارے میں کہتا ہے :

دو رخسارہ چو لالہ اندر چمن   سرِ جعد زلفش شکن بر شکن

حکیم عمر خیام (م : تقریباً ۵۳۰ھ) نے "لالہ عذاری" کا ذکر یوں کیا ہے :

ہر چند کہ رنگ و بوی زیباست مرا   چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا

لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی (م ۷۹۲ھ) کے دو شعر ہیں :

چو آفتاب می از مشرق پیالہ بر آید   ز باغِ عارضِ ساقی ہزار لالہ بر آید

ای گل تو دوش داغِ صبوحی کشیدہ ای   ما آن شقائقیم کہ با داغ زادہ ایم

لالہ کا رنگ "مے گوں" اور اس کے پودے کا سر "پگڑی" کی مانند ہے۔ مرحوم دہخدا کی رائے میں اسی لیے اس پھول کو ترکی میں Tulbend Lalesi کہا گیا ہے جس کا مطلب "عمامہ نما پھول" ہے۔ لفظ "تولبند" (تلبند) کلاسیکی فارسی میں بہ معنی "عمامہ" موجود ہے۔ اسی لفظ سے Turban بنایا گیا اور لالہ کو انگریزی میں "Tulip" کہا گیا۔ اس پھول کے ساری مغربی زبانوں میں ایسے ہی نام ہیں جن میں "عمامہ نمائی" کا تصور موجود ہے۔ مثلاً اطالوی میں Tulipano، جرمن میں Tuple، روسی میں Tulpan اور فرانسیسی میں Tulipe۔ اس سے ظاہر ہے کہ "لالہ" ترکی کے توسط سے یورپ میں متعارف ہوا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب وہاں کی ادبیات میں اس لفظ کی تعبیرات کو اہلِ مشرق نے مطالعہ کیا، تو اسے "لالۂ فرنگی" کا نام دیا۔ دولت ترکیہ کے ہاں "لالہ" کی مذہبی اور قومی

اہمیت بھی رہی ہے اور اس سلسلے کے چند دلچسپ واقعات مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) سولہویں صدی عیسوی سے گل "لالہ" نے قلمرو عثمانی میں اہمیت حاصل کرنا شروع کی اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اسے خاصی ثقافتی اہمیت حاصل ہوگئی۔ جو مقام بھی اس کی کاشت کی خاطر موزوں ہوتا وہاں اسے کاشت کیا جاتا، اس کے گلدستے گراں قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ سلطان احمد سوم عثمانی (۱۷۰۳ء - ۱۷۳۰ء) اور اس کے لائق وزیر اعظم ابراہیم پاشا کا دور "عصر لالہ" کہلاتا ہے۔ "لالہ فروشی" اور "لالہ کی نقاشی" اس کے دور کا طرۂ امتیاز تھا۔

(ب) استنبول میں اب بھی ایک مسجد موجود ہے جس کا نام "مسجد لالہ" ہے۔ اس مسجد میں اور کئی دوسری مساجد میں "گل لالہ" کی نقاشی کے بڑے دلآویز نمونے اب تک موجود ہیں۔ اسے ایک مقدس علامت سمجھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ نقاش اسے اسم اعظم "اللہ" کی مقلوب صورت (از روئے ابجد لالہ کے برابر) متصور کر کے نقاشی کرتے تھے۔ یہ تعبیر خواہ ہمارے لیے دلچسپ نہ ہو، منشا یہ تھا کہ "لالہ" سے اسم اعظم اور مقامات خداوندی کی صناعی دونوں نظر کے سامنے جلوہ گر ہو جائیں۔

(ج) "لالہ" از روئے ابجد "ہلال" کے برابر ہے۔ "ہلال" سلاطین عثمانی کے قومی پرچم کی علامت رہا ہے (اب تک یہی شعار باقی ہے اور ہم نے بھی اسے بانڈک تصرف قبول کیا ہے) پروفیسر شلیکوف نے ادرنہ کی ایک "مسجد سلیمیہ" کے بارے میں مشہور ترک مورخ محمد ذکی پاکالن کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے۔ اس مسجد کے ستون سنگ مرمر کے بنائے گئے اور مؤذن کا ماذنہ ان کے اوپر رکھا گیا ہے۔ ان تمام ستونوں کی تراش خراش "گل لالہ" کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں سنگ تراش نے بتایا: "لالہ کو پیش نظر رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ لالہ کی مقلوب صورت 'ہلال' ہے اور دولت عثمانی کے باشکوہ جاہ و جلال کا مظہر یہی 'ہلال' ہے۔"

"لالہ" کی سرخی اور گوناگوں تعبیرات۔

جیسا کہ اشارہ کیا گیا، ادبیات فارسی میں لالہ گوں، لالہ عذار اور لالہ رنگ وغیرہ کی متعدد تعبیرات اسی مناسبت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس سیاق میں لالہ، گل سرخ ہے۔

رونی لاہوری جشن نوروز (فروردین) کے سلسلے میں کہتا ہے:

جشن فرخندہ فروردیں است | او ز بازارِ گل نسرین است!!
گرد بستان ز فروغِ لالہ!! | گوئی آتشکدۂ برزین است!

فردوسی

بیاباں چو دریای خوں شد درست | تو گفتی ز روی زمین لالہ دست
زمین سر بسر خستہ و کشتہ شد | دیا لالہ و زعفران رستہ شد

نظیری نیشاپوری کا شعر ہے:

ایمن نتواں بود گر از ابر بہاری | شد لالستان ہر چہ زمین ز الستان داشت

شمس الشعراء سروش اصفہانی (م ۱۲۸۵ھ) بہار کی آمد کے سلسلے میں رقمطراز ہے:

لالہ بہ صحرا چو در خوالق نعمان | کوہ بہ سبزہ چو در ستبرق رضوان

صوفیہ کرام کے ہاں "لالہ" دل محزوں و مہجور کی تعبیر ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اشک لالہ گوں۔

ایرانی روایات میں مذکور ہے کہ جب آدم علیہ السلام کا "ہبوط" ہوا، تو شجر ممنوعہ کے کھانے پر ندامت کی غرض سے آپ برسوں روتے رہے۔ آپ کے آنسوؤں سے "لالہ کے پھول" اُگے ہیں۔ حکیم فردوسی نے ایرانی پہلوان سیاؤش کے تورانی پہلوان افراسیاب کے ہاتھوں قتل ہو جانے کے سلسلے میں لکھا کہ سیاؤش کے قطرات خون سے کوہ و دشت پر "لالہ" اُگ آیا تھا۔ امامیہ روایات کی رو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں دشت کربلا پر آنسو بہائے تھے اور ان مبارک آنسوؤں سے "لالے" پیدا ہوئے تھے۔ غالباً ان روایات اور دیگر معنوی مناسبات کی رو سے مختلف شعراء نے آنسوؤں کو "لالہ" سے تشبیہ دی اور ان سے "لالے" پیدا ہوتے دکھائے ہیں۔ حکیم نظامی گنجوی (م تقریباً ۶۰۱ھ) "لیلیٰ و مجنوں" میں لکھتے ہیں:

سودای دلش بسر در آمد | سرسام سر شب بدل برآمد
گرمای تموز ژالہ را برد | باد آمد و برگ لالہ را برد

اور "اسکندر نامہ" میں:

زد ندش یکی تیغ پہلو گذار | کہ از خون زمین گشت چوں لالہ زار

امیر خسرو دہلوی (م ۷۲۵ھ) نے اپنی مثنوی "مجنوں و لیلیٰ" میں واضح تر لکھا ہے۔

مجنوں ز سرشک لالہ می ساخت | او با گل و لالہ عشق می باخت

می ریخت ز دیدہ سیلِ اندوہ | چوں ابر بہار بر سرِ کوہ

گفتا کہ مریز سیلِ اندوہ | کاں لالہ خوش است بر سرِ کوہ

آتش و داغ لالہ۔

"لالہ" کی "آتش گوں" تعبیرات اس کے رنگ کی وجہ سے ہیں۔ چراغ لالہ یا آتش لالہ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے۔ زرتشتی دین میں "آتش سوزانی" کی اہمیت واضح ہے۔ اسی خاطر بعض جگہ لالہ کو اس دین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ امیر معزی (م تقریباً ۵۲۰ھ) نے کہا ہے:

لطیفی چوں گل و لالہ کہ او شد | گل و لالہ شد ابراہیم آذر

امیدی تہرانی رازی (م ۹۲۹ھ) کا شعر ہے:

بہ باغ لالہ و گل آتشِ خلیل بود | پدید گشتہ ز لختی دخان و لختی نار

اور حافظ شیرازی کے یہ ابیات:

نہ ایں زمان دلِ حافظ در آتشِ ہوس است | کہ داغدار ازل ہمچو لالہ خودروست

بہ باغ تازہ کن آئین دین زرتشتی | کنوں کہ لالہ برافروخت آتش نمرود

لالہ۔ گلِ سوگوار

لالہ کی ایک اور تعبیر سوگواری اور ماتم کرنا ہے۔ یہ گل مجموعۂ اضداد کبھی مایۂ مسرت ہے اور کبھی سرمایۂ غم۔ "گل مرگ" اس خاطر ہے کہ اس کا جام ہمیشہ پُر خون ہے۔ خون آلود کفن کا مظہر ہے۔ اکثر شاعروں نے آرزو کی ہے کہ گل لالہ ان کا مزار پوش اور علامت ماتم بنا رہے،

بابا فغانی شیرازی (م ۹۲۵ھ) کہتے ہیں:

ہنوز سوزد م از داغِ آرزوی تو دل | گہی کہ لالہ دمد از سر مزار مرا

بابا فغانی ایک سوختہ دل شاعر تھے اور "لالہ" کی تقریباً ساری تعبیرات ان کے کلام میں موجود ہیں: مثلاً:

لالہ از حد میبرد مستی و گل تر دامنی — خیز و در جام شراب انداز مشک سوده را
عرضہ یدور گل مده ساغرِ لالہ گون مرا — کز گل و مل نمی رسد فائده جز جنون مرا
تازگی کر شدز مے آں رخ ہمچو لالہ را — تازه کند بیک نفس داغِ ہزار سالہ را
صحبت و جلوه داده مستان پیالہا را — لب از نشاط خندان گلہا و لالہا را
مدامت چہرہِ گلگوں از شراب لالہ گوں یارا — ترا خوبی و مارا گرمی ٔ حسنت فزون یارا
کشتہ ٔ تیغِ عشق را توده ٔ خار زیرِ سر — بالشِ پرنیاں کجا، لالہ و نسترن کجا؟

فغانی بلا مبالغہ "لالہ" کی تعبیرات کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے تھے ان کی کم کوئی غزل ہو گی جس میں صراحتاً یا اشارةً گل لالہ کا ذکر نہ ہو اور علامہ اقبال کے ہاں لالہ کی تمام تر روایات کا موجود ہونا غالباً فغانی کے تحتِ تاثیر ہی ہے۔

گلِ لالہ اور اقبال۔

علامہ کے اردو اور فارسی کلام میں "لالہ" کی کم و بیش تمام ادبی روایات موجود ہیں فغانی کی "لالہ دوستی" کا ہم نے ذکر کر دیا۔ اقبال کالج کی تعلیم کے زمانے سے ہی فغانی کی سوختہ دلی سے آگاہ تھے اور ان کی لالہ دوستی غالباً فغانی کے زیرِ اثر ہو گی۔ ۱۸۹۶ء میں اقبال نے مولانا ابو سعید محمد شعیب کی کتاب "مختصر العروض" کی تاریخ تالیف لکھتے وقت فرمایا تھا۔

صدائے نالہ ٔ دل غیرتِ نظمِ فغانی ہے — مگر شورِ فغاں بلبل نے موزوں کر لیا اپنا[11]

مرحومہ عطیہ بیگم لکھتی ہیں کہ یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو جب اقبال نے ان سے پہلی ملاقات کی تو دورانِ گفتگو ان سے کہا تھا کہ بابا فغانی شیرازی کا کلام پڑھا کریں[12]۔ اقبال کی متعدد غزلیات (پیامِ مشرق اور زبورِ عجم میں) بابا فغانی کے تتبع میں ہیں۔ یہ بات واضح تر صورت میں ایک الگ مقالے کی متقاضی ہے مگر اس اشارے سے فغانی اور اقبال کے "لالہ" کا رشتہ واضح ہو جاتا ہے۔

اقبال کے ہاں ان کی ہر تصنیف میں (اسرارِ خودی تا ارمغانِ حجاز)[13] "لالہ" کی تعبیرات موجود ہیں:

۱۔ "لالہ" بہ معنی گل، گلِ سرخ یا گلِ خودرو کے مترادف ملاحظہ ہو۔

لالہ ای کو بر سر کوہی دمید — گوشہ ای دامانِ گلچینی ندید

مدتی با لالہ رویان ساختم
عشق با مرغولہ مویان باختم

بنتوان ریختن در آغوش خزاں لالہ و گل
خیز و بر شاخِ کہن خونِ رگِ تاک انداز

گمان مبر کہ بیک شیوہ عشق می بازند
قبا بدوش گل و لالہ بی جنوں چاک است

مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز
دامانِ گل و لالہ کشیدن دگر آموز

ای لالہ ای چراغ کہستان و باغ و راغ
در من نگر کہ می دہم از زندگی سراغ

در برگ لالہ و گل آں رنگ و نم نماندہ
در نالہ ہائے مرغان آں زیر و بم نماندہ

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا؟

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

۲- لالہ کی سرخی اور ظاہری زیبائی کی امثلہ میں سے چند یہ ہیں۔

زشبنم لالہ را گوہر نماند
دمی مانند دمی دیگر نماند

رخت بہ کاشمر گشا، کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں، لالہ چمن چمن نگر

لالہ زخاک بردمید، موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر ببین، آب شکن شکن نگر

دختری کی برہمنی، لالہ رخی سمن بری
چشم بروی او گشا، باز بخویشتن نگر

۳- اقبال کے ہاں "لالہ" آمد بہار کا پیغام بر بھی اکثر مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ "پیام مشرق" حصہ افکار کی پہلی نظم "گل نخستین" میں "لالہ" کا ذکر اسماً تو نہیں مگر کیفیات سب اسی "گل" کی ہیں۔ "عروس لالہ" اور (دلہنوں کی مانند) "حنا بندی" کی تراکیب علامہ نے اکثر استعمال کی ہیں۔ عروس کی مناسبت سے "حجلہ" یا "سراچہ" کے الفاظ لانا ان کی قادر کلامی کی دلیل ہے جس کی مناسبت سے وہ "لالہ" کو "گل نخستین" بناتے ہیں:

حنا ز خونِ دلِ نو بہار می بندد
عروس لالہ چہ اندازہ تشنہ رنگ است

عروسِ لالہ برون آمد از سراچہ ناز
بیا کہ جان تو سوزم ز حرف شوق انگیز

بیا کہ بلبل شوریدہ نغمہ پرداز است　　عروس لالہ، سراپا کرشمہ و ناز است

حنا بند عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا　　تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو　　کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

عروس لالہ، مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب　　کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

۴ - "لالۂ طور" علامہ کی ان دو بیتیوں کا مجموعہ ہے جن میں "لالہ" کے سوز دروں اور داغِ دل کی تمام تر جلوہ گری موجود ہے۔ اوپر ذکر کیا تھا کہ صوفیہ کرام کے ہاں "لالہ" سوز محبت اور داغِ جدائی کا استعارہ رہا ہے۔ اقبال کے ہاں یہ بھی ہے اور اس سے ماورا بھی۔ "لالہ" کے "داغِ دل" اور "پیہم سوختن" اور "سوز اندان" کی کیفیت ہی علامہ کو زیادہ پسند ہے۔ وہ "لالہ" کے ظاہری حسن سے مانوس تو ہیں، مگر مرعوب نہیں۔ ان کے دل و دماغ پر چھا جانے کی جو خاصیت "لالہ" میں موجود ہے، وہ اس کا سوز دروں ہے:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن　　مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

ان کی نظر جب بھی "لالہ" کا درد و داغ نمایاں ہے اور اس سے وہ بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ ایسے شاعر دیکھنا چاہتے تھے جو "لالہ" کی اسی معنویت کو ذہن نشین کر سکیں:

درد ما عشق نا دمیدہ لالہ ہا　　نا شنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا

چوں نسیمش در ریاضِ ما وزد　　زرمک اندر لالہ و گل می خزد

ای میانِ کیسہ ات نقدِ سخن　　بر عیارِ زندگی او را بزن

قرنہا بر لالہ پا کوبیدہ ئی　　عارض از شبنم چو گل شوئیدہ ئی

خویش را بر ریگِ سوزاں ہم بزن　　غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن

لالہ پیہم سوختن قانونِ او　　بر جہد اندر رگِ او خونِ او

لالہ کی اس خصوصیت پر ہی اقبال نے زیادہ لکھا ہے۔ "لالۂ طور" کا عنوان ہی اس

بات کا غماز ہے کہ یہ گل، ان کی نظر میں "عشق حقیقی" اور "تمنائے ازلی" کی علامت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "طور" پر ہی "ارنی" کا اظہار فرمایا تھا۔ اقبال کا "لالہ" اکثر مقامات پر اسی آرزو کے اظہار کا استعارہ ہے۔ "لالۂ طور" کی چند دو بیتیوں کا مطالعہ ہمارے مدعا کو واضح کر دے گا:

۱- خرد گفت: او بچشم اندر نگنجد — نگاہ شوق در امید و بیم است
نمی گردد کہن افسانۂ طور — کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

۲- بہ برگ لالہ رنگ آمیزیٔ عشق — بجان ما بلا انگیزیٔ عشق
اگر این خاکدان را واشگافی — درونش بنگری خونریزیٔ عشق

۳- نہ ہر کس از محبت مایہ دار است — نہ با ہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغ جگر تاب — دل لعل بدخشاں بی شرار است

۴- اگر در مشت خاک تو نہادند — دل صد پارہ ی خونابہ باری
ز ابر تو بہاراں گریہ آموز — کہ از اشک تو روید لالہ زاری

اس چوتھی دو بیتی میں اقبال اشکوں سے "لالہ زار" اگانے کے آرزومند ہیں۔ اشکوں سے "لالہ" اگ آنے کی یہ تعبیر مذکورہ ادبی اور مذہبی روایات سے کتنی ہم آہنگ بات ہے۔ اقبال کے ہاں یہ تعبیر دوسرے مقامات پر بھی آئی ہے۔ "لم یلد و لم یولد" کے زیر عنوان فرماتے ہیں۔

قطرہ ای از لالہ ای حمراستی — قطرہ ای از نرگس شہلاستی

اور دوسرے مقام پر:

مثال لالہ و گل شعلہ از زمیں روید — اگر بخاک گلستان تراود از جامش

مگر زیادہ واضح انداز میں اقبال کے ہاں "لالے" نفس کی گرمی اور برکت سے یا خون کی آبیاری سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ بات بھی فارسی ادبیات میں موجود ہے۔ حضرت امام حسین رض کے ذکر شہادت میں فرماتے ہیں:

برزمین کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

تا قیامت قطع استبداد کرد | موج خونِ او چمن ایجاد کرد

تخلیق و تکمیل کائنات کے موضوع پر فرماتے ہیں (دوسرا شعر نبی اکرمؐ کی منقبت میں ہے):

صد نیستان کاشت تا یک نالہ رست | صد چمن خون کرد تا یک لالہ رست

از قبای لالہ ہای این چمن ! | پاک شست آلودگی ہای کہن

"پس چہ باید کرد" کا ایک شعر منقبتِ رسولؐ میں اس طرح کہا گیا ہے:

از دمِ سیرابِ آں امیؐ لقب | لالہ رست از ریگ صحرای عرب

"لالہ" کا یہ استعارہ" دین اسلام" کی خاطر ہے۔"اسلام" میں سوز و ساز، ایثار و قربانی غرض تکمیل حیات کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ اس لیے وہ" لالہ" ہے بلکہ" لالہ صحرائی" جس کی" قبا" راہ خدا کے مجاہدوں کی مانند" خون آلود" رہتی ہے:

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے | قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو | منزل ہے کہاں تیری اے" لالہ صحرائی"

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے | چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا | نازشِ موسم گل" لالہ صحرائی" تھا

اقبالؒ اپنی منفرد اور صاحب درد و سوز شخصیت کو بھی" لالہ صحرائی" سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ سب میں ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ اور ممتاز ہیں۔ جس طرح" لالہ" کے دردِ داغ کی دوسرے گلوں کو خبر نہیں، یہی حال اقبالؒ کے سوز و ساز کا تھا:

من مثال لالہ ی صحراستم | درمیان محفلی تنہاستم

ازاں آبی کہ در من لالہ کارد ساتگینی دہ | کفِ خاک مرا ساقی بباد فرودینی دہ

داغی کہ سوزد ، در سینۂ من | آں داغ کم سوخت در لالہ زاران

ای لالہ صحرائی تنہا نتوانی سوخت | این داغِ جگر تابی . بر سینۂ آدم زن

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما | ای جوانانِ عجم ، جانِ من و جانِ شما

نمود لالہ ی صحرانشین ز خونابم | چنانکہ بادہ ی لعلی بساتگین کردند

از داغِ فراق او در دل چمنی دارم ۔۔۔ ای لالۂ صحرائی، با تو سخنی دارم
مثالِ لالہ فتادم بگوشۂ چمنی ۔۔۔ مرا ز تیرِ نگاہی نشانہ بر جگر است
شریکِ درد و سوزِ لالہ بودم ۔۔۔ ضمیرِ زندگی را وا نمودم!
ندانم با کہ گفتم نکتۂ شوق ۔۔۔ کہ تنہا بودم و تنہا سرودم
نخستین لالۂ صبحِ بہارم ۔۔۔ پیاپی سوزم از داغی کہ دارم
بچشمم کم مبین تنہائیم را ۔۔۔ کہ من صد کاروان گل در کنارم
بجوای لالہ از کس غمگساری ۔۔۔ چو من خواہ از درونِ خویش یاری
بہر بادی کہ آید سینہ بگشای ۔۔۔ نگہ دار آں کہن داغی کہ داری
در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحراستم ۔۔۔ نی نصیبِ محفلی، نی قسمتِ کاشانۂ
اٹھائے کچھ ورق "لالے" نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے ۔۔۔ چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے ۔۔۔ کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی
حاجت نہیں اے گل اسے کچھ شرح و بیاں کی ۔۔۔ تصویر ہمارے دلِ پُرخوں کی ہے "لالہ"

۵- "لالے" کی متعدد پرسوز و ساز تعبیرات و علامات اقبال کے ہاں موجود ہیں۔ "لالے" کا خونیں ازل ہونا" "قبائے لالہ کا چاک ہونا" "آتشِ لالہ"، "چراغِ لالہ" اور اس قسم کی دوسری تراکیب، جس معنی خیزی سے اقبال علیہ الرحمۃ نے استعمال کیں اور انہیں لفظی اور معنوی اعتبار سے نباہا، وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔ پھر ان کے ہاں لالہ کی ساری اقسام: صحرائی، پیکانی اور نعمانی وغیرہ پوری معنویت کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔ چند مثالیں:

ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ ۔۔۔ جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز
سرِ خاکِ شہیدی برگہای لالہ می پاشم ۔۔۔ کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد
ضمیرِ لالہ مے لعل سے ہوا لبریز ۔۔۔ اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں! ۔۔۔ چاکِ گل و لالہ کو رفو کر!
صحبتِ اہلِ صفا، سوز و حضور و سرور ۔۔۔ سرخوش و پرسوز ہے لالۂ لبِ آبجو
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں ۔۔۔ کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا ۔۔۔ نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز ۔۔۔ ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو
بے اشکِ سحرگاہی تقویم خودی مشکل ۔۔۔ یہ لالۂ پیکانی خوش تر ہے کنارِ جو

اس آخری شعر کی خوبیاں قابل توجہ و تحسین ہیں۔ اب فارسی شعروں کے نمونے دیکھیں:

کار مش در باغ و روید آتشی ۔۔۔ از قبای لالہ شوید آتشی
عشق را داغی مثالِ لالہ بس ۔۔۔ در گریبانش گل یک نالہ بس
آتش او دم بخویش اندر کشید ۔۔۔ لالہ گردید و ز شاخی بردمید
چراغِ لالہ اندر دشت و صحرا ۔۔۔ شود روشن تر از بادِ بہاراں
ز گردوں فتد آنچہ بر "لالہ" ی من ۔۔۔ فرو ریزم او را بر برگِ گیاہی
نماید آنچہ ہست این وادی گل ۔۔۔ درون لالۂ آتش بجان نیست
بچشم ما چمن یک موج رنگیست ۔۔۔ کہ می داند بچشم بلبلان چیست؟
معنی از حرف او ہمی روید ۔۔۔ صفت لالہ ہای نعمانی
لالہ را گفتم: یکی دیگر بسوز، ۔۔۔ گفت: راز ما نمی دانی ہنوز
از خس و خاشاک تعمیر وجود ۔۔۔ غیر حسرت چیست پاداشِ نمود؟

۶۔ علامہ نے "لالہ" کی خصوصیات کو جاننے اور پرکھنے کی خاطر بڑی محنت کی ہے۔ اس محنت کشی کے نتیجے میں وہ لالہ شناسی کے مدعی ہیں اور یہ بات بلامبالغہ درست معلوم ہوتی ہے۔

بہ نگاہ آشنائی چو درون لالہ دیدم ۔۔۔ ہمہ ذوق و شوق دیدم ہمہ آہ و نالہ دیدم
بہار آمد نگہ می غلطد اندر آتشِ لالہ ۔۔۔ ہزاراں نالہ خیزد از دل پرکالہ پرکالہ
مزاجِ لالہ خود روشناسم ۔۔۔ بشاخ اندر گلاں را بو شناسم
از آن دارد مرا مرغِ چمن دوست ۔۔۔ مقام نغمہ ہای او شناسم

۷۔ بابا فغانی شیرازی کی آرزو، ہم نے اوپر نقل کی ہے: شاعر متمنی تھا کہ "لالہ" اس کا مزار پوش رہے تاکہ اس کے سوزِ دل کی نمایندگی ہوتی رہے۔ اقبال نے جداگانہ اشعار میں (پیام مشرق اور ارمغان حجاز) اسی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ ایک اور دو بیتی میں اپنے

جسدِ خاکی سے "لالہ" کو دل کی صورت میں مجسم ہوتے بھی دکھایا ہے۔ متعلقہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ای کہ از خمخانۂ فطرت بجامم ریختی — ز آتش صہبای من بگداز مینای مرا
عشق را سرمایہ ساز از گرمیٔ فریاد من — شعلۂ بیباک گردان خاکِ سینای مرا
چوں بمیرم از غبار من چراغِ لالہ ساز — تازہ کن داغِ مرا، سوزان بصحرای مرا

متاعِ من دلِ درد آشنائی است — نصیبِ من فغانِ نارسائی است
بخاکِ مرقدِ من لالہ خوشتر — کہ ہم خاموش و ہم خونیں نوای است
دمید آں لالہ از مشتِ غبارم — کہ خونش می تراود از کنارم[۱۳]
قبولش کن ز راہِ دل نوازی — کہ من غیر از دلی چیزی ندارم

اسی پر ہم اس شذرے کو ختم کر رہے ہیں۔[۱۵] اتنی گزارش ضروری ہے کہ ہم نے فارسی ادبیات میں موجود "گلِ لالہ" کی روایات و امثلہ کو بڑے اختصار سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل شعرا کے دواوین میں خاص طور پر شواہد و امثلہ کی فراوانی ہے:

خاقانی شروانی (م ۵۹۵ھ)، مجیرالدین مجیر بیلقانی (م ۵۸۶ھ)، وحشی بافقی یزدی (م ۹۹۱ھ) عرفی شیرازی (م ۹۹۹ھ)، طالب آملی (م ۱۰۳۶ھ) شیخ حزین الاہیجی اصفہانی (م ۱۱۸۱ھ) اور معاصر شعرا میں ابوالنصر فتح اللہ شیبانی (م ۱۳۰۸ھ) اور پروین اعتصامی آشتیانی (م ۱۹۴۱ء)

حواشی

۱ - برہانِ قاطع (بہ تصحیح ڈاکٹر محمد معین، تہران ۱۳۴۲ شمسی) میں آیا ہے: "لالہ بروزنِ ہالہ ہر گلی را گویند کہ خودرو باشد عموماً"

۲ - نعمان = خون۔

۳ - مجلد ۳ تہران ۱۳۳۰ شمسی صفحہ ۵۹ تا ۶۵۔

۴ - ترکی میں بہ معنی سرخ ہے۔

۵ - ایرانی شمالی علاقے خصوصاً بحرِ خزر (دریائے مازندران) کے کنارے پیدا ہونے والا لالہ چھوٹے قد والا اور بنفشہ کی مانند سفید رنگ کا بھی ہوتا ہے۔

۶ـ۔ مقدمۃ الادب از علامہ جار اللہ زمخشری خوارزمی باہتمام سید محمد کاظم امام جلد اول تہران ۱۳۴۲ش صفحہ ۳۵۶۔

۷ـ۔ Melikoff کا مقالہ Journal Asiatique شمارہ ۳ و ۴ سال ۱۹۶۷ء جس سے راقم نے اپنی فرانسیسی ہم جماعت برزیت سیمون کی مدد سے استفادہ کیا ہے۔

۸ـ۔ ملاحظہ ہو: ان سائی کلوپیڈیا برٹانیکا ''Tulip''

۹ـ مجنون و لیلیٰ مطبوعہ ماسکو ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۷۸

۱۰ـ بعض تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: Rigious Pictures in Turkish Art مصنفہ استنبول ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۳۵-۱۳۶

۱۱ـ۔ اردو سہ ماہی، شمارہ ۲ سال ۱۹۶۹ء صفحہ ۳۸۔

۱۲ـ۔ اقبال از عطیہ بیگم صفحہ ۱۲

۱۳ـ۔ اسرار و رموز میں بیس، پیام مشرق میں پچپن، زبورِ عجم میں پچیس، جاوید نامہ میں دس، پس چہ باید کرد مع مسافر میں نو، ارمغانِ حجاز میں پندرہ، بانگ درا میں بارہ، بال جبریل میں ستر اور ضربِ کلیم میں دس بار لالہ کا صریحاً ذکر آیا ہے، مجموعاً ایسے دو سو اشعار ہوگئے۔

۱۴ـ۔ اقبال کے اشعار کے حوالے ہم نے ہر جگہ ان کی کتابوں کے سنہ طباعت کے اعتبار سے دیے ہیں: اردو میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز حصہ اردو، فارسی میں اسرار و رموز، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد مع مسافر اور ارمغان حجاز حصہ فارسی کے اشعار تقدم و تاخر کے طریقے سے منقول ہیں۔

۱۵ـ۔ کئی برس قبل سید عابد علی عابد نے "کلام اقبال میں گل لالہ کا ارتقا" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جو ان کی تالیف "انتقاد" (مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۶ء) میں موجود ہے مگر ؎

"بطرز دیگر از مقصود گفتم"

اقبالؒ کے مترادف اشعار

برصغیر کے ذولسانین شعراء میں علامہ اقبالؒ کی ایک ممتاز خصوصیت ان کے مترادف اردو اور فارسی اشعار ہیں۔ یہ خصوصیت غالب کے اردو اور فارسی کلام میں بھی نظر آتی ہے مگر کمتر پیمانے پر اور دوسروں کے ہاں شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ مترادف اشعار غیر شعوری ہی نہیں، شعوری کوشش کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ اقبالؒ ایک صاحبِ پیغام شاعر تھے اور ان کا مقصد و ہدف ابلاغِ پیغام تھا:

سحر در شاخسارِ بوستانے   چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
بر آور ہر چہ اندر سینہ داری   سرودے، نالۂ، آہے، فغانے[۱]

اس پیغام کو جس وقت جس زبان کا جامہ ملا، علامہ مرحوم نے وہی اسے پہنا دیا۔ ہم اس کوشش کو شعوری اس لئے کہتے ہیں کہ اقبالؒ اپنی متاخر کتابوں میں اپنے مقدم اشعار نقل کرتے رہے کیونکہ خاص اور اہم نکات کی تکرار مفید مقاصد کی حامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض مطالب اردو میں مکرر کہے اور بعض فارسی میں مگر یہاں دراصل اردو اور فارسی کے بعض مترادف اشعار اور معانی کے نمونوں پر توجہ دلانا مقصود ہے۔ اقبالؒ کی اُردو شاعری کے لئے یہ تصور رہے کہ یہ ایک محدود طبقے کی خاطر ہے جبکہ فارسی شاعری کے مخاطبین زیادہ تھے۔ عملاً ایسا ہی سہی۔ اقبالؒ اپنی فارسی شاعری کی پذیرائی سے خرسند تھے کہ اہل عجم تو اس سے اثر پذیر ہو رہے تھے۔[۲] ان کی آرزو تھی کہ عرب دنیا بھی ان کے خیالات سے آگاہ ہو۔[۳] مگر علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ انہوں نے "اسرارِ خودی" پہلے اردو میں لکھنا شروع کی

---

[۱] - پیام مشرق، لالۂ طور   [۲] و [۳] - پیام مشرق، غزلیات:

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت   عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است
عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا   عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

تھی اور بعد میں اسے فارسی میں لکھنا آسان اور مناسب معلوم ہوا۔ انہوں نے فارسی سرائی کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ برصغیر کے کم لوگ اور خواص ہی پہلے ان خیالات سے آگاہ ہوئے۔ مگر ان خواص فارسی دانوں نے بھی مسئلہ خودی اور اس کے متعلقات کے بارے میں سالہا سال تک ایک معرکہ برپا کئے رکھا تھا۔

اقبال کی تصانیف کا تقدم و تاخر تو معلوم ہے، 'بانگِ درا' کے حصہ اول اور حصہ دوم کی زمانی مدت بھی معلوم ہے مگر علامہ مرحوم کی بہت کم نظموں کی تصنیف کا ماہ و سال معلوم ہے اس لئے اردو یا فارسی کے کسی شعر کو ہم پہلے نقل کریں اور اس کے مترادف یا ہم مضمون شعر کو بعد میں، تو کہیں یہ ترتیب زمانی ہو گی اور کہیں قیاسی۔ حضرتِ علامہ کو دونوں زبانوں میں سخن سرائی کا جو کمال اور تجر حاصل تھا، وہ کسی تمدیح و توصیف کا محتاج نہیں۔ مترادف اشعار کے ہم نے بعض عنوانات قائم کر دئے ہیں۔ اقبال کے اردو اور فارسی کلیات کے اشاریے بھی متداول اور مروج ہیں اس لئے نظموں یا کتابوں کا اجمالی حوالہ کافی معلوم ہو رہا ہے۔ اقبال کے مترادف اشعار کی یہ پیشکش شاید حضرت علامہ کے خاص خاص افکار پر توجہ دینے کی خاطر مفید ہو سکے۔

استغنا اور بے نیازی۔

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیئے مثلِ حبابِ آبجو رہنا — تصویر درد (۱۹۰۴)

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عینِ دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر — (شمع اور شاعر ۱۹۱۲ء)

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش — ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش
(اسرار خودی)

۱۔ انوار اقبال مرتب بشیر احمد ڈار ص ۱۵۶ مکتوب مورخہ ۱۶۔ اگست ۱۹۲۸ء بنام تمکین کاظمی۔

۲۔ دیکھیں گفتار اقبال، مرتبہ ڈاکٹر محمد رفیق افضل لاہور ۱۹۶۹ء ص ۲۵۰

ترجمہ: بلبلے کی طرح مردانہ غیرت سے رہو۔ سمندر میں بھی اپنے پیالے کو الٹا رکھو۔
(پانی کا بلبلا اوندھے پیالے کا سا ہوتا ہے)۔

مسلمانوں کا دوام۔

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

(ترانۂ ہندی ۱۹۰۴ء)

ان اشعار میں اہل ہند کی بقا کا ذکر ہے۔ بعد میں اقبال نے مسلمانوں کے عوام کی بات اسی انداز میں کہی:

شعلہ ہائے انقلابِ روزگار — چوں بباغِ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند — آں جہانگیری بجہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخوانِ او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست — ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

(رموزِ بیخودی)

مچھلی کا سا عالمی وطن۔

نظم 'وطنیت (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)' کو اقبال نے ۱۹۰۸ء میں لکھا اور اس کا ایک شعر یوں ہے:

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

اب یہ خیال رموزِ بیخودی (اشاعت اول ۱۹۱۸ء) میں دیکھیں:

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو / یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

ترجمہ: سمندر میں مچھلی کی طرح آباد رہ یعنی مقام اور وطن کی قید سے آزاد رہ۔
(مچھلیاں زیرِ آب ہر کہیں پہنچتی رہتی ہیں)۔

فرد اور ملت کا محکم رابطہ۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں[1]
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
(شمع و شاعر)

فرد تا اندر جماعت گم شود   قطرۂ وسعت طلب قلزم شود   (رموز)

مومن کا اطمینان اور تبسم۔

قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے   (مسلم جون ۱۹۱۲ء)

رموز بیخودی میں بھی یہی مضمون ہے:

از رضا مسلم مثالِ کوکب است   در رہ ہستی تبسم برلب است

ترجمہ: رضائے الٰہی (کے جذبے) سے مسلمان ستارے کی طرح ہے۔ زندگی کے راستے میں اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔

ملت کی خزاں سے وفا۔

رموز بیخودی کے آغاز میں ہے:

برگِ سبزے کز نہالِ خویش ریخت   از بہاراں تارِ امیدش گسیخت

یعنی وہ سبز پتا جو اپنی شاخ سے جدا ہوگیا، اس کی امید کا تار بہار سے ٹوٹ گیا (وہ دوبارہ اس شاخ سے نہیں جڑ سکتا)

علامہ اقبال یہ درس دیتے ہیں کہ قوم کے بُرے دنوں میں اس کا ساتھ نہ دینے والے کو یہ حق نہیں ملنا چاہیے کہ وہ بھلے دنوں میں ایک بار پھر 'قومیت' بدل دے۔ اس موضوع پر بانگِ درا (حصہ سوم) میں ایک قطعہ ہے:

---

[1] اقبال کے نثری افکار مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۱۷۸-۱۷۹ (دہلی ۱۹۷۷ء) میں اس شعر کی شرح بقلم اقبال دیکھیے

:: پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

یہ دراصل اس چھ شعروں والے قطعے کے آخری بیت کا مصرعِ ثانی ہے۔

اس قطعے کا پہلا شعر نقل شدہ فارسی شعر کا سا ہے:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

بزمِ انجم کا سا اتحادِ مسلمین۔

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں (بزمِ انجم)

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں (جوابِ شکوہ)

اس موضوع پر مثنوی رموزِ بیخودی کے دو شعر یوں ہیں:

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است — ہستیٔ کوکب ز کوکب محکم است
رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است — چوں نگہ ہم از نگاہ ما گم است

'ایں قوم' سے مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے۔

اولادِ ابراہیمؑ کی آزری سرشت۔

بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیمؑ پدر، اور پسر آزر ہیں[1] (جوابِ شکوہ)

چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانے — جز ایں کہ پور خلیل است و آزری داند
(پیامِ مشرق، غزلیات)

میراثِ آبائی کا حق۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو (جوابِ شکوہ)

---

[1] آزر (ز کے ساتھ) حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے اور قرآن مجید میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ ذال کے ساتھ 'آذر' بمعنی آگ ہے۔

آں عزمِ بلند آور، آں سوزِ جگر آور
شمشیرِ پدر خواہی، بازوئے پدر آور (ارمغان حجاز، اردو)

زندگی کی ناپائداری۔

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستی ناپائدار دیکھ
(بانگ درا، حصہ اول)

زخاک خویش بہ تعمیر آدمے برخیز
کہ فرصتِ تو بقدرِ تبسمِ شرر است
(پیام مشرق، غزلیات)

زندگی، تبسم اور خوش دلی ہے۔

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی، گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

'پیام مشرق' کے قطعہ 'زندگی' میں بادل، برق اور گل و شبنم مصروفِ گفتگو ہیں اور نتیجہ یہی نکلتا ہے:

شبے زار نالید ابرِ بہار
کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقِ سبک سیر و گفت
خطا کردۂ، خندۂ یکدم است
ندانم بہ گلشن کہ برد ایں خبر
سخنہا میانِ گل و شبنم است

شاعر، حسین کو حسین تر بنانے والا۔

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن
خیزد از سینائے او انوارِ حسن
از نگاہش خوب گردد، خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر
(اسرار)

نظامی عروضی سمرقندی نے 'چہار مقالہ' میں لکھا ہے کہ شاعر حسین کو زشت اور زشت کو زیبا دکھا سکتا ہے۔ اقبال کو ایسی منفی تعریفوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ان کے نزدیک شاعرِ حیات کو زشت سے واسطہ ہی نہیں وہ زیبا کو زیبا تر بنانے والا ہے یعنی حسنِ قدرت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ منقولہ دو شعروں کا مفہوم 'بال جبریل' میں دیکھیں:

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

شمشیرِ خودی۔

رومی سے تضمین کرنے کی مثال ہے۔ رومی نے نکتوں (اعلیٰ اور لطیف باتوں) کے بارے میں کہا ہے کہ وہ تلوار کی کاٹ رکھتی ہے اور عام لوگوں کو دخل در معقولات سے دور رہنا چاہیے:

نکتہ ہا چوں تیغ پولا داست تیز گر نمی فہمی ز پیشش ما گریز

اس شعر کو اقبال نے اسرار خودی (اشاعت اول ۱۹۱۵ء) میں تضمین کر کے اپنا لیا اور 'بال جبریل' میں شمشیرِ خودی کے حوالے سے بات کو زیادہ دلآویز بنا دیا ہے:

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

شہادتِ عظمیٰ۔

حضرت امام حسینؓ حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی اولاد میں سے تھے۔ اس مناسبت سے شہادتِ عظمیٰ کے بارے میں مضامین ملاحظہ ہوں:

اللہ اللہ، بائے بسم اللہ پدر معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

(رموز)

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

(ب ج)

حق و باطل کی ازلی آویزش۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (ب ج حصہ سوم)

نہالِ ترک ز برق فرنگ بار آورد

ظہورِ مصطفویؐ را بہانہ بولہبی است

ترجمہ: اہلِ مغرب کی بجلی سے ترکوں کی شاخ میں پھل آ گئے۔ ابولہب کی روش

لہ قرآن مجید ۱۰۷:۳۷

حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ظہور کا بہانہ بنتی ہے۔

اشاعتِ توحید، مسلمانوں کی عظیم ذمہ داری۔

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست   حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست   (رموز)

ترجمہ: چونکہ خدا کی کبریائی کے بیان میں تیری ہستی کا راز ہے، لہٰذا لا الٰہ الا اللہ (توحید) کی حفاظت اور نشر و اشاعت تیرا ہدف ہونا چاہیے۔

یہی دینِ محکم، یہی فتحِ باب   کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

دیدہ ور یا دانائے راز افراد کا خال خال ہونا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا   (طلوعِ اسلام، ب د)

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں   (زبورِ عجم)

شمشیرِ شعر۔

اقبالؔ کا ایک معیارِ شعر یہ ہے کہ شعر میں برشِ شمشیر کی سی صلاحیت ہو تاکہ باطل نظریات کا اس کے ذریعے صفایا ہوتا رہے۔ اسرارِ خودی میں ہے (تمہید):

باغبان زورِ کلامم آزمود   مصرعے کارید و شمشیرے درود

یعنی مالی نے میرے کلام کا زور و اثر آزما لیا۔ اس نے ایک مصرع بویا اور شمشیر کاٹی۔ (مقصد یہ کہ میرا مصرع شمشیر بن جاتا ہے)۔ اب زبورِ عجم کی غزل کا ایک شعر دیکھیں۔ ایں کار سے مراد کارِ شاعری ہے اور نے نوازی بھی اقبالؔ کے ہاں شاعری ہے:

اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چہ نادانی   دمِ شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را

آتشِ باطل اور گلشنِ ابراہیمؑ۔

زانکہ ما را فطرتِ ابراہیمیؑ است   ہم بہ مولا نسبتِ ابراہیمیؑ است

از تہ آتش بر اندازیم گل!   نارِ ہر نمرود را سازیم گل

(رموز)

اردو شعروں میں بھی یہ مضمون تکرار ہوا ہے :

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا — آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا (ج ش)

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے — کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

(خضرِ راہ)

ملوکیت کی خرابی و فساد۔

قرآن مجید میں (۳۴ : ۲۷) مطلق العنان بادشاہوں کی دو مخصوص خصوصیتیں یہ بتائی گئی ہیں کہ وہ تباہی انگیز جنگجو ہوتے ہیں اور نیکوں کی تذلیل اور بروں کی حمایت ان کا وطیرہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال یوں تو ملوکیت کے تصور کے ہی خلاف تھے اور اس نظام کو وہ دنیا کی خرابیوں اور مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب مانتے تھے مگر منقولہ دو.... خصوصیتوں کی طرف بھی انہوں نے اشارے کئے اور نئے نکتے نکالے ہیں۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ 'انّ الملوک'

سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری (خضر راہ)

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں (جاوید نامہ)

ترجمہ: حق کا علم بادشاہوں کے ہاتھوں الٹا ہوتا ہے۔ ان کے (جنگجویانہ) داخل ہونے سے گاؤں (والے) ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔

اتحاد اسلامی، وحدت فکر و عمل۔

مثنوی رموزِ بیخودی میں ہے :

وحدت افکار و کردار آفریں — تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

یہ تصور بعد میں ضرب کلیم کے ایک قطعے میں بھی ہے کہ توحید کا تقاضا فکر کے علاوہ عمل کا بھی اتحاد ہے۔ ایک شعر ہے :

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ — وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

عشق کی عقل پر برتری۔

عشق اور عقل اقبال کے ہاں ایک مفصل موضوع ہے۔ ہم یہاں کچھ مترادف نما

اشعار نقل کرتے ہیں جو عقل اور عشق کے رابطے اور ان کی جداگانہ حدود کو واضح کرتے ہیں۔

گریز آخر ز عقلِ ذو فنوں کرد دلِ خود کام را از عشق خوں کرد
ز اقبالِ فلک پیما چہ پرسی حکیمِ نکتہ دانِ ما جنوں کرد

(پ م)

عقل است چراغِ تو در رہگذارے نہ عشق است ایاغِ تو با بندۂ محرم زن
مقامِ عشق سے آساں گذر گیا اقبال مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

(اب ج)

خرد سے راہرو روشن بصر ہے خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے؟
ترے سینے میں دم ہے، دل نہیں ہے ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

(اب ج)

آرزوئے دیدار۔

زبورِ عجم کی غزل کا ایک شعر ہے:

فرصتِ کشمکش مدہ، ایں دلِ بے قرار را یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

یوں تو یہ تغزل کا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال نے نظم 'ذوق و شوق' کے معروف نعتیہ بند سے قبل اسے دوبارہ نقل کیا ہے۔[1] بالِ جبریل ہی اس کا اردو مترادف موجود ہے:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

---

[1] ابتدائی شعر ہے:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

خودی ایک تلخ مداوا ہے۔

اقبالؔ کو احساس تھا کہ ان کی تعلیماتِ خودی پر عمل کرنا قی زمانہ بے حد دشوار ہے مگر مسلمانوں کے انحطاط کی کیفیت دُور کرنے کی خاطر حکیم الامت کے پاس اس سے بہتر نسخہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ بار بار یہ نکتہ بتاتے ہیں کہ داروئے خودی تلخ سہی مگر ہے وہ ایک کا میاب نسخہ۔ آدمی کو اتنا بد ذوق نہ ہونا چاہیئے کہ کڑوی دوا نہ پی سکے۔ تریاق (زہر کا مداوا) بھی تو آخر زہر سے ہی بنتا ہے:

گرفتم اینکہ شرابِ خودی بسے تلخ است — بدردِ خویش نگر، زہر مابدرماں کش

اے کہ نوشم خردہ از تیزی نیشم مرنج — نیش ہم باید کہ آدم را رگِ خوابے زند

کسی کو زہر نوشیں راخوردازجام زرینے — مئے تلخ از سفالِ من کجا گیرد بہ تریاقی

تینوں منقولہ اشعار زبورِعجم کی تین مختلف غزلیات میں سے ہیں۔ بالِ جبریل کے ایک شعر میں (خودی کے ذکر کے بغیر) یہ بات دہرائی گئی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ زبورِعجم اور بال جبریل کی کئی غزلوں کے مضامین مشترک ہیں:

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر — کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

خطرات کی اہمیّت۔

یکبیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است

سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است (پ م، غزلیات)

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں

وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد (ب ج)

تسلسلِ زندگی۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود (پ م)

دما دم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

(ب ج)

مسائلِ زمین اور بلند فکری۔

پیامِ مشرق کی نظم "طیارہ" میں اقبالؔ نے شیخ سعدی کے ایک شعر کو اپنایا اور اسے تضمین کیا ہے:

تو کارِ زمین را نکو ساختی — کہ با آسماں نیز پرداختی؟

اقبالؔ نے اردو میں بھی اسی مضمون کو مشقِ سخن بنایا ہے کہ افلاکی اور فکری مسائل سے زیادہ ضروری زمین کے مسائل ہیں۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی — (ضربِ کلیم)

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضائے گردوں ہے بے کرانہ — (ارمغانِ حجاز)

فراق اور وصال۔

اقبالؔ کو فراق وصال سے عزیز تر تھا کیونکہ یہ خودی کے تقاضائے جدوجہد کیلئے مفید ہے۔ اس موضوع پر فارسی شعر پیامِ مشرق سے ہے اور اردو نظم "ذوق و شوق"..... (بالِ جبریل) سے

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذّتِ طلب

گرمیٔ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

تمنائے سرفروشی۔

حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور ان کی تحریکِ حریت پر بر اقبالؔ نے بہت لکھا۔ اس ضمن میں بالترتیب زبورِ عجم اور بالِ جبریل کا ایک ایک شعر یکساں تاثر

رکھتا ہے۔

ریگ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام

خونِ حسینؓ باز دہ، کوفہ و شام خویش را

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

انسان کی فرشتوں پر فضیلت۔

علوم و فنون کی ترقی، جدوجہد، تنوع اور اختراعات وغیرہ وہ امور ہیں جن سے انسان فرشتوں سے برتر قرار پاتا ہے۔ اور اقبال نے کئی اشعار میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے:

عروج آدمِ خاکی ز تازہ کاریہاست — مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند (از زبورِ عجم)

فرشتہ گرچہ بروں از طلسمِ افلاک است — نگاہِ او بہ تماشائے کفِ خاک است (〃)

فرشتہ را دگر آں فرصتِ سجود کجاست — کہ نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند (〃)

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام — یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

غرورِ ملوکیت کا علاج۔

مطلق العنان بادشاہوں کا علاج سفاک آمر اور انقلابی لوگ کرتے رہے ہیں:

آں کس کہ بسر دارد سودائے جہانگیری — تسکینِ جنونش کن با نشترِ چنگیزی (از زبور)

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا — اللہ کے نشتر ہیں، تیمور ہو یا چنگیز (ابج)

ستاروں پر کمندیں ڈالنا۔

غلامِ ہمتِ بیدارِ آں سوارانم — ستارہ را بہ سِنانِ سفتہ در گرہ بستند (زبور)

بہ مہر و ماہ کمند گلو فشار انداز — ستارہ را ز فلک گیر و در گریباں کش (〃)

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند — طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند (ارمغانِ حجاز)

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند (ابج)

آخری شعر خوشحال خان خٹک سے ماخوذ ہے۔ پشتو اور فارسی زبانوں کے اس شاعر

(وفات ۱۶۸۹ء) کے بارے میں اقبال نے انگریزی میں ایک مقالہ بھی سپردِ قلم کیا تھا۔ (اسلامک کلچر دکن مئی - ۱۹۲۸ء)

جوانانِ ملت سے خاص رغبت : چند دعائیں :

زبادۂ کہ بخاکِ من آتشے آمیخت — پیالۂ بجوانانِ نو نیاز آور

(زبور)

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن — دارم از روزے کہ می آید سخن

بر جواناں سہل کن حرفِ مرا — بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

(جاوید نامہ)

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق، میری نظر بخش دے

(بالِ جبریل)

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

(بالِ جبریل)

شاعر کا قربِ جبرئیل :

بہ جبریلِ امیں ہم داستانم — رقیب و قاصد و درباں ندانم

(زبور، گلشنِ رازِ جدید)

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

(بالِ جبریل)

اہلِ زمانہ کی بے حسی کا شکوہ۔

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است — کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

(پیامِ مشرق)

نصیبے نیست از سوزِ درونم مرز و بومم را
زدم اکسیر را بر خاکِ صحرا باطل افتاد است

(زبور)

مسلم ہندی چرا میداں گذاشت؟ ہمت او بوئے کراری نداشت
مشتِ خاکش آنچناں گردیدہ سرد گرمیٔ آواز من کارے نکرد
(مثنوی مسافر)

زمانے کی سی مسلسل تگ و دو۔

نکنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم بسراغِ صبحِ فردا روشِ زمانہ دارم
(پیام مشرق)

بہ ہر نفس کہ برآری جہاں دگرگوں کن دریں رباطِ کہن صورتِ زمانہ گذر
(زبور)

دُور کے ماحول سے رازِ حرم کی آگاہی تک۔

مرا اگرچہ بہ بت خانہ پرورش دادند چکید از لبِ من آنچہ در دلِ حرم است
(زبور)

رازِ حرم سے شاید اقبالؔ باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ
(بالِ جبریل)

نقطۂ نظر کی تبدیلی، جہانِ نو کی دریافت ہے۔

بخود نگر گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است
(زبور)

نوعے دیگر بیں جہاں دیگر شود ایں زمین و آسمان دیگر شود
(جاوید نامہ)

عالمِ نو کی تمنا۔

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں
(بالِ جبریل)

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز
(بالِ جبریل)

حکیم الامت کا دمِ غنیمت۔

دُرد من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست | پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد

(زبور)

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب | نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے

(بالِ جبریل)

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں | کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(بالِ جبریل)

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے۔

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی | گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

(بالِ جبریل)

نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی | سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

(بالِ جبریل)

استحکام آموز شاعر۔

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو | نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

(بالِ جبریل)

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی | کہ بانگِ صورِ سرافیلؑ دل نواز نہیں

(بالِ جبریل)

تین سو سالہ آثار زوال۔

بظاہر شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدد الف ثانیؒ (وفات ھ) کے بعد کے عصر کو اقبالؒ برصغیر کے مسلمانوں کا مکمل دورِ انحطاط کا دور قرار دیتے رہے اور اس کا اظہار ان کی اردو اور فارسی شاعری دونوں زبانوں کی شاعری میں ملتا ہے:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند | اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

(پس چہ باید کرد)

از سہ قرن این ملّتِ خوار و زبوں — زندہ بے سوز و سرورِ اندروں

(پس چہ باید کرد)

امواجِ وجود کی ہنگامہ خیزی۔

زبورِ عجم کے ایک مستزاد کا چوتھا بند یوں ہے۔

دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست — دریائے تو دریاست کہ افزوں نشد و کاست

بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست — از سینۂ چاکش صفتِ موجِ رواں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

فارسی میں دریا، بحر اور سمندر کے بھی مترادف ہے۔ اقبال بہر حال یہ درس دے رہے ہیں کہ انسانی وجود بھی دریا و بحر کی امواج کی متحرک اور جدّ و جہد میں مشغول رہے۔ ضربِ کلیم میں ہے۔

اپنی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا ہے — جس کی ہوائیں تند نہ ہوں وہ کیسا طوفاں

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان

نفس گرم یا سوزِ نفس کی اہمیت۔

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات — ترے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

(بانگِ درا حصہ سوم)

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیاگر ہوں — یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے؟

(بالِ جبریل)

دنیائے تخلیق و تفکر۔

وہی جہاں ہے تیرا جس کو تو کرے پیدا — یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

بالِ جبریل

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(ضربِ کلیم)

مقام راہبر و راہنما۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے
(بالِ جبریل)

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیّلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند
(ضربِ کلیم)

توحید حقیقت اور دنیا ایک شکستنی صنم کدہ۔

بیا کہ مثلِ خلیلؑ
(زبور)

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالٰہ میں ہے
(بالِ جبریل)

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الّا اللہ
(ضربِ کلیم)

عیّاری اور ظاہرداری کا دور۔

چہ ملّائی، چہ درویشی، چہ سلطانی چہ دربانی
فروغِ کار می جوید بہ سالوسی و دزّانی
(زبور)

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری
(بالِ جبریل)

صوفی و ملّا کی بے ذوقی۔

نہ اینجا چشمکِ ساقی، نہ آنجا حرفِ مشتاقی
ز بزم صوفی و ملّا بسے غمناک می آیم
(زبور)

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
(بالِ جبریل)

لطفِ شاعری۔

جز نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم
ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینۂ من ریزی؟
(زبور)

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور   عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود

(ضربِ کلیم)

افلاک کا خیالی سفر۔

تھا تخیل جو ہم سفر میرا   آسمان پر ہوا گذر میرا

(بانگ درا حصہ سوم)

خیال من بہ تماشائے آسمان بوداست   بدوش ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بوداست

(زبور)

ترجمہ: میرا خیال آسمان کے نظارے میں مصروف رہا (اور) چاند کے کندھے اور کہکشاں کی آغوش میں رہا ہے۔

فضائل یقین۔

بہ پیچ و تابِ خرد اگرچہ لذتِ دگر است   یقینِ سادہ دلاں بہ نکتہ ہائے دقیق

(زبور)

علاجِ ضعفِ یقیں اس سے ہو نہیں سکتا   غریب گرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

(بالِ جبریل)

وحی الٰہی کو ہی سب کا خیال رہتا ہے

عقلِ خود بیں، غافل از بہبودِ غیر   سود خود بیند نبیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ   در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف   وصل و فصلش لایراعی لایخاف،

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں   راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد   سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

خوب دیا خوبِ عمل کی ہو گرہ وا کیونکر   گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

(ضربِ کلیم)

دورِ انحطاط کی شاعری اور تصوف ۔

چہ گویمت چہ بودی چہ کردہ ؟ چہ شعری — کہ خون کند جگرم را ایازیٔ محمود
تو آں نئے کہ مصلیٰ ز کہکشاں می کرد — شرابِ صوفی و شاعر ترا ز خویشتن ربود (زبور)
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے — فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

(بالِ جبریل)

زمین خدا کی ملکیت ہے ۔

دہ خدایا ، نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر ، او را مگیر

(جاوید نامہ)

دہ خدایا ، یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں — تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

(بالِ جبریل)

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب آیا

پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمیں (ارمغانِ حجاز)

قرآن مجید ، مظلوموں اور کمزوروں کا حامی ہے ۔

چیست قرآں ؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

(جاوید نامہ)

ارمغانِ حجاز میں یہ بیان شرعِ پیغمبرؐ کے حوالے سے ملتا ہے :

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں ، نے فقیرِ رہ نشیں

ذہنی فضا کا فرق ۔

کرگساں را رسم و آئینِ دیگر است — سطوتِ پروازِ بازاں دیگر است
رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور — رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور

(جاوید نامہ)

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں — کرگس کا جہاں اور ہے ، شاہیں کا جہاں اور

(بالِ جبریل)

ہر شے کا سفر۔

جادہ ہا چوں رہ رواں اندر سفر　　ہر کجا پنہاں سفر پیدا حضر

(جاوید نامہ)

ہر شے مسافر ہر چیز راہی　　کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز　　سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

(بال جبریل)

مجاہد اور فلسفی کا فرق۔

ایں کار حکیمے نیست، دامانِ کلیمے گیر

صد بندہ ساحل مست، یک بندۂ دریا مست　　(مسافر)

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

(بال جبریل)

شاعر کی فطرت شکنی۔

غزل آں گوے کہ فطرت سازِ خود را پردہ گرداند

چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است　　(زبور)

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو　　صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟

(ضربِ کلیم)

عثمانی اور تیموری ترکوں کی مختلف تقدیریں۔

۱۹۲۴ء میں عثمانی ترکوں نے خلافت کو خیر باد کہا اور جمہوریت اپنائی۔ ان کی تجدید حیات سے اقبال متاثر تھے مگر انہیں تیموری ترکوں یعنی مغلوں کے مٹ جانے کا افسوس تھا۔ یہ اشعار اسی افسوس کے آئینہ دار ہیں:

درفشِ ملتِ عثمانیاں دوبارہ بلند　　چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است

(مسافر)

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

(بالِ جبریل)

تباہی خواہ علوم و فنون کا عذاب۔

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

(بالِ جبریل)

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گستم
خدا داند کہ مانندِ براہیمؑ
بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم

(ارمغانِ حجاز)

قوت آموزِ دین کے آداب۔

شاہین (مذکر صورت جرّہ شاہین) اور شاہباز وغیرہ قوی پرندے ہیں اور تذرو (چکور) اور صعوہ (ممولا) وغیرہ کمزور۔ اقبال نے اس قبیل کے پرندوں کے ذکر سے اہم نکتے پیدا کئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ:

اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن
شاہیں سے تذرو کی غلامی

(ضربِ کلیم)

ضربِ کلیم کا ذیل کا شعر طنزیہ ہے اور ارمغانِ حجاز کے فارسی اشعار بیانیہ رنگ رکھتے ہیں:

تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ تذرواں نہیں دینِ شاہبازی

بحکمِ مفتیٔ اعظم کہ فطرتِ ازلی است
بہ دینِ صعوہ حرام است کارِ شہبازی

ہماں فقیہہٴ ازل گفت جرّہ شاہیں را
بآسماں گروی، با زمیں پروازی

غیرت آموز فقر و تصوف۔

ذیل کی دونوں بیتیاں ارمغانِ حجاز میں سے ہیں۔ پہلی (حصۂ اردو والی) میں وہ اپنے طریقِ زندگی کا ذکر کرتے ہیں جس کا ذکر وہ بالِ جبریل میں بھی کر چکے تھے:

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

دوسری دو بیتی میں (حصۂ فارسی والی) وہ فقرِ رومی کے حوالے سے بات سمجھاتے ہیں:

غریبی میں ہوں محسودِ امیری | کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے | مسلماں کو سکھا دی سر بزیری

ز رومی گیر اسرارِ فقیری | کہ آں فقر است محسودِ امیری
حذر از فقر و درویشی کہ از وے | رسیدی بر مقامِ سر بزیری

خودی صیاد اور موت صید و شکار۔

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید | مرگ است صیدے تو در کمینی
(زبور)

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا | ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے
(ضربِ کلیم)

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی | یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
(ضربِ کلیم)

غلاموں کے سجودِ داغدار۔

اقبالؔ نئے اسالیب اور معانی کے ذریعے مسلمانوں کو حالتِ غلامی سے متنفر کرتے رہے۔ جیسے:

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو | مجھ کو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے
(ضربِ کلیم)

جاوید نامہ میں وہ غلاموں کے سجودِ داغدار کا نوحہ کرتے ہیں:

سجدۂ کز وے زمیں لرزیدہ است | بر مرادش مہر و مہ گردیدہ است
سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود | در ہوا آشفتہ گردد ہمچو دُود
ایں زماں جز سر بزیری ہیچ نیست | اندرو جز ضعفِ پیری ہیچ نیست
آں شکوہ ربی الاعلیٰ، کجاست؟ | ایں گناہِ اوست یا تقصیرِ ماست؟

ترجمہ: یہ سجدہ وہ ہے جس سے زمین لرزتی رہی اور مہر و ماہ اس کے مقصد کے مطابق گردش کرتے رہے۔ پتھر پر اس سجدے کا نشان پڑتا تو وہ بھر بھری دھوئیں کی طرح فضا میں پھیل جاتا۔ اس زمانۂ غلامی میں یہ سجدہ ماتحتی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس میں بڑھاپے کی سی کمزوری کے علاوہ کچھ نہیں۔ تسبیح 'سبحان ربی الاعلیٰ' کی شان و شوکت کہاں ہے؟ یہ سجدے اور تسبیح کی خامی ہے یا ہماری کوتاہی؟

بالِ جبریل میں ہے:

خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی مثالِ ماہ چمکتا تھا جن کا داغِ سجود

ارمغانِ حجاز میں یہ نکتہ حضرت ابوذر غفاریؓ اور سلمان فارسیؓ کے آزاد سجود کے حوالے سے مزید واضح کیا گیا ہے:

مسلمانے کہ در بندِ فرنگ است دلش در دستِ او آساں نیناید
زسیمائے کہ سودم بردرِ غیر سجودے بوذرؓ و سلمانؓ نیاید

اس پر حضرت علامہؒ کے مترادف اشعار اور قندِ مکرر کے مصداق مضامین کا یہ ناتمام جائزہ[1] فی الحال تمام کیے دیتے ہیں۔

---

[1] مقامِ عبدیت کی بلندی کے بارے میں ایک مثال کا مزید اضافہ کر دیا جائے۔

گر دراہیم دلے ذوقِ طلب چو برماست بندگی با ہمہ جبروتِ خدائی مفروش (پیامِ مشرق)

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر زنوری سجدہ می خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی (زبور)

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی (بالِ جبریل)

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی، استغفراللہ یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

(بالِ جبریل)

اوپر منقولہ دوسرے شعر میں بندگی، عبادت کا مترادف ہے اور دوسرے شعروں میں عبدیت کا۔ مومن اللہ تعالیٰ کا عابد ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عاشق و محب بھی۔

اصنافِ سخن میں اقبالؒ کی جدتیں

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و میگویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

(اقبال)

علامہ اقبال کی کئی علمی، قومی اور ادبی حیثیتیں ہیں۔ ان کی تقاریر، بیانات، ملفوظات انگریزی یا اُردو کتابیں اور مضامین اور فارسی و اُردو شاعری ہمارے لیے سب کچھ برابر کا اہم ہے۔ علامہ کی ان سب حیثیتوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا، لکھا جا رہا ہے اور ابھی "لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت"

یہ بات مسلمہ ہے کہ اقبال ایک فلسفی شاعر تھے:

زشعرِ دلکشِ اقبال می تواں دریافت　　　کہ درسِ فلسفہ میداد و عاشقی ورزید

شعر برائے شعر سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ خاص مقصد کی خاطر شعر کہتے تھے صنفِ شاعری ان کا آلۂ کار اور اظہارِ جذبات کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ اقبال نے اپنے لیے "شاعرِ مشرق" کا لقب خود بھی استعمال کیا ہے۔ وہ شاعرِ حیات، شاعرِ اسلام اور شاعرِ عمل تو ہیں مگر خالی "شاعر" کہلوانے سے ان کو نفرت تھی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم　　　غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

جز نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم　　　ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینۂ من ریزی؟

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم　　　مثالِ شاعراں افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست — سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بہ آں رازے کہ گفتم پے نبردند — ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم! داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند

نہ شعر است اینکہ بر وے دل نہادم — گرہ از رشتۂ معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق — مسِ ایں مفلساں را تاب دادم

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اس کے مقابلے میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جن میں انہوں نے سخن گسترانہ انداز میں اپنی شاعری کے حسن اور مقام کو بیان اور متعین فرمایا ہے - ان دو بیتوں کو ملاحظہ فرمائیں جو ان کا آخری کلام کہا جاتا ہے :

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

اگر می آید آں دانائے رازے — بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیرِ امتاں را می کند پاک — کلیمے یا حکیمے نے نوازے

"جاوید نامہ" (فلکِ قمر اور مشتری) میں وہ مولانائے رومؒ (وفات ۶۷۲ھ) کی زبانی خود کو یوں متعارف کرواتے ہیں :

مردے اندر جستجو آوارۂ — ثابتے یا فطرتِ سیارۂ
پختہ تر کارش ز خامی ہائے او — من شہیدِ ناتمامی ہائے او

ثبتۂ خود را بگردوں بستہ طاق | فکرش از جبریل می خواہد صداق
چوں عقاب اُفتد بصیدِ ماہ و مہر | گرم رو اندر طوافِ نُہ سپہر
گفت مردی شاعری از خاور است | شاعری یا ساحری از خاور است

ان مختصر سطور میں ہم اس "شاعرِ ساحر" کی بعض شاعرانہ انقلابی جدتوں کا ذکر کریں گے۔ خاص کر علامہ کی وہ انقلابی کوششیں، جو انہوں نے اصنافِ شاعری میں تبدیلی لانے کی خاطر کی ہیں، یہاں مذکور ہوں گی۔ اگر صنائع اور بدائع جدتوں کا ذکر شروع کر دیا جائے تو یہ بات اس مضمون میں نہیں سما سکے گی۔ صرف ایک "صنعتِ سوال و جواب" کو ہی لے لیں۔ اقبال نے ایک ایک مصرع اور شعر میں دو مختلف شخصیتوں کے درمیان گفتگو کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ایجازِ فن کا کمال بلکہ اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ "جاوید نامہ"، "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کے چند اشعار بالترتیب ملاحظہ ہوں:

گفت مرگِ عقل ؟ گفتم ترکِ فکر | گفت مرگِ قلب ؟ گفتم ترکِ ذکر
گفت تن ؟ گفتم کہ زاد از گردِ رہ | گفت جاں ؟ گفتم کہ رمزِ لا الٰہ
گفت آدم ؟ گفتم از اسرارِ اوست | گفت عالم ؟ گفتم او خود روبروست
گفت ایں علم و ہنر ؟ گفتم کہ پوست | گفت حجت چیست ؟ گفتم روئے دوست
گفت دینِ عامیاں ؟ گفتم شنید | گفت دینِ عارفاں ؟ گفتم کہ دید

زندہ رود : فاش تر گو زانکہ فہمم نارساست
غالب : ایں سخن را فاش تر گفتن خطاست
زندہ رود : گفتگوئے اہلِ دل بے حاصل است ؟
غالب : نکتہ را بر لب رسیدن مشکل است

جبریل : ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو ؟
ابلیس : سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

یزداں : کب کھلا تجھ پر یہ راز ؟ انکار سے پہلے کہ بعد ؟
ابلیس : بعد ! اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود

اب اصناف شاعری میں اقبال کی جدّتیں ملاحظہ ہوں "فرد" کا ذکر یوں ہی کر دیا جائے۔ "فرد" ایک ایسا مستقل شعر ہے جو اپنے اندر جہانِ معانی پوشیدہ رکھتا ہو۔ "فرد" میں تبدیلی کیا ہوگی ؟ اقبال نے جو فرد کہے ہیں ان میں سے ہر ایک کے مطلب کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یہ فردیات "پیامِ مشرق" کے "حرزہ"، "زبورِ عجم" (دونوں حصّوں) کے آغاز، "جاوید نامہ" کے "نہ تاسخن از عارف ہندی"، "بالِ جبریل" کے آغاز اور "ارمغانِ حجاز" کے حصۂ اُردو میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ پانچوں حصوں میں سے ایک ایک "فرد" ملاحظہ ہو :

نقدِ شاعر در خورِ بازار نیست ناں بسیمِ نسترن نتواں خرید

شاخِ نہالِ سدرہ ای خار و خسِ چمن مشو منکرِ او اگر شدی، منکرِ خویشتن مشو

ذاتِ حق را نیست ایں عالم حجاب غوطہ را حائل نگردد نقشِ آب

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

خودآگاہی نے سکھلا دی ہے جس کو تن فراموشی
حرام آئی ہے اس مردِ مجاہد پر زرہ پوشی

غزل :

غزل کے اشعار کی تعداد اور اس کے مطالب کی تجدید تو اقبال کے زمانے تک اٹھ چکی تھی مگر اس کی ظاہری ہیئت وہی تھی۔ مقفیٰ اور مصرع مطلع اور پھر دوسرے شعر سے لے کر آخری شعر تک ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیے اور ردیف کی پابندی۔ قافیے

یا بحر تو بہرحال ایک رہتی ہے۔ اقبال کی بیشتر اُردو یا فارسی غزلیں اسی اسلوب میں ہیں مگر انہوں نے بعض قطعہ نما (قطعے کا ذکر آرہا ہے) اشعار کو خود "غزلیات" کے زیرِ عنوان رکھا ہے۔ ایسی پانچ غزلوں کے پہلے اشعار (قطعہ نما) ملاحظہ ہوں:

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمّت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

نہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا؟
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ لبی رہی

گرچہ تو زندانیِ اسباب ہے
قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

ان قطعات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سب واقعی غزلیں ہیں۔ مطلع کا وجود بظاہر اقبال کی نظر میں غزل کے لیے ناگزیر نہ تھا۔ مرزا غالب کے دیوان میں بھی ایسی جدتیں نظر آتی ہیں اور کیا عجب کہ اقبال نے ان ہی کی تقلید کی ہو۔

مندرجہ بالا چند مثالیں "بانگ درا" سے تھیں۔ اقبال کی اُردو شاعری میں غزل کے تجدد کی مثالیں ان کی دوسری تصانیف میں بھی ملتی ہیں۔ "بالِ جبریل" کی پانچویں غزل کا پہلا اور آخری شعر ملاحظہ ہو:

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا　　　کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو　　　یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

سولھویں اور دوسرے حصّے کی غزلِ اوّل کی ہیئت بھی قطعات کی سی ہے اگرچہ وہ غزلیات کے زمرے میں رکھے گئے ہیں "ضربِ کلیم" کے آخر "محرابِ گل افغان کے افکار" کے عنوان سے جو غزلیات مندرج ہیں، ان میں سے صرف چھ غزل کی صورت میں ہیں اور باقی چودہ قطعے ہیں۔ اور اگر سب کو قطعے ہونا تھا تو ان میں غزلوں کا وجود ہے۔ یہی حال ان غزلیات (یا قطعات) کا ہے جو "ارمغانِ حجاز" میں "مُلا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے عنوان سے ملتی ہیں۔

اقبال کی فارسی غزل بھی کچھ کم جدت آمیز نہیں ہے۔ اس میں بھی غزل اور قطعہ ایک دوسرے کی قلمرو میں دخیل نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ مرحوم کے ہم صحبت چودھری محمد حسین مرحوم (وفات ۱۹۵۰ء) کا "زبورِ عجم" پر تبصرہ ہمارا راہنما ہے۔ یہ تبصرہ روزنامہ "انقلاب" لاہور میں ۷ جولائی ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا تھا اور دوسری مرتبہ "ادبی دنیا" لاہور کے "اقبال نمبر" بابت اپریل و مئی ۱۹۷۰ء (صفحہ ۳۳ تا ۴۲) میں شائع ہوا۔ چودھری موصوف نے لکھا تھا:

"اقبال نے انتہائی کوشش کر دکھائی ہے کہ غزل کو پیام کے رتبے کے نزدیک لے جائے۔ یہ کوشش قابلِ ستائش ہے اور مشرقی علم و ادب کی تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی مثال ہے۔ حافظ، سعدی، عرفی، نظیری، عراقی، غالب، صائب وغیرہ آج موجود ہوتے تو جس فن کو انہوں نے شروع کیا تھا اور تمام زندگی اس کے کمالات دکھانے میں صرف کر دی، آج اس کو حدِ کمال کو پہنچا ہوا دیکھ لیتے۔ لیکن شاید جب وہ یہ دیکھتے کہ اقبال غزل کو پیام کی منزل تک لے جانے میں اسے بعض ضروری لوازم سے محروم کر رہا ہے، یعنی کہیں کہیں مطلع نہیں لکھتا اور مقطع کی تو مطلقاً پروا ہی نہیں کرتا، تعدادِ اشعار اس کے نزدیک بے معنی قید

ہے، تو وہ شاید اقبال کی غزل کو کوئی نام ہی نیا دیتے جسے ہم اختراع کرنے سے قاصر ہیں۔"
(ادبی دنیا، حوالۂ بالا، صفحہ ۴۹) لے

یہ غزل کی صوری جدت طرازی کا بیان ہے۔ معنوی جدت کی خاطر وہ خود یوں اشارہ فرما گئے ہیں:

در غزل اقبال احوالِ خودی را فاش گفت
زانکہ ایں نو کافر از آئینِ دیر آگاہ نیست

غزل آں گو کہ فطرت سازِ خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزلخوانی کہ با فطرت ہم آہنگ است؟

قطعہ:

قطعہ دو یا زیادہ اشعار پر مشتمل صنفِ ادبی ہے جس کا مطلع (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) مقفیٰ نہیں ہوتا اور سارے اشعار کا مطلب مربوط اور "ایک واحد" ہوتا ہے۔ بعض شاعروں نے مقفیٰ اشعار میں قطعات کہے ہیں اور غزل والا انداز نہیں اپنایا۔ مثلاً شیخ سعدی شیرازی کا یہ معروف قطعہ ملاحظہ ہو، جو اقوامِ متحدہ کی عمارت پر بھی کندہ ہے

بنی آدم اعضائے یک دیگرند — کہ در آفرینش زیک جوہرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنتِ دیگراں بی غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

مطلب ایک ہے مگر اشعار مستقل ردیف کے حامل ہیں۔ اقبال نے بھی مقفیٰ اشعار کے حامل قطعات لکھے ہیں (دیکھیے "شاعر": بانگِ درا، ص ۱۳۱ / ۵)۔ انہوں نے بعض

لے چوہدری محمد حسین کا یہ مضمون، اُن کے مجموعۂ مضامین "اقبال، چوہدری محمد حسین کی نظر میں" (مرتبہ: محمد حنیف شاہد، ۱۹۷۵ء) میں شامل ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس کے لیے ملاحظہ ہو: ص: ۱۰۶

قطعوں کو از اول تا آخر مقفیٰ اور مردّف لکھا ہے یا ایک دو شعروں کو دوسری ردیف دی ہے۔ "ضربِ کلیم" کا قطعہ "جدت" ملاحظہ ہو (ص ۱۲۲) جس کے پہلے تین شعر مصرّع اور چوتھا مختلف ہے۔ ایک دوسرا قطعہ "رومی" ہے (ص ۱۲۱) جس کے تینوں اشعار مصرّع ہیں:

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک — ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک — کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک — کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

اقبال نے اس سے بھی بڑی جدت دکھائی ہے کہ ان کے کئی قطعے غزل وار ہیں۔ اس کی مثالیں "پیامِ مشرق" کے حصۂ "افکار" اور اردو کی تینوں پختہ تر تالیفوں "بالِ جبریل"، "ضربِ کلیم"، اور "ارمغانِ حجاز" (حصۂ اردو) میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر "بالِ جبریل" کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو جس میں شاعر نے مسعود سعد سلمان لاہوری (وفات ۵۱۵ھ) کے فارسی اشعار کو اردو میں منتقل کر دیا ہے:

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ — دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لیے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسس — جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ — بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

مسعود سعد سلمان کی دو بیتی یوں تھی:

باہمت باز باش و با کبر پلنگ — زیبا بگہِ شکار و پیروز بجنگ
کم کن بر عندلیب و طاؤس درنگ — کانجا ہمہ بانگ آمد وانیجا ہمہ رنگ

جیسا کہ دیکھا گیا ہے، علامہ نے قطعے اور غزل کو ایک دوسرے کی قلمرو میں دخیل کر دیا ہے:

رباعی، ترانہ یا دو بیتی۔

دو بیتی یا ترانہ، رباعی کے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی اُن شعروں کے معانی میں جن کا وزن رباعی سے مختلف ہو۔

رباعی کا وزن بحر ہزج مثمن مزاحف میں ہوتا ہے: جس کے ازاحیف ہیں چوبیس

صورتیں ممکن ہیں، لیکن وزن وہی "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کا ہی رہتا ہے۔ اس وزن کی طرف علامہ اقبال نے توجہ نہیں فرمائی۔

دوبیتی یا ترانہ کا دوسرا معروف وزن بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف ہے۔ (مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل، یا فعولن)۔ بظاہر سب سے پہلے اس وزن میں بابا طاہر عریاں ہمدانی (ان کی وفات پانچویں صدی ہجری کے وسط میں ہوئی ہے) نے دلری لہجے میں یہ ترانے لکھے ہیں جن کو "پہلویات" یا "مہلویات" کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے ان کی پیروی کرنے کا اعتراف کیا ہے اور ان کی ساری دوبیتیاں یا ترانے ("پیام مشرق" "بالِ جبریل" اور "ارمغانِ حجاز" میں) اسی بحر اور وزن میں ہیں۔ یہ دوبیتیاں اپنے مطالب کے اعتبار سے "رباعیاں" کہلانے کی مستحق ہیں اور ایجاز بیان اور شاعرانہ کمال کے معراج کی حامل ہیں۔ انتخاب اگرچہ ذوق پر گراں گزر رہا ہے، پھر بھی تین کتابوں میں سے ایک ایک مثال ملاحظہ ہو:

برون از ورطۂ بود و عدم شو   فزون تر زین جہانِ کیف و کم شو
خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش   چو ابراہیمؑ معمارِ حرم شو

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے   مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے   اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

بہ شب این انجمن آراستم من   چو مہ از گردشِ خود کاستم من
حکایت از تغافل ہائے تو رفت   ولیکن از میاں برخاستم من

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟   خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں   تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے، دوبیتی یا ترانے کی صورت وہی رباعی والی ہوتی

ہے ۔ پہلا بیت مقفّیٰ ہوتا ہے، دوسرے کو مقفّیٰ کرنا اختیاری امر ہے مگر عام طور پر تیسرے مصرع کو معرّیٰ لاتے ہیں ۔ اقبال نے ایسی دو بیتیاں کہی ہیں جن کے دونوں اشعار مقفّیٰ اور مصرّع ہیں ۔ مثلاً

کبھی دریا سے مثلِ موج اُبھر کر　　کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر　　مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

دو بیتی یا ترانہ کا پہلا بیت اگر مقفّیٰ نہ ہو تو وہ قطعہ بن جاتا ہے ۔ اقبال نے یہاں بھی لکیر کا فقیر ہونا گوارا نہ کیا ۔ ایسی دو بیتیاں کہی ہیں جن کا پہلا شعر مقفّیٰ یا مصرّع تو نہیں مگر مطالب کے اعتبار سے ان کو ترانہ یا دو بیتی کہے بغیر چارہ نہیں رہتا ۔ دو نمونے ملاحظہ ہوں :

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے　　تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون ؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی　　فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون ؟

تمیز خار و گل سے آشکارا　　نسیمِ صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے　　اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اقبال نے اپنی دو بیتیوں اور ترانوں کو اپنے خطوط اور مقالات میں بھی رُباعی ہی لکھا ہے ۔

مثنوی سرائی :

مثنوی (مزدوج یا دو گانی) کے ہر شعر کا وزن متحد مگر قافیہ مختلف ہوتا ہے ۔ علامہ نے مثنویاں زیادہ لکھی ہیں ۔ مختلف منظومات کے علاوہ ان کی حسبِ ذیل مثنویاں مولانا روم کی مثنوی شریف کی معروف بحر ـــ (رمل مسدّس محذوف یا مقصور) فاعلاتن فاعلاتن، فاعلات یا فاعلن ـــ میں ہیں: اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، بندگی نامہ، جاوید نامہ، مسافر اور پس چہ باید کرد ۔ صرف ایک مثنوی "گلشن راز" کی تقلید میں بابا طاہر عریاں ہمدانی کی مذکورہ بحر میں لکھی ہے ۔ مگر اقبال نے مثنویوں میں غیر معمولی

تصرّفات اور جدّتیں دکھائی ہیں - یہ تصرّفات اور جدّتیں حسبِ ذیل ہیں: مثنویوں کے آغاز یا بیچ میں اپنے یا دوسروں کے اشعار لاتے ہیں - دوسری بحور کے اشعار پر تضمین کرتے ہیں - کئی مقامات پر اپنی یا دوسروں کی غزلیں نقل فرماتے ہیں - "جاوید نامہ" میں جن دوسرے شعرا کی غزلیں یا اشعار تضمین و ذکر کیے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں: مولانائے روم، بھرتری ہری (فارسی ترجمہ) ناصر خسرو علوی قبادیانی (۴۸۱ھ) قرۃ العین طاہرہ بہاء اللہی (۱۸۵۲ء) اور مرزا غالب (۱۸۶۹ء) - بہرحال یہ اقبال کی بے نظیر جدّتیں ہیں جن کی وجہ سے مثنویاں بہت جالبِ توجہ اور دلچسپ بن گئی ہیں - (دیکھیے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کا آغاز "پس چہ باید کرد" کی تمہید اور "جاوید نامہ" کے بعض مقامات - "مسافر" اور "گلشنِ رازِ جدید" میں بھی غزلیں ہیں) - علامہ کی کوئی ایک مثنوی بھی تضمینوں (مع دوسری بحروں کے استعمال کے) اور غزلوں کے اوزان سے خالی نہیں ہے - ان سے پہلے اور کسی شاعر نے ایسا کیا ہے - ایسی مثالیں شاذ و نادر مولانائے روم، عراقی ہمدانی اور عرفی کے ہاں ملتی ہیں مگر اس حد تک کہ مثنوی میں دوسری بحر و وزن کا شعر یا اشعار (اپنا یا دوسروں کا) منقول ملتے ہیں - اقبال کی طرح مثنویوں میں غزلیات اور دیگر اصنافِ سخن کی بھرپور چاشنی سموتا ہمیں کسی دوسرے کے ہاں نہیں ملتا - "جاوید نامہ" میں ترجیع بند بھی ہے (نغمۂ بعل) اور یہ ایک مزید جدت ہے -

تضمینیں:

مثنوی سرائی میں علامہ کی جدت آمیز تضمینوں کا ذکر کیا گیا - شواہد اور مثالیں اس مقالے کو کتاب بنادیں گی - اس سلسلے میں علامہ کی تضمینوں کی جدت کو بھی دیکھ لیا جائے - کسی شاعر کے کسی مصرع یا شعر کی تضمین عموماً اسی بحر اور اسی قافیے اور ردیف میں کی جاتی ہے - اقبال نے اس کی پابندی کی بھی اور نہیں بھی کی - اُوپر مثنوی کے سلسلے میں ذکر ہو چکا اور اس قسم کی دلچسپ مثالیں "بانگِ درا" کی تضمینوں میں ملتی ہیں - علامہ نے فارسی کے کئی شعرا کے اشعار پر تضمینیں کی ہیں، مثلاً خواجہ حافظ شیرازی (وفات ۷۹۲ھ)، ملک قمی (وفات ۱۰۲۴ھ)، میر رضی دانش (وفات ۱۰۶۵ھ یا ۱۰۷۶ھ)، مثلاً عرشی

اکبر آبادی (وفات ۱۰۹۱ھ)، انیسی شاملو (وفات ۱۰۱۳ھ یا ۱۰۱۴ھ)، عرفی شیرازی (۹۹۹ھ) کلیم کاشانی ہمدانی (۱۰۶۱ھ) اور صائب تبریزی (۱۰۸۷ھ) وغیرہ۔ اقبال نے بعض اوقات تضمینیں کیے جانے والے شاعر کا پہلا مصرع تو اپنی نظم میں پوری طرح سمو دیا ہے، یعنی قافیہ اور ردیف اسی مصرعِ اُولیٰ کے مطابق اختیار کیا ہے مگر دوسرے مصرعوں کو قطعہ یا نظم سے خارج کر دیا ہے۔ عرفی، میر رضی دانش اور ملک قُمّی کے اشعار کی تضمینیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ صدا زربت سے آئی، شکوۂ اہلِ جہاں کم گو
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

۲۔ شعلۂ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا!
شمع خود را می گدازد درمیانِ انجمن
نور ما چوں آتشِ سنگ از نظر پنہاں خوش است

۳۔ لیکن نگاہِ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

تضمینوں کے سلسلے میں اقبال کی یہ جدتیں قابلِ ملاحظہ ہیں۔

ترجیع و ترکیب بند:

ترجیع بند یا ترکیب بند دراصل ایک وزن میں مسلسل غزلیں ہوتی ہیں جن کو ایک مقفیٰ و اصل شعر کے ذریعے مربوط کیا جاتا ہے۔ ایک ترجیع بند یا ترکیب بند میں مربوط مطالب ادا کیا جاتا ہے۔ بیتِ واصل کی اگر بار بار تکرار ہوتی رہے تو یہ ترجیع بند ہُوا اور اس کے تبدیل ہو جانے سے ترکیب بند۔ اقبال کے ہاں نیم ترجیع بند ہیں (مثلاً "جاوید نامہ"، نغمۂ بعل، جس میں ایک مصرع: "ای خدایانِ کہن وقت است وقت" کی تکرار ہے)۔ ترکیب بند اقبال نے کئی ایک لکھے اور بعض ترکیب بند تو اُردو ادب

کا بے نظیر سرمایہ ہیں اور فارسی میں بھی "نقشِ فرنگ" کو کسی برجستہ ترین ترکیب بند کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اُردو ترا کیب بند علامہ کی مشہور منظومات کی صورت میں موجود ہیں: مثلاً شمع اور شاعر، تصویرِ درد، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ اور ذوق و شوق وغیرہ۔

ترکیب بند کئی صورتوں میں ممکن ہے۔ اسی کی ایک صورت "مسدّس" ہے جسے فارسی میں "مربع ترکیب" کہتے ہیں۔ اُردو ادب کا شاہکار شمس العلما مولانا حالی (وفات ۱۹۱۴ء) کی نظم "مدّ و جزرِ اسلام" ہے جسے ہم "مسدّسِ حالی" کہتے ہیں۔ مسدّس ترکیب بند اقبال نے بھی بہت لکھے ہیں: مثلاً "بانگِ درا" کی ابتدائی منظومات، منظوماتِ شکوہ و جوابِ شکوہ ملاحظہ ہوں۔

ترکیب بندوں میں شاعروں نے عموماً ہر بند کے اشعار کی تعداد کو دوسرے بندوں کے ابیات کی تعداد کے برابر رکھا ہے۔ اقبال نے حسنِ ظاہری اور پابندیٔ روش کی خاطر اس کی طرف توجہ دی ہے۔ مثلاً "مسجدِ قرطبہ" کے ۸ بندوں میں سے ہر ایک بند کے اشعار کی تعداد سات سات ہے۔ مرحوم سر راس مسعود (وفات ۱۹۳۷ء) کا جو مرثیہ علامہ نے لکھا (ارمغانِ حجاز) وہ ترکیب بند کی صورت میں ہے اور ہر بند میں چھ شعر ہیں۔ مگر علامہ نے کہیں کہیں جدت بھی دکھائی ہے: مثلاً "تصویرِ درد" کے ۹ بند ہیں اور تعدادِ اشعار ہر بند میں متفاوت ہے۔ کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں، اور علامہ کے ہاں ایسی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔

مسمّط (رنگا رنگ ترکیب بند):

مسمّط (لفظی معانی پرویا اور جڑا ہوا) بھی ایک طرح کے ترکیب بند ہیں جنہیں اُردو میں مثلّث، مربّع یا مخمّس وغیرہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مسمّط کے اعلیٰ ترین نمونے سلطان مسعود غزنوی (وفات ۴۳۱ھ) کے درباری فاضل شاعر منوچہری دامغانی (وفات ۴۳۲ھ) کے دیوان میں ملتے ہیں اور فارسی میں بظاہر وہی اس صنف کا موجد ہے۔ ایک وزن اور مختلف قافیوں کے حامل اشعار مختلف بندوں میں منقسم کر دیے

جاتے ہیں۔ ہر بند کے مصرعوں کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ بند کے آخری مصرع کو ہم قافیہ و ردیف لاتے ہیں۔ مسمّط کی یہی صورت ہے۔ ایک شعر کے بعد ایک مصرع اگر اسی وزن اور مختلف قافیے میں لایا جائے تو مثلثِ شعری بن گیا۔ تین مصرعوں پر چوتھا مصرع یا چار مصرعوں پر پانچواں مصرع اسی طرح لانے سے بالترتیب مربّع یا مخمّس بن جاتے ہیں اقبال نے اس قسم کے ترجیع بند یا ترکیب بند بہت سے لکھے ہیں۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" (بانگِ درا، ص ۸۷) "میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے" کی تکرار سے ترجیع بند کی صورت اختیار کر گیا۔ "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" (بالِ جبریل، ص ۱۳۲-۱۳۳) مخمّس ہے، ضربِ کلیم، کی نظم "علم و عشق" مربّع مسمّط کی مثال ہے اور اردو ادب میں ایسی نظموں کی مثالیں کم ہی ملیں گی:

علم نے مجھ سے کہا، عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا، علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

اس کتاب میں "ابی سینیا کی لاش" اور "پیامِ مشرق" کی نظمیں "نوائے وقت" اور "تنہائی" اس کی اور مثالیں ہیں۔ اقبال کے مسمّط اپنے لب و لہجہ، ترنم آمیزی اور حسنِ لفظ و معنی کے لحاظ سے حکیم قاآنی (وفات ۱۸۵۴ء) کے مسمّطوں کے مشابہ ہیں اور فکری لحاظ سے تو یقیناً بے مثال ہیں۔ "تنہائی" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بیتابے
ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لؤلؤے لالاست در گریبانت
درونِ سینہ چو من گوہرِ دلے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

اگر اس نظم کو مسمّط مان لیا جائے تو تحوّل و تبدیلی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ویسے

اردو اصناف شاعری کے اعتبار سے اسے مستزاد بھی کہا جاتا ہے۔

مستزاد:

فارسی شاعری میں مستزاد کے ابتدائی معلوم نمونے مسعود سعد سلمان لاہوری کے دیوان میں ملتے ہیں۔ مستزاد (لفظی معنی اضافہ شد) کسی بھی صنفِ شاعری میں ممکن ہے اور پھر یہ خود ایک صنف بن جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شعر کے اصلی وزن کے ساتھ ایک اضافی اور کوتاہ وزن بڑھا دیا جاتا ہے۔ یعنی اصلی وزن سے جدا ایک بحرِ مختصر کو وصل کر دیا جاتا ہے اگر اس بحرِ کوتاہ کو ہٹا دیا جائے تو اصل معانی پر اثر نہیں پڑے گا۔ اس لحاظ سے اضافہ شدہ وزن معاونِ مخل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں سید علی مشتاق اصفہانی (وفات ۱۱۷۱ء) کے حسبِ ذیل دو بیت ملاحظہ ہوں:

گیرم کہ بمال و زر کسی قارون شد

مرگ است ز پی

یا اینکہ بہ علم و دانش افلاطون شد

کو حاصل وی؟

اندوختہ ام زکف ہمہ بیرون شد

کو نالۂ نی؟

ز اندیشہ ی کونین دلم پُر خون شد

کو ساغر می؟

جدید فارسی شعرا نے مستزاد کی دوسری ہیئتیں بھی اپنائی ہیں، مثلاً ایک پورے شعر پر ایک مصرع بڑھا دیا گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں فارسی میں آزادی کے عوامی گیت لکھے جانے لگے جن کو "تصنیف" کہتے ہیں۔ یہ مستزاد ہی کی صورتیں تھیں اور اس کی مثالیں مرحوم عارف قزوینی (وفات: ۱۹۳۲ء) یا مرحوم ملک الشعراء محمد تقی بہار مشہدی (وفات: ۱۹۵۱ء) کے دیوان میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اقبال کی یہ انتہائی جدت ہے کہ ان کے ہاں ایسے مستزاد ملتے ہیں جن کو جدید فارسی کی تصانیف یا لوک گیتوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان نظموں کو جب ایرانی اپنے مخصوص لہجے میں پڑھتے ہیں تب ان کا لوک گیت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے پانچ مستزاد "پیامِ مشرق" میں موجود ہیں "ضربِ کلیم"، "زبورِ عجم"

اور "ارمغان حجاز" (حصہ اردو) میں بھی ایسے مستزاد دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے مستزاد، مثلث یا مخمس کی صورت میں ہیں۔ ان کے دو مستزادوں کی نظیر پیش کرنے سے فارسی ادب قاصر ہے۔ یہ دونوں "زبورِ عجم" میں ہیں اور اس طرح آغاز پذیر ہوتے ہیں:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب
انقلاب اے انقلاب

ای غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز
از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

"بانگ درا" کی نظم "انسان" میں اقبال نے ایک مصرع شروع میں لکھا ہے کہ:

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

یہ ایک نادر مستزاد ہے۔ "ضربِ کلیم" کی مستزاد نما ایک غزل میں:
"اپنی خودی پہچان، او غافل افغان" کی ترجیعی تکرار ہے۔ "ارمغانِ حجاز" حصۂ اردو میں ایک نظم کا عنوان "ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" ہے۔ یہاں ان کی اس نظم میں "اے وادیِ لولاب" کی تکرار ہے:

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادیٔ لولاب!

اب "پیامِ مشرق" کے حسبِ ذیل پانچ مستزادوں کا پہلا شعر یا بند ملاحظہ ہو:
فصلِ بہار، سرودِ انجم، کرمکِ شب تاب، حُدی اور شبنم:

(۱)

خیز کہ در کوہ و دشت، خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنّم ہزار طوطی و دراج و سار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گل و لالہ زار
چشم تماشا ببار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

(فصلِ بہار)

(۲)

ہستیِ ما خرامِ ما
مستیِ ما نظامِ ما
زندگیِ دوامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما، مے نگریم و مے رویم

(سرودِ انجم)

(۳)

یک ذرۂ بے مایہ متاعِ نفس اندوخت
شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

(کرمکِ شب تاب)

(۴)

ناقۂ سیارِ من

آہوئے تاتارِ من

درہم و دینارِ من

اندک و بسیارِ من

دولتِ بیدارِ من

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

(حُدی)

(۵)

گفتند فرود آئے ز اوجِ مہ و پرویز

بر خود زن و با بحرِ پُر آشوب بیامیز

با موج در آویز

نقشِ دگر انگیز

تابندہ گہر خیز

(شبنم)

اس قسم کے مترنم اور فکر زا مستزاد لکھنا اقبال کا خاصہ ہے۔ دوسروں کے ہاں ایسی مثالیں تلاش کرنا عبث ہے۔ علامہ کے فارسی مثلث بھی بے نظیر ہیں۔ "زبورِ عجم" کا ایک مثلث اس طرح شروع ہوتا ہے:

مانندِ صبا خیز و وزیدن دگر آموز

دامانِ گل و لالہ کشیدن دگر آموز

اندر دلکِ غنچہ خزیدن دگر آموز

اصنافِ شاعری میں اقبال کی جدتوں کی طرف اشارات کو یہاں ختم کیا جا رہا ہے۔ ان باتوں کے شرح و بسط کے ساتھ بیان کی خاطر کئی صفحے درکار ہیں۔ راقم الحروف

کا مقصد یہ تھا کہ فکرِ اقبال کو بطور شاعرِ مجتہد کے بھی مشاہدہ کیا جائے:

نہ شیخِ شہر، نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبال
فقیرِ راہ نشین است و دل غنی دارد

(فارسی زبان میں اقبال پر لکھا جانے والا قدیم ترین مقالہ)

اقبالؒ اور ان کی فارسی شاعری

سید محمد علی داعی الاسلام

[سید محمد علی داعی الاسلام، نظام کالج حیدر آباد دکن میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ وہ ایرانی نژاد اور فارسی زبان تھے، اور کئی کتابوں مثلاً ۵ جلدی فرہنگ نظام کے مصنف۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں بہ عمر ۷۳ سال دکن میں انتقال فرمایا ہے۔ ان کی باترعب تصویر فرہنگِ نظام جلد ۵ میں دیکھی جا سکتی ہے۔]

۱۹۲۸ء میں (جمعہ ۲۱ شوال ۱۳۴۶ ہجری) انہوں نے انجمنِ 'معارف' دکن کے ایک جلسے میں علامہ اقبال پر ایک مقالہ 'دکتر اقبال و شعر فارسی' کے عنوان سے پڑھا جو ۴۶ صفحے کے ایک کتابچے کی صورت میں چھپا تھا۔ فارسی زبان میں اقبال پر ایک ایرانی کا یہ پہلا مقالہ تھا جس سے اقبال شناس واقف ہیں مگر اب یہ کم یاب بلکہ نایاب ہے اور فراموش شدہ۔ میں نے ایک ذریعے سے اس کتابچے کی عکسی نقل منگوائی اور یہ ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ اس مقالے کی طباعت کے بعد اقبال کوئی دس برس زندہ رہے اور ان کے قلم سے اس دوران تین چار عظیم فارسی کتابیں نکلیں۔ افغانستان اور ایران میں اقبال کی فارسی شاعری کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا گیا، اور پاکستانی فارسی دان بھی لکھتے رہے ہیں، مگر داعی الاسلام مرحوم کے مقالے کی ایک دوسری ہی شان ہے۔ اس کے علاوہ یہ اقبال اور ان کی چار پانچ فارسی کتابوں کا ایک جچا تلا معاصرانہ انتقاد ہے، اور ان کی عظمت کو خراج تحسین۔ ہم لفظی ترجمہ پیش کر رہے ہیں، اور حواشی میں بعض ضروری امور کی توضیح بھی۔

صدرِ مجلس اور محترم حاضرین!

ہماری یہ علمی انجمن جو کہ جامعۂ معارف[1] کا ایک شعبہ ہے، ایرانی اور ہندوستانی فارسی کے درمیان ادبی رابطے کا ایک ذریعہ ہے، اور اس کی کوشش ہے کہ دونوں ملکوں کے قدیم و جدید ادبا کو ایک دوسرے سے متعارف کرے۔ فارسی کا عالمی مرکز تو ایران ہے، لیکن ایشیا کے کئی دیگر ممالک میں بھی فارسی نظم و نثر کے شعراء و ادبا درفشانی کرتے نظر آتے ہیں جن سے مرکز کو باخبر رہنا چاہیئے۔ ہندوستان میں اس وقت کتنے ہی اچھے شاعر ہیں اور اس انجمن کی ذمہ داری ہے کہ انہیں پہچانوائے۔ ان شعراء میں ایک معاصر عظیم فلسفی ڈاکٹر محمد اقبال ہیں ہیں جنہوں نے اپنے اردو اشعار سے اپنے ہم وطنوں کی گوش نوازی ہی نہ کی، بلکہ اپنے شیریں فارسی نغموں سے بھی پورے ایشیا رستاخیز برپا کر رکھی ہے۔ ڈاکٹر اقبال ایک چوتھائی صدی تک اردو کے عظیم اور بے نظیر شاعر رہے انہوں نے اردو شاعری میں تجدد پیدا کیا، اور جدید فلسفے تیز وطن و ملت کی محبت کے جدید مضامین سے اس زبان کو آشنا کیا۔ مگر انہوں نے جلد ہی دیکھ لیا کہ ان کے وسیع و بلند افکار کی ادائیگی کے لئے اردو کا دامن تنگ ہے۔ ایسے افکار کی خاطر فارسی ہی مناسب تھی جو ایشیا کی عمومی اور دنیا کی قدیمی علمی زبان ہے۔ یہ زبان ان کے تصورات کا خزینہ بن سکنے کی اہل تھی۔ اسی لئے کئی سال سے اقبال اپنے افکار عالیہ کو فارسی میں ادا کرتے ہیں، اور اس طرح وہ بھی طوطی شکر شکن[2] یا بلبل شیراز[3] کہے جا سکتے ہیں۔

اقبال ایک عام شاعر نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو فرضی شاعر بنا کر گل و بلبل، شمع و پروانہ یا قمری و سرو کے فصیح و بلیغ تلازمے باندھیں اور سننے والوں کو محظوظ کریں۔ وہ ایک نصب العین والے قائد و راہنما ہیں۔ اقبال کی بلبل، فلکِ مریخ کے شاہین کو شکار کر لیتی ہے۔ ان کے پھول کی خوشبو ناہید (زہرہ) ستارے تک جا پہنچتی ہے۔ ان کی شمع سے دنیا کی

---

[1] جامعہ معارف تہران (یعنی انجمن معارف تہران) کا ایک شعبہ۔ اس کے کام تقریباً موجودہ خانہ ہائے فرہنگ ایران ایسے تھے۔ (مترجم)

[2]،[3] یعنی امیر خسرو اور سعدی یا حافظ کے مثیل (مترجم)

بزمِ تمدّن منوّر ہو رہی ہے اور ان کی قمری، سروِ بوستان پر بیٹھنے کی جگہ شاخِ طوبیٰ پر آ نکلتی ہے اور معرفتِ حقیقی کے نغمے الاپتی ہے۔ اقبالؔ چاہتے ہیں کہ نسلِ انسانی کی حالت بہتر ہو اور وہ آگے بڑھے۔ مادّی ترقیات کے ساتھ انسان روحانی تجلیات سے بھی لو لگائے رہیں۔ اقبالؔ کی آرزو ہے کہ روئے زمین پر منتشر و پراگندہ مسلمان متحد و متفق ہو کر ملّتِ واحد بنیں، اور مادّی و معنوی علوم و فنون میں دوسری اقوام کے لئے قابلِ رشک ہوں۔ اقبالؔ کی نظر تمام مسلمانوں پر ہے مگر ان کے مخاطبِ اوّل علماء اور پڑھے لکھے لوگ ہیں کیونکہ یہ لوگ قائد اور راہنما کا حکم رکھتے ہیں۔ اقبالؔ علمی زبان میں بات کرتے ہیں تاکہ نامحرم لوگ ان کے اسرار نہ سمجھیں اور کج فہم الٹے مطلب نہ نکالیں۔ مثنوی اسرارِ خودی میں آپ نے خود کہا ہے

نکتہ ہا چون تیغِ فولاد است تیز　　گر نمی فہمی ز پیشش ما گریز[1]

اقبالؔ نے عصرِ جدید میں بہترین علم و تربیت سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی نظر قدیم اور جدید دونوں علوم پر مرتکز ہے۔ انھوں نے گنجِ دانش اور دُرِ شاہوار حاصل کئے اور انہیں شاعری کے بازارِ عام میں آرکھا ہے تاکہ ان کی قیمت سے مغزِ بیدار اور دلِ دردمند لئے جاسکیں۔ اقبالؔ کے ہاں تازہ افکار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قائدین کو ان افکار سے مستفیض کریں۔ زبورِ عجم کی دعائیں آپ نے فرمایا ہے:

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ　　در بادہ نشّہ را نگرم، آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگران نزیست　　یک آہ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ
سلیم مرا بجوی تنک مایہ مپیچ　　جولانگہی بہ وادی و کوہ و کمر بدہ

---

[1] شعر دراصل رومی کا ہے جسے اقبالؔ نے تضمین کیا ہے۔ بالِ جبریل میں انھوں نے اس مضمون کو یوں اپنے حسبِ حال بنایا ہے۔

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ　　کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

سازی اگر حریف یم بیکراں مرا   با اضطراب موج، سکون گہر بدہ
شاہین من بصید پلنگان گذاشتی   ہمت بلند و چنگل ازین تیز تر بدہ
رفتم کہ طائران حرم را کنم شکار   تیری کہ نافگندہ فتد کارگر، بدہ
خاکم بہ نور نغمۂ داؤدؑ بر فروز   ہر ذرۂ مرا پر و بال شرر بدہ

ہند کے اساتذہ شعراء کا ایک خاص رنگ ہے لیکن اقبالؔ کا اسلوب شعر بیشتر میرزا اسد اللہ غالبؔ کے کلام سے ہم آہنگ ہے۔ غالبؔ مرحوم (د ۱۸۶۹ء) کوئی نصف صدی پہلے زندہ تھے اور اردو و فارسی شاعری کے مسلمہ استاد تھے۔ بہرحال ہم آج یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کے بعد شمع شاعری، اقبالؔ کے دم سے روشن ہوئی ہے۔ ایک قدیم مثنوی سرا[1] نے اساتذہ شعراء کی جانشینی کے بارے میں کافی کچھ کہا تھا۔ اس مثنوی کا آخری شعر یوں تھا:

زخسروؔ چو نوبت بہ جامی رسید   بہ جامیؔ سخن را تمامی رسید

میرزا غالبؔ مرحوم نے اس پر ذیل کے شعر کا اضافہ کیا تھا:

زجامیؔ بہ عرفیؔ و طالبؔ رسید   زعرفیؔ و طالبؔ بہ غالبؔ رسید

اب ہم اقبال کی موجودگی میں ذیل کے دو مزید شعروں کا اضافہ کر سکتے ہیں ؎

چو غالبؔ زہندستان رخت بست   بجای وی، اقبالؔ دانا نشست
یقین دان، سخن دانی باستان   بماند بہ ہندوستان جاودان

حیاتِ اقبال۔

اقبالؔ ابھی زندہ ہیں اور کوئی ۵۳ برس کے ہیں، اس لئے ابھی کسی نے ان کے مفصل حالاتِ زندگی نہیں لکھے۔ ان کے علم و دانش کے شیدائیوں سے اتنا ہی معلوم ہوا[2] کہ وہ ۱۸۷۵ء[3] میں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کشمیری الاصل

---

[1] یعنی ناظم ہروی (مترجم)

[2] دیکھیں 'اقبال' (اردو) از مولوی احمد دین، اور کلیاتِ اقبالؔ مطبوعہ دکن (۱۹۲۳ء) کا دیباچہ

[3] مسلمہ تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے (مترجم)

اور وہاں کی غالب اکثریت کی مانند درویشی و تصوف کے دلدادہ ہیں۔ اقبال نے بھی عرفان و تصوف کے دامن میں پرورش پائی ہے۔ انہوں نے مادی و معاشی نوعیت کے اعلیٰ علوم بھی حاصل کئے۔ مگر جیسا کہ ان کے عرفان و معرفت کے حامل اشعار حاکی ہیں، انہیں حقیقی درویشی و تصوف پر فخر ہے۔ موصوف نے ابتدائی تعلیم کے بعد اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا اور ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کی خاطر آپ لاہور آ گئے اور وہاں کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے آپ نے یہیں سے کیا۔ آپ کا خاص مضمون فلسفہ تھا اور اسی موضوع پر آپ نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی ہے۔ وہاں آپ نے فلسفۂ اخلاق، قانون اور فلسفے کی اعلیٰ ترین اسناد بھی حاصل کی ہیں۔ فلسفۂ اخلاق آپ نے انگلستان میں پڑھا، اور خالص فلسفہ جرمنی میں جہاں آپ نے "ایران میں مابعد الطبیعات کے ارتقا" پر تخصص حاصل کیا ہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال پنجاب لوٹ آئے اور اپنے ہم وطن و ہم دین افراد کی خدمت میں مشغول ہیں۔

اقبال کی اردو شاعری۔

اقبال نے یورپ جانے سے قبل، اسی طرح یورپ میں بھی اور وہاں سے مراجعت کے بعد اردو میں کافی شعر کہے اور اس طرح حالی و اکبر الہ آبادی کی مانند اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کی قابلِ قدر خدمت انجام دی۔ (ان کے وطن پرستانہ اشعار معروف ہیں) یورپ کے سفر کے بعد بھی آپ ایسے اشعار کہتے رہے، مگر کچھ عرصہ بعد فلسفہ و تصوف کی قوتی نے ان کی عنانِ فکر دوسری طرف موڑ دی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ایک مسلمان کا وطن ہندوستان ہی نہیں، بلکہ پورے عالم سے اس کا ایسا ہی رابطہ ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس کی ملت ہیں۔ بہر حال، اردو اشعار کے ذریعے انہوں نے اپنے افکار کی تشہیر شروع کی تھی، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ نائے اردو کی صدا ایک بزم سے آگے نہیں بڑھتی، تو انہوں نے صورِ صدا کے لئے فارسی زبان کو اپنایا تاکہ ان کی آواز پورے عالم میں سنائی دے اور مردہ دل اس سے زندگی حاصل کریں۔ مثنوی

اسرارِ خودی کی تمہید میں آپ نے کہا ہے:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است | طرزِ گفتارِ دری شیرین تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت | خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام | در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

اقبال کی وطنی شاعری کا ایران کے عارف اور بہار[ہ] کی وطنی شاعری سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر اقبال ایران میں ہوتے اور ایران کی ملی ضروریات کے پیشِ نظر وطن پرستانہ اشعار کہتے، تو بہت بڑے استاد بن جاتے۔ بلکہ میں یہ عرض کروں گا کہ جس قدر میں اقبال کے وطنی اردو اشعار سے متاثر ہوا ہوں، ایرانی فارسی شعراء نے مجھے اس قدر ہرگز متاثر نہیں کیا۔ خیر، اس دور کے بعد اقبال 'بلبلِ ایران' بن گئے اور ایک سے ایک بہتر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔

مثنوی 'اسرارِ خودی'۔

اقبال کی پہلی فارسی کتاب 'اسرارِ خودی' ہے جو مثنوی رومی کی پیروی میں اور اسی کی بحر میں ہے (بحر رمل مزاحف —— فاعلاتن' فاعلاتن فاعلات/ فاعلن)۔ اس مثنوی کے مضامین بھی مثنوی معنوی کے مضامین کی طرح فلسفہ و تصوف سے مربوط ہیں۔ البتہ ایک واضح فرق ہے۔ رومی اپنے زمانے کے صوفی اور فلسفی تھے جبکہ اقبال اپنے زمانے کا فلسفی اور عارف ہے۔ رومی آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں نے خود خواہی اور عیش و عشرت کی دلدادگی سے تکالیف اٹھائی ہیں اور چنگیز خانی افواج اس وقت بھی ان کی آبادیوں کو تہس نہس کر رہی تھیں۔ اسی لئے رومی 'خودی' کے ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور مثنوی معنوی میں بیخودی اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ یہ دولت و سلطنت سے محروم مسلمان 'خود پرست' نہ بنتے رہیں، بلکہ اپنی خودی و شخصیت کو انائے مطلق میں فنا کر کے زندۂ جاوید بن جائیں۔

ہ یعنی عارف قزوینی م ۱۹۳۳ء اور ملک الشعراء محمد تقی بہار مشہدی م ۱۹۵۱ء

اقبال کے زمانے میں مسلمان سست اور کاہل ہو گئے اور کوشش و کار سے ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ اسی لئے وہ قافلۂ انسانی کی ترقی کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ جوہر انسانی اور خودی کو بھول بیٹھے اور تمدنی ترقی سے مایوس ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ان کی ۲۵ مستقل سلطنتوں میں سے صرف ۳ باقی رہ گئیں، اور وہ بھی دلِ عاشق کی طرح لرزاں اور متزلزل ہیں۔ آج مسلمانوں کی کوئی ۴۰ کروڑ آبادی میں سے صرف ساڑھے پانچ کروڑ افراد آزادی میں سانس لے رہے ہیں۔ باقی غیر مسلموں کے ماتحت اور ان کے غلام ہیں۔ ان حالات میں اقبال ایسا اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ مسلمان، ایک دوسرے تصوف کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ خودی کے اسرار بیان کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ مادی اور معنوی ترقیات کا سرچشمہ "خودی" ہے۔ رومی نے کہا تھا:

عقل جزوی عشق را منکر بود[۱] — گرچہ بنماید کہ صاحب سرّ بود
زیرک و داناست اما نیست نیست — تا فرشتہ، لا نشد اہریمنی است

اقبال کہتا ہے:

چون حیاتِ عالم از زورِ خودی است — پس بقدرِ استواری زندگی است
قطرہ چون حرفِ خودی از بر کند — ہستی بی مایہ را گوہر کند
بادہ از ضعفِ خودی بی پیکر است — پیکرش منت پذیرِ ساغر است

نکتہ یہ ہے کہ اسلامی تصوف کے تقریباً ۱۲ سو سال گزر گئے اور تصوف کے دلدادہ فارسی شعرا، بیخودی و فنا کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ اب تصوف کے دلدادہ ڈاکٹر

---

[۱] مجھے مقرر کی اس بات سے اتفاق نہیں کہ رومی، خودی کے منکر اور بیخودی و فنا کے مؤید ہیں۔ دراصل ان کی بیخودی، خود شناسی کا مرحلۂ اول ہے چنانچہ اقبال نے رموزِ بیخودی کے آغاز میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے:

جہد کن در بیخودی، خود را بیاب — زود تر واللہ اعلم بالصواب

اس کے علاوہ عشق کی حمایت اور عقل کی مخالفت میں اقبال بھی رومی کے ہمنوا ہیں۔ (مترجم)

اقبال کے فلسفہ خودی سے ملول کیوں نہ ہوں؟ وہ سنائی، عطار، رومی اور حافظ وغیرہ کے سے اولیائے گذشتہ کی توہین" سے دل تنگ ہوں گے۔ بے شک مثنوی اسرار خودی کی اشاعت کے بعد ایک گروہ نے ہنگامہ سا برپا کر دیا اور اس کے نتیجے میں اقبال نے مجبور ہو کر بعد کی اشاعت میں وہ اشعار حذف کر دئیے جو بالصراحت حافظ کے خلاف لکھے تھے۔ لیکن میرے خیال میں اگر اقبال نے غلطی بھی کی، تو ایک قابل توجیہہ غلطی ہے کیونکہ بیخودی اور فنا کی تعلیم نے مسلمانوں کو گمراہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے کوشش و کار ترک کر دئے، معاشی و مادی ترقی سے روگرداں ہو گئے اور ترکِ دنیا کر کے ذلیل وخوار ہو گئے۔ بیخودی کی تعلیم نے، ازلی تقدیر کے تصور کی طرح، مسلمانوں کو دلیر و سخت کوش بنانے کے بجائے بزدل اور کاہل بنا دیا اور وہ ہر برائی اور مصیبت کو تقدیر کے ساتھ منسوب کرتے رہے ہیں۔ ترکِ دنیا کے عمل سے انہوں نے دنیا کا سب کچھ مخالفین کے حوالے کر دیا۔ تقدیر اور بیخودی کے تصورات بجائے خود صحیح ہیں لیکن ان کے غلط مفہوم لے لئے گئے تھے، اور ان کی اصلاح ضروری تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے یہی کام کیا ہے۔ ان کے نزدیک بیخودی ایک موہوم چیز ہے اور خودی حق ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک لفظی نزاع ہے کیونکہ خودی کی ترقی و وسعت سے بھی ایک بیخودی ہاتھ لگتی ہے۔ 'خودی' کا دانہ اگر استعمال میں آئے تو 'بیخودی' کا تناور درخت کیسے وجود میں آئے گا؟ بہرحال 'خودی' کے ابتدائی مراحل میں 'بیخودی' کی طرف توجہ رکھی جاتی ہے۔ فلسفہ و تصوف والے حضرات بھی انسانی جوہر کو قابلِ ارتقا جان کر، 'خودی' کی ترقی کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

حافظ نے کہا ہے۔

سالہا دل، طلب جام جم از ما میکرد   آنچہ خود داشت، ز بیگانہ تمنا می کرد

مثنوی 'اسرار خودی' کا موضوع۔

۸۲۵ اشعار کی حامل یہ کتاب 'خودی' کے موضوع پر ہے۔ شاعر نے 'خودی' کی اہمیت ذہن نشین کرنے کی خاطر قاطع کرنے والے دلائل دئے اور قلبی احساسات کے اظہار کے ساتھ بتایا کہ انسان کی شخصیت کو ہمہ گیر ترقی کرنے والا ہونا چاہیے تاکہ وہ ...

صفاتِ اعلیٰ کو جذب کرے اور خلیفہ ٔ خدا بننے کا سزاوار ہو۔ انسان کو عشق و محبت کی صفات اپنانا چاہیئے تاکہ مادّی موانع اس کے سدِ راہ نہ ہوں اور عشق اسے سعی و عمل کے لئے آمادہ ترکرتا رہے۔ سوال (مانگنے) اور گداگری سے سلوکِ خودی میں احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ دریوزہ گری، بے کاری کی علامت ہے جبکہ 'خودی' اس کی نقیض ہے۔ اور سخت کوشی اُس کا لازمہ ہے۔ اقبال نے تربیتِ 'خودی' کے تین مراحل قرار دئے ہیں: اطاعت (ادائے فرائض)، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ نظامِ عالم میں 'خودی' کے لازمی وجود کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
صد جہان پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
میکشد از قوتِ بازوی خویش — تا شود آگاہ از نیروی خویش
عذرِ این اسراف و این سنگین دلی — خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی ست
حسنِ شیرین، عذرِ دردِ کوہکن — نافہ، عذرِ صد آہوی ختن
چون خودی آرد بہم نیروی زیست — می گشاید قلزمی از جوی زیست

مقاصد آفرینی سے 'خودی' کو زندگی ملتی ہے۔ اس عنوان کے تحت شاعر کہتا ہے:

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در جستجو پوشیدہ است
آرزو ہنگامہ آرای خودی — موجِ بی تابی ز دریای خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند — دفترِ افعال را شیرازہ بند
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

شاعر کے بقول، عشق و محبت کے عنصر سے 'خودی' کو استحکام ملتا ہے:

نقطہ نوری کہ نامِ او خودی است — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پایندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
فطرتِ او آتش اندوزد ز عشق — عالم افروزی بیاموزد ز عشق
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست

لشکر ملی پیدا کن از سلطانِ عشق | جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق
تا خدای کعبہ | شرح 'انی جاعل' سازد ترا[۱]

اور یہ ہے احسان پذیری اور گداگری سے خودی کا حالِ زار :

ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر | داغ بر دل دارد از احسانِ مہر
وای بر منت پذیرِ خوانِ غیر | با لپشیزی مایۂ غیرت فروخت

'خودی' کو حقیقی عشق و محبت نصیب ہو تو قوائے عالم اس کے مسخر ہو جاتے ہیں

از محبت چون خودی محکم شود | قوتش فرمانده عالم شود
در خصوماتِ جہان گردد حَکَم | تابعِ فرمانِ او دارا و جَم
پنجۂ او پنجۂ حق می شود | ماہ از انگشتِ او شق می شود

شاعر نے حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیاتِ اسلامی کے بیان میں زورِ قلم صرف کیا۔ ضمناً اس نے ان شعرا و ادبا کی مذمت بھی کی ہے جو منفی بیخودی اور فنائے شخصیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ؎

وای قومی کز اجل گیرد برات | شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات
نغمہ ہایش از دلت دزدد ثبات | مرگ را از سحرِ او دانی حیات
در یم اندیشۂ انداز دتُرا[۳] | از عمل بیگانہ می سازد ترا
خواب را خوشتر ز بیداری شمرد | آتش ما از نفسہایش فسرد
از خم و مینا و جامش الحذر | از می آئینۂ فامش الحذر

اب تربیتِ خودی کے سہ گانہ مراحل دیکھیں۔ مرحلۂ اول 'اطاعت' ہے :

---

۱ آیۂ مبارکہ ۳۰ : ۲ ۔
۲ اصل ردیف 'تورا' لکھی گئی ہے اور یہ تصرف کئی دوسرے اشعار میں بھی نظر آتا ہے۔ (مترجم)

۳ ایضاً 'تورا' ۔

: خدمت و محنت، شعارِ اشتر است | صبر و استقلال کارِ اشتر است
مست زیرِ بار محمل می رود | پای کوبان سوی منزل می رود
تو هم از بارِ فرائض سر متاب | بر خوری از 'عنده حسن المآب'

مرحلۂ دوم، ضبطِ نفس ہے:

نفس تو مثلِ شتر خود پرور است | خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمام او بکف | تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش روان | می شود فرمان پذیر از دیگران
اہلِ قوت شو ز وردِ 'یا قوی' | تا سوار اشتر خاکی شوی

ان مراحل کے طے کر لینے سے 'نیابتِ الٰہی' کا مقام ہاتھ آتا ہے۔ ؎

گر شتر بانی، جہان بانی کنی | زیبِ سر تاجِ سلیمانی کنی
تا جہان باشد جہان آرا شوی | تاجدار ملک 'لا یبلیٰ' شوی
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است | ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است
ای سوار اشہبِ دوران بیا | ای فروغِ دیدۂ امکان بیا
شورشِ اقوام را خاموش کن | نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ | جام صہبای محبت باز دہ

'اسرارِ خودی' کی ترتیب۔

اس کتاب کی ترتیب اور ادائے مطالب کا انداز، مثنوی معنوی کا سا ہے۔ مختلف مطالب کو حکایات اور قصص کی مدد سے ادا کیا گیا، اور خاص ابواب نہیں قائم کئے گئے ہیں۔ اس اسلوب کا مخترع حکیم سنائی ہے جس نے حدیقہ اور دوسری مثنویوں میں اس طرح کے موضوعات کا حق ادا کیا۔ اس کے بعد عطار، رومی اور جامی وغیرہ نے بھی یہی اسلوب اختیار کیا، اور آج تک ایرانی شعراء اپنے قلبی واردات کو صنفِ مثنوی میں اسی اسلوب سے ادا کرتے ہیں۔ متاخر مثنوی گو شعراء میں ملا احمد نراقی مصنف "تقدیس" (تیرہویں صدی کے اوائل کا شاعر) اور عمان اصفہانی مصنف گنجینۂ اسرار نیز

صفی علی شاہ مصنف زبدۃ الاسرار اور بحر الحقائق (دونوں چودھویں صدی ہجری کے اوائل کے شاعر) اس اسلوب کے لئے معروف ہیں[1]۔

اسلوب شعر۔

'اسرار خودی' کا اسلوب وہی ہے جسے ہم ایرانی 'سبک ہندی' کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلوب برصغیر کے ساتھ مخصوص نہیں۔ عصر متوسط کے تیموری اور صفوی عہد کے شعرائے ہند و ایران نے دونوں ملکوں میں اسی اسلوب کو اختیار کئے رکھا۔ ایران میں عصر متاخرین کے دوران تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل سے یہ اسلوب متروک ہوگیا، مگر ہندوستان میں اب بھی باقی ہے۔ اسی لئے اقبال کی مثنوی گوئی کے اسلوب کو ان کے ایرانی معاصرین جیسے صفی علی شاہ یا عمان اصفہانی کے اسلوب کے ساتھ نہیں جانچنا چاہیئے۔ ان کی مثنوی کا اسلوب عرفی، نظیری، ظہوری اور بیدل کی مثنویوں کا سا ہے۔ میں اس سے قبل چونکہ ایک خطابے میں متقدم، متوسط دور کے اور متاخر شعراء کے اسلوب کے بارے میں مفصل بیان کر چکا ہوں، اس لئے تکرار مطالب

---

[1] تقدیس بالسان الغیب ۱۳۱۶ ہجری میں تہران میں چھپی۔ خطابے کے متن میں 'طاقدیس' شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا موضوع دینی حکایات ہیں۔ آغاز ہے:

بشنوید ای دوستان این داستان کہ بمعنی شرح حال ماست آن

میرزا عمان ساسانی کی گنجینۃ الاسرار تہران میں ۱۳۴۲ ہجری میں شائع ہوئی۔ اس میں بھی دینی مطالب اور آئمہ کے مناقب ہیں۔ اس میں چند قصیدے، غزلیں بھی ہیں۔ آخری غزل کا مقطع ہے۔

من کیستم؟ عمان دریای سخن را موج زن گر گواہی خواہی اینک طبع گوہرزای من

بحر الحقائق اور زبدۃ الاسرار (در عرفان الحق) از حاج میرزا حسن صفی علی شاہ بالترتیب ۱۳۱۶ء اور ۱۳۴۲ ہجری میں شائع ہوئیں (تہران)۔ پہلی میں الف تا یا عرفانی اصطلاحات کی منظوم شرح ہے اور دوسری میں دینی مطالب ہیں۔ ان معمولی مثنویوں کو علامہ اقبال کی بے نظیر مثنوی 'اسرار خودی' سے کیا نسبت ہو سکتی ہے! (مترجم)

سے ملالِ خاطر کا سبب نہیں بننا چاہتا۔ لیکن یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ ایران کے معاصر مثنوی گو شعرا، عطار اور رومی کی تقلید میں واضح قسم کے شعر کہتے ہیں۔ ان کی توجہ شعر کے قالب اور فصاحتِ بیان پر ہے جبکہ متوسط دَور کے شعرا کی توجہ بلاغت پر مبنی اور علما و فضلا کی خاطر شعر کہتے تھے تاکہ وہ اپنے علم و دانش کی مدد سے شاعر کا مدعا سمجھنے کی کوشش کریں۔ اقبال نے بھی مثنوی علما کی خاطر لکھی ہے، اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ صاحبانِ علم نے اس کی قدر کی ہے۔ آج وہ ہندوستان کے صاحبِ فکر و نظر افراد کی نظر میں ایک مجددِ ادب نابغہ ہے۔ اگر اس نے بھی صفی علی شاہ وغیرہ کی طرح آسان انداز میں وارداتِ قلبی بیان کئے ہوتے، تو عوام اور خشک زاہدوں نے اسے کافر و ملحد بنا دیا ہوتا۔ اس ضمن میں میں ایک حکایت لکھ دوں:

بادشاہ اکبر کے زمانے میں گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں ایران میں دو ایسے نامور فلسفی تھے جن کی تصانیف پر آج ہم افتخار کرتے ہیں۔ میر باقر داماد اور ملا صدرالدین شیرازی۔ صدرالدین، باقر داماد کے شاگرد تھے مگر انہوں نے فلسفہ دانی میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی۔ بات یہ ہے کہ میر باقر داماد کی تصانیف مغلق اور عسیر الفہم ہیں جنہیں [illegible] علما ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ملا صدرالدین کی کتب واضح، آسان اور قریب الفہم ہیں مگر ہم عصر نام نہاد علما و فقہا نے ان کی تکفیر کر ڈالی جبکہ میر باقر داماد مقدس و محترم زمرے میں ہی شامل رہے ہیں۔ ایک دن ملا صدرا نے اپنے استاد سے کہا: "نامعلوم علما و فقہا نے میری تکفیر کیوں کی، حالانکہ میں نے سب کچھ آپ سے سیکھ رکھا اور میرے اور آپ کے فلسفے کی اساس بھی ایک ہی ہے؟" استاد نے جواب دیا: "میری کتابوں کے مطالب کو صرف متبحر علما سمجھتے ہیں مگر تمہاری کتب اس قدر آسان اور واضح ہیں کہ نامحرم ان کے اسرار سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔"

بہرحال، متقدم اور متوسط دَور کے شعرا کے اسلوب کا فرق ظاہر کرنے کے لئے ہم ایک حکایت مثنوی رومی سے نقل کرتے ہیں اور دوسری اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی سے۔ رومی نے بات واضح، آشکار اور سادے انداز میں کہی ہے جبکہ اقبال تشبیہات اور استعارات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ رومی نے بھی گاہ گاہ تشبیہ و استعارات سے کام لیا، مگر

اس سے مطلب سمجھنے میں دشواری پیدا نہیں ہوئی ہے۔

رفتن عاشق نزد معشوق و گفتن خدمتہائش (مثنوی رومی)

آن یکی عاشق به پیش یار خود [۱] — می شمرد از خدمت و از کار خود

کز برای تو چنین کردم چنان — تیرها خوردم در این رزم و سنان

مال رفت و زور رفت و نام رفت — بر من از مشقت بی ناکام رفت

هیچ صبحم خفته یا خندان نیافت — هیچ شامم با سر و سامان نیافت

هر چه او نوشیده بود از تلخ و درد — در حضور او یکایک می شمرد

نه از برای منتی بل می نمود — بر درستی محبت صد شهود

عاقلان را یک اشارت بس بود — عاشقان را تشنگی ز آن کی رود

صد سخن می گفت ز آن درد کهن — در شکایت که نگفتم یک سخن

آتشی بودش نمی دانست چیست — لیک چون شمع از تف آن می گریست

بعد گریه گفت اینها رفت، لیک — این زمان ارشاد کن تو یار نیک

هر چه فرمائی بجان استاده ام — بر خط تو پا و سر بنهاده ام

گر در آتش رفت باید چون خلیل [۲] — ور چو یحیی [۳] میکنی خونم سبیل

ور چو یوسف [۴]، چاه و زندانم کنی — ور ز فقرم، عیسی [۵] مریم کنی

رخ نه گردانم نگردم از تو من — بهر فرمان تو دارم جان و تن

گفت معشوق این همه کردی ولیک — گوش بگشا و اندر یاب نیک

کانچه اصل، اصل عشق است و ثبات — آن نکردی، این چه کردی فرعهاست

گفت آن عاشق بگو آن اصل چیست — گفت اصلش مردن است و نیستی است

این همه کردی نه مردی زنده ای — هان بمیر ار یار جان بازنده ای

گر بمیری، زندگی یابی تمام — نام نیکوی تو ماند تا قیام

لہ دیکھیں دفتر پنجم شعر ۱۲۴۲ بہ بعد، طبع نکلسن کی رو سے (مترجم)

نوجوانی از مرو پیش علی ہجویریؒ در لاہور آمد (اسرار خودی)

سید ہجویر، مخدوم امم — مرقد او پیر سنجر[1] را حرم
بند ہای کوہسار آسان گسیخت — در زمین ہند، تخم سجدہ ریخت
عہدِ فاروقؓ از جمالش تازہ شد — حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت — صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت
داستانی از کمالش سر کنم — گلشنی در غنچہ، مضمر کنم
نوجوانی تامتش بالا چو سرو — وارد لاہور شد از شہر مرو
رفت پیشِ سید والا جناب — تا رباید ظلمتش را آفتاب
گفت محصور صف اعدا استم — در میانِ سنگہا مینا استم
با من آموز ای شہ گردون مکان — زندگی کردن میان دشمنان
پیر دانائی کہ در ذاتش جمال — بست پیمانِ محبت با جلال
گفت ای نامحرم از رازِ حیات — غافل از انجام و آغازِ حیات
فارغ از اندیشۂ اغیار شو — قوتِ خوابیدہ ای، بیدار شو
سنگ چون بر خود گمانِ شیشہ کرد — شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد
تا کجا خود را شماری ما و طین؟ — از گلِ خود، شعلۂ طور آفرین
ہر کہ دانای مقامات خودی است — فضلِ حق داند، اگر دشمن قوی است
سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است — سیل را پست و بلند جادہ کیست؟
سنگ رہ گردد فسانِ تیغِ عزم — قطعِ منزل، امتحانِ تیغ عزم
مثلِ حیوان، خوردن آسودن چہ سود؟ — گر بخود محکم نۂ، بودن چہ سود؟
خویش را چون از خودی محکم کنی — تو اگر خواہی، جہان برہم کنی[2]

---

[1] سنجر دراصل سجز (سیستان) ہے۔ (مترجم)

[2] اقبالؒ کی مشکل گوئی کی معترضہ نے کئی جگہ شکایت کی، مگر کیا اقبالؒ کے موضوعات اس سے آسان زبان میں ادا ہو سکتے تھے؟ (مترجم)

مثنوی اسرارِ خودی کی زبان :-

"اسرارِ خودی" فارسی میں ہے، ہند اور ایران کی فارسی کے بیچ بیچ۔ اکثر ہندوستانی شعراء کا فارسی کلام ایرانیوں کے لئے معانی کے لحاظ سے مشکل اور دور از ذہن نہیں، البتہ بعض الفاظ کا استعمال برصغیر میں خاص معانی کے ساتھ مخصوص ہو گیا، مثلاً "آباد" (قابلِ کاشت زمین)، رہنے والوں کے لئے۔ "محنت" (رنج و غم) بمعنی کوشش و کار اور "کاہ" (گندم یا جو وغیرہ کی بال)، بمعنی سبزہ و چارہ وغیرہ۔

سو سال پہلے تک ہندوستانی شعراء و ادبا کی کوشش تھی کہ ان کی فارسی، ایرانی فارسی جیسی ہو، مشہور محقق اور فاضل خان آرزو نے سراج اللغات اور چراغِ ہدایت نام کے لغات میں ایرانی اصطلاحات، اور روزمرہ کے استعمالات جمع کیا۔ ٹیک چند بہار نے بھی بہارِ عجم میں یہی روش اختیار کی ہے۔ لیکن اس سو سال میں چونکہ ہند و ایران کے ادبی روابط منقطع رہے، یہاں کے شعراء و ادبا پرانی کتابوں کی مدد سے فارسی الفاظ سیکھتے ہیں اور ان کتابوں کے مطابق ہی جملہ بندی کرتے ہیں۔ اب فارسی الفاظ اردو میں خاص معانی میں استعمال ہوتے ہیں، اور فارسی میں بھی ان ہی معانی میں استعمال کر لیا جاتا ہے جیسے غریب (اصلی مسافر)، ماما (ماں) بمعنی خادمہ اور محنت (غم) بمعنی کام۔ یہ معانی فارسی لغات میں نہیں ہیں۔ اسی طرح یہاں کے بعض فارسی شعراء اردو کے مطابق جملہ بندی کرتے ہیں۔ برصغیر میں فارسی کا تلفظ بھی اردو کے تلفظ کا سا ہو گیا اس معاملے میں یہاں کی یونیورسٹیوں کو فکر کرنا چاہیئے تھی کہ فارسی کو سنسکرت یا لاطین کی طرح مردہ زبان سمجھ کر نہ پڑھایا جاتا۔ بہر حال، ان مسائل کا میری تین جلدی کتاب "فارسی جدید" میں مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر اقبال کی فارسی، اوپر اشارہ شدہ ہندوستانی فارسی کی طرح نہیں، مگر کسی قدر خشک ضرور ہے۔ اگر آپ ایران جاتے اور ایک آدھ سال وہاں رہتے، تو یہ خشکی[1] دور

---

[1] اس خشکی کا اقبال کو بھی احساس تھا، مگر وہ تفکر و تفلسف کو ترک نہیں کر سکتے تھے، اور فلسفہ کسی قدر خشکی ضرور لے آتا ہے۔ تعجب ہے کہ اقبال کی شگفتہ بیانی کو مقررہ مشکل گوئی کہتے ہیں، اور ان کے بے ٹوک انداز کو "خشکی"۔ (مترجم)

ہو سکتی تھی، بلکہ ان کے آئندہ لکھے جانے والے فارسی اشعار کا اور ہی جلوہ ہونا۔ اب 'اسرارِ خودی' پر انتقاد ختم کر کے دوسری کتاب کو دیکھتے ہیں۔

مثنوی رموزِ بیخودی۔

مذکورہ پہلی کتاب لکھنے کے بعد شاعر نے سوچا کہ کم استعداد لوگ شاید یہ سمجھنے لگیں کہ وہ خود پسندی، نفس پرستی اور شخصی مفاد کو سامنے رکھنے کی تعلیم دے رہا ہے تاکہ ہر شخص دوسروں کی شخصیت کو اپنے میں جذب کرنے کی کوشش کرے۔ اس لئے اس نے 'رموزِ بیخودی' لکھی اور شائع کی۔ اس مثنوی میں اس نے بتایا ہے کہ 'خودی' کو ترقی و تکامل دینے کا منشا یہ ہے کہ وہ بعد میں ملت کے کام آئے اور جس ملت کے افراد کی کامل خودیاں، اس کے کام آئیں، وہ ملت کس قدر کامران ثابت ہو گی۔ اس کتاب کے ۱۰۷۶ ابیات ہیں۔ کتاب کی ترتیب 'اسرارِ خودی' کی طرح ہے۔ اس کی زبان اور اسلوبِ بیاں بھی پہلی مثنوی کا سا ہے، اس لئے ان امور کو دوبارہ بیان نہیں کرونگا۔

رموزِ بیخودی کے مضامین۔

ڈاکٹر اقبال نے اس مثنوی میں فرد اور قوم کا ربط دکھا کر لکھا ہے کہ قوم، افراد سے بنتی ہے مگر اس کی تکمیل نبوت کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس میں ملتِ اسلامی کی اساسی تعلیمات، توحید و رسالت، کا بیاں ملتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ مایوسی، غم اور خوف ایسے امراض ہیں جن سے فرد اور معاشرے کی زندگی مختل ہو جاتی ہے۔ اور ان امراض کا ازالہ، عقیدۂ توحید میں مضمر ہے۔ ان مطالب کو شاعر نے مناسب اور دل لگتی حکایات و تمثیلات کے ذریعے ادا کیا ہے۔ فرد اور قوم کے ربط کے بارے میں کہا ہے۔

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است

ناتوانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامۂ احرار باش

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم است

فرد تنہا از مقاصد غافل ہست — قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش — نرم رو مثلِ صبا گرداندش

اور قوم، افراد کے اختلاط سے بنتی ہے۔

مردمان خوگر به یکدیگر شوند — سفته در یک رشته چون گوهر شوند
در نبردِ زندگی یار هم اند — مثل همکاران گرفتار هم اند
محفلِ انجم ز جذب باهم است — هستیِ کوکب ز کوکب محکم است

توحید، ملتِ اسلامی کے اساسی ارکان میں سے ہے۔

در جهان کیف و کم گردید عقل — پی به منزل برد از توحید عقل
چون مقام عبده محکم شود — کاسهٔ دریوزه، جام جم شود
ملتِ بیضا تن و جان لا اله — سازِ ما را پرده گردان لا اله
با وطن وابسته تقدیر امم؟ — بر نسب بنیاد تعمیر امم؟
ملت ما را اساسی دیگر است — این اساس اندر دلِ ما مضمر است
تیر خوش پیکان یک کیشیم ما — یک نما، یک بین، یک اندیشیم ما

توحید سے مایوسی، غم اور خوف جیسے مزمن امراض کا ازالہ ہوتا ہے۔

مرگ را سامان ز قطع آرزو است — زندگانی محکم از لاتقنطو[1] است
ای که در زندان غم باشی اسیر — از نبیؐ تعلیمِ لاتحزن[2]، بگیر
گر خدا داری ز غم آزاد شو — از خیالِ بیش و کم آزاد شو
بیم غیر الله عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رهزن است
هر که رمز مصطفیٰ فهمیده است — شرک را در خوف مضمر است

رسالت، اسلام کا دوسرا بنیادی رکن ہے۔

تارکِ آفل، براهیم خلیلؑ — انبیا را نقشِ پای او دلیل

۱؎ قرآن مجید ۳۹ : ۵۳

۲؎ ″ ″ ۹ : ۴۰

آن خدای لم یزل را آیتی — داشت در دل آرزوی ملتی[۱]
بہر ما ویرانہ آباد کرد — طائفان را خانہ بنیاد کرد
حق تعالی پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جان دمید
دین فطرت از نبیؐ آموختیم — در رہِ حق مشعلی افروختیم
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
دل ز غیر اللہ مسلمان برکند — نعرۂ لا قوم بعدی می زند

رسالتِ محمدیہؐ نے بنی نوعِ انسان کو حریت، مساوات اور اخوت[۲] کے عملی نمونے فراہم کیے ہیں۔

بود انسان در جہان انسان پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوت کسری و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پا و گردنش
از غلامی فطرت او دون شدہ — نغمہ ہا اندر نی او خون شدہ
تا امینی حق بہ حقداران سپرد — بندگان را مسندِ خاقان سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد — کوہ کن را مایۂ پرویز داد
تازہ جان اندر تنِ آدم دمید — بندگان را از خداوندان خرید

کربلائے معلیٰ کا حادثۂ عظیم حریتِ اسلامی کا مظہر ہے ؎

آن امام عاشقانؓ پور بتولؓ — سروِ آزادی ز بستانِ رسولؐ
زندہ حق از قوتِ شبیریؓ است — باطل آخر داغِ حسرت میری است
چون خلافت رشتہ از قرآن گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آن سر جلوۂ خیر الامم — چون سحاب قبلہ باران در قدم

---

۱ ایضاً (اشارۃً) قرآن مجید ۱۲۴ تا ۲/۱۲۹

۲ مطبوعہ متن میں غلطی سے اخوت اور سوزان (مترجم)

برزمین کربلا بارید و رفت — لاله در ویرانه ها کارید و رفت
تاقیامت قطعِ استبداد کرد — موج خونِ او چمن ایجاد کرد
تارِ ما از زخمه اش لرزان ہنوز — تازه از تکبیرِ او ایمان ہنوز
ای صبا ای پیکِ دور افتادگان — اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رسان

ملتِ محمدیہ توحید و رسالت کے عقائد کی بنا پر کسی مقام و وطن کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں۔ ؎

جوہرِ ما با مقامی بستہ نیست — بادۂ تندش بجامی بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست — رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست

ملتِ اسلامیہ کا آئین "قرآن مجید" ہے اور اس ملت کی صورت — اسی آئین سے ہے ؎

ملتی را رفت چون آئین ز دست — مثلِ خاک اجزای او از ہم شکست
ہستیِ مسلم ز آئین است و بس — باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس
تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نوعِ انسان را پیامِ آخرین — حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ
ارج می گیرد ازو نا ارجمند — بندہ را از سجدہ سازد سربلند
گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

ہر ملت کو ایک مرکز کی ضرورت ہے اور ملتِ اسلامیہ کا مرکز "بیت اللہ شریف" ہے:

قوم را ربط و نظام از مرکزی — روزگارش را دوام از مرکزی
رازدار و رازِ ما بیت الحرام — سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام

۱؎ مطبوعہ منقبت بلیغ، شاطی، بہ آخوت اور سوزان (مترجم)

چون نفس در سینہ او را پروریم   جانِ شیرین است او ما پیکریم
تازہ رو بستانِ ما از شبنمش   مزرعِ ما آب گیر از زمزمش

مندرجہ بالا چند شعر "رموز بیخودی" کے مطالب کا نمونہ فراہم کرتے ہیں۔ اس مثنوی کا اہم تر پیغام یہ ہے کہ روئے زمین کے مسلمان متحد ہوں، پوری ملتِ اسلامیہ پر توجہ رکھیں اور کسی مخصوص وطن کے ہی نہ ہو کے رہ جائیں۔ اس موضوع پر اگرچہ نصف صدی سے کافی لکھا اور کہا گیا اور کئی مسلمان دانشوروں جیسے سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ مصری اور میرزا آقا خان کرمانی[1] نے اس راہ میں قربانیاں دی ہیں، نیز خلیفہ عبدالحمید خان ثانی عثمانی نے بھی اس موضوع کے عمل پذیر ہونے کیلئے کوششیں کیں، لیکن حق یہ ہے کہ اقبال نے اس مضمون پر مجددانہ نظر ڈالی اور اپنے خاص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کو زیادہ اجاگر اور مدلل بنا دیا ہے۔

عالم اسلام کا اتحاد:

ابتدائے اسلام کے وقت حالت یہ تھی کہ اسلام قبول کرنے والی ہر قوم، اسلام کے معاشرے میں ختم ہو جاتی تھی اور نومسلم، دیگر تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ اس وقت ہر کام کے ضمن میں پورے مسلمان معاشرے کا مفاد پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ مدتوں مسلمان مختلف ممالک میں باآسانی ہجرت بھی کرتے رہے۔ امویوں نے خلافت کو عربوں تک محدود بنا دیا، اور غیر عربوں کو مختلف سرکاری کاموں سے بھی محروم رکھا، مگر خلافتِ عباسیہ کے دوران اخوتِ اسلامی کو پھر تجدید ہوئی۔ اس زمانے کے "شعوبی" علما نسلی اور گروہی امتیازات کی بات کرتے رہے اور عرب کی عجم پر فضیلت کے قائل رہے۔ آیہ کریمہ "وجعلناکم شعوبا وقبائل" (۴۹/۱۳) میں شعوب کی تاویل وہ "اقوامِ عجم" بتاتے تھے۔ مگر اس گروہ کی کسی نے نہ مانی اور آخر مدارِ فضیلت تقویٰ ہی قرار پایا۔

---

[1] سید جمال الدین کے ایک ارادتمند جن کے ہاتھوں ۱۸۹۶ء ناصر الدین شاہ قاجار قتل ہوا، اور بعد میں انہیں بھی تختہ دار سے گذرنا پڑا۔ (مترجم)

(اِنَّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم)۔

یورپ میں ملت کی اساس کلیسا تھا۔ زبان اور وطن کی ملی اہمیت نہ تھی۔ لیکن نپولین نے جب دیکھا کہ اس کی فتوحات کے نقوش کو دشمن مٹادیں گے، تو اس نے زبان اور وطن کی ملیّت کا نعرہ لگایا' اور اس طرح مغرب میں ہر کہیں وطن محدود کئے جانے لگے، اگرچہ مسلمانوں پر' جو بیشتر مشرقی ممالک میں تھے' اس عمل کا کوئی خاص اثر نہ پڑا۔ مگر مسلمان اس عصر میں زوال و انحطاط سے دوچار تھے۔ اس وقت بعض روشن فکر مسلمانوں کی تحریک پر اتحاد عالم اسلام کی بات ہونے لگی۔ چنانچہ خلیفہ عثمانی عبدالحمید خان ثانی کو اتحاد عالم اسلام کی نہضت کا سربراہ بنایا گیا تاکہ مسلمانوں کے حالِ زار اور اضمحلال کا علاج کیا جاسکے۔ سلطان عثمانی نے کمزور ترک سلطنت کا مفاد بھی اسی میں دیکھا کہ مسلمان متحد ہوں کیونکہ اس سلطنت کو اس وقت یورپ سے خطرہ تھا۔ ایران میں اس وقت ناصرالدین شاہ قاچار کی استبدادی حکومت تھی مگر اس ملک سے بھی بعض افراد جیسے میرزا آقا خان کرمانی نے اتحاد عالم اسلام کی صدا پر لبیک کہا۔ اس ضمن میں سید جمال الدین افغانی کی کوششیں معروف اور نمایاں ہیں۔ بہرحال' ان دنوں میں ایران کے بازاروں میں لوگوں سے سنا کرتا تھا کہ تمام مسلمانوں کا بادشاہ اور ان کے مفادات کا محافظ خلیفہ عبدالحمید خان ہے۔ لیکن بعد میں جمال الدین افغانی کو ایران سے ذلت آمیز طریقے کے ساتھ باہر نکال دیا گیا' اور میرزا کرمانی نے بھی جان' جان آفریں کے سپرد کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایران اور ترکی میں مشروطہ (آئینی جمہوری) حکومتیں قائم ہوگئیں اور ان دونوں اقوام نے رفتہ رفتہ یورپ کے طور طریقے بھی اپنا لئے۔ ان ملکوں میں وطنیت نے بڑی شدّ و مدّ سے گھر کر لیا ہے۔ ترکوں نے خلافت کی باعزت قبا بھی اتار پھینکی۔ آج ہر ایرانی کہے گا کہ پہلے میں ایرانی ہوں' پھر مسلمان'۔ یہی حال ترکوں کا ہے۔ مجتہد مدرّس نے چند سال پہلے ایران کی قومی اسمبلی میں کہا تھا۔

"ہم ایرانی ہیں اور جو کوئی ہماری اجازت کے بغیر ہماری سرزمین میں داخل ہو' اسے مار ڈالیں گے۔ بعد میں اس کی نعش کو دیکھیں گے۔ اگر مرد ہو' اور اس کا ختنہ

رکیا ہو تو اسے دفن کریں گے۔"

ایرانی نسل کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ چند ماہ قبل ایک ایرانی فاضل سیّد احمد کسروی نے تہران کے مجلّہ "آئندہ" میں ایک مقالہ لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صفوی سلاطین 'سیّد' نہ تھے بلکہ سیروس اور دارا کی نسل سے تھے، اسی لئے ان کی سلطنت خالص ایرانی سلطنت تھی[ا]۔ یہ امر قابل تعجب ہے کہ خود مقالہ نگار 'سیّد' ہے۔

بہر صورت، 'اتحاد عالم اسلام' کا خیال آج بالکل مردہ اور بے بنیاد ہے کیونکہ تمام مسلمان راہنما وطنیت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ صرف برّ صغیر کے مسلمان قائد اس خیال کے حامی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی اس وقت کوشش کر رہے ہیں، جب مسلمانانِ عالم اس سے بردار ہو چکے ہیں۔ انگلستان جاتے سے قبل وہ خود بھی وطن پرستانہ اشعار کہتے رہے جو بے حد معروف ہیں۔ ایک وقت انہوں نے کہا تھا۔ ؎

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

مگر آج کہہ رہے ہیں کہ ؎

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لیکن ابھی افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی ایک آرزو بھی پوری نہیں ہوئی۔ نہ ہندوستاں ہمارا ہوا، اور نہ سارا جہاں۔

اقبال کے انگلستان کے قیام کے دوران (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) وہاں ایک 'پان اسلامک سوسائٹی' قائم تھی۔ شاید اس انجمن نے اقبال کے فکر و نظر کو متاثر کیا ہو اور انہوں نے یہ تہیہ کر لیا ہو کہ اپنے فلسفہ اور زورِ بیان کے ذریعے مسلمان راہبروں کو وطنیت سے بیزار اور اتحادِ عالمِ اسلام کا حامی بنا کے رہیں گے۔ پھر اقبال ایک ہندی مسلمان ہے، اور مسلمانانِ ہند کی بقا دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ مربوط ہے۔ بد قسمتی

[ا] مگر صفویوں کا 'سیّد' ہونا ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے اور اب بھی یہ ایک مسلّمہ بات نہیں ہے۔
(مترجم)

سے ہندوستان کے مسلمان حاکم عاقبت بین نہ تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ یہاں انکی سلطنت ہمیشہ باقی رہے گی' اسی لئے انہوں نے یہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ کرنے کا نہ سوچا۔ اسی لئے جب یہاں مسلمان حکومت کمزور ہوگئی اور مسلمان بدستور اقلیت میں ہی رہے' تو انہیں یہ خوف پیدا ہوا کہ مبادا ہمارا انجام بھی اندلس کے مسلمانوں کا سا نہ ہو[1]۔ اس خوف کی پناہ وہ بیرونِ ہند کے مسلمانوں کے رابطے میں تلاش کرتے ہیں۔ غالباً اس لئے مسلمانانِ ہند' دنیا بھر کے مسلمانوں کے غم خوار ہیں۔ مسلمان قوم پر جو مصیبت آئے' یہاں کے مسلمان جلسے' جلوس اور مالی مدد کے ذریعے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں کے مسلمان آج اقبال ایسے فلسفی سے بہرہ مند ہیں جو سارے عالم اسلام کو اتحاد کی زبردست دعوت دے رہا ہے۔ دیکھیں یہ دعوت برصغیر تک محدود رہتی ہے' یا عالمِ اسلام میں واقعی کوئی تحریک و انقلاب وجود میں آتا ہے۔ اقبال کی کوشش ہے کہ وطن پرست سیاست کے صید مسلمانوں کو اپنے فتراک اتحاد میں باندھ لے' اور احساساتِ قلبی کے زور سے ان کی فکرِ ذہنی پر غالب آجائے۔ آج ایک بات نمایاں نظر آرہی ہے کہ تصانیفِ اقبال نے پڑھے لکھے ہندی مسلمانوں پر گہرا اثر ڈال رکھا ہے اور اس کے اشعار' غیبی اور الہامی سرود سمجھے جاتے ہیں۔ مستقبل کا کسی کو علم نہیں کہ مسلمانوں کا کیا حال ہوگا۔ شاید دوسرے اسلامی ممالک کے راہنماؤں کی فکر میں بھی تبدیلی آئے اور اتحاد عالم اسلام کا امکان پیدا ہوسکے۔ اس وقت ہم اقبال کو ایک صاحبِ الہام ولی یا سیاسی پیغامبر مان لیں گے[2]۔

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات ایک ایرانی ۱۹۲۸ء میں کہہ رہا ہے تو کیا پاکستان بننا ناگزیر نہ تھا؟ (مترجم)

[2] اس وقت بھی مسلمان ممالک کے درمیان جزئی قسم کے اختلافات ہیں' مگر بالعموم اتحاد عالم اسلام کا سب کو احساس ہے اور اس سلسلے میں کافی کام ہو بھی چکا۔ اگر ارواحِ گذشتگان کو اس جہان کی خبر ہو' تو اقبال کی روح اس بات پر بہت مسرور ہوگی کہ پاکستان کی حکومت اور یہاں کے لوگوں نے کئی ذرائع سے اتحادِ مسلمانان کے لئے بہت کام کیا ہے۔ (مترجم)

ہم مسلمانوں کے امکانی اتحاد سے مایوس نہیں۔ مسلمان اب بھی اپنی دعاؤں میں اللّٰھم اغفر للمسلمین والمسلمات' کہتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان، صرف ہندوستانیوں کی مغفرت کی دعا نہیں کرتے اسی طرح ایرانی یا ترک وغیرہ بھی سب مسلمانوں کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو یاد رکھتے ہیں۔

میرے خیال میں ایرانیوں یا ترکوں کی موجودہ نسل پرستی بے معنی ہے کیونکہ اسلام کے آنے کے بعد ان قوموں کا دوسری مسلمان اقوام کے ساتھ ازدواج اور ہجرت وغیرہ کے ذریعے وسیع تر اختلاط ہوتا رہا ہے۔ آج کوئی ایرانی نہیں کہہ سکتا کہ وہ قدیم زرتشتیوں کی اولاد ہے۔ اسی طرح کوئی ترک یا عرب وغیرہ بھی اپنے خالص نژاد ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ آج جو ایران میں متولد ہوا وہ ایرانی ہے، خواہ اس کا باپ کہیں سے بھی ایران آیا ہو۔ چند پشتیں گذر جائیں تو نسل کی کسے خبر ہے؟۔ سادات نے البتہ اپنے نسب پر توجہ رکھی ہے۔ بہرحال آج ایرانی کو ایرانی نسل سے ہونے پر فخر ہے، اور ترک کو ترکی نسل سے ہوتے پر حالانکہ اس بات کا امکان ہے کہ ایرانی، ترک نسل ہوگیا ہو یا ترک، ایرانی نسل۔ اسلام سے قبل لوگ نسلی امتیازات کے قائل تھے، اور ہر نسل دوسری پر برتری کا دعویٰ رکھتی تھی۔ اسلام نے نوع انسانی کی مساوات کا درس دیا، مگر افسوس کہ آج کے مسلمان پھر جاہلیت کے دور کی طرف عود رہے ہیں۔ ہر ملک کے افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی ترقی کی کوشش کریں اور اس کا دفاع کریں۔ رہی نسلی تعصب اور علاقائی برتری کی بات، تو یہ ایک غیر منطقی مفروضہ ہے۔ سعدی نے کہا ہے

بنی آدم اعضای یک دیگرند   کہ در آفرینش زیک گوہرند

پیام مشرق۔

ڈاکٹر اقبال کی تیسری کتاب 'پیام مشرق' ہے جو اعلیحضرت پادشاہ افغانستان امیر امان اللہ کے نام معنون کی گئی ہے۔ یہ کتاب برصغیر کے فارسی دان حلقوں میں

لے بلکہ جس نے وہاں کی قومیت بھی قبول کر لی۔

بہت مقبول ہے۔ اس میں دو بیتیاں، قطعے اور غزلیں وغیرہ ہیں اور اس میں جرمن شاعر گوئٹے کا اتباع کیا گیا اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔ گوئٹے، مشرقی افکار کی تقلید میں مشہور ہے، اور وہ کوئی ایک صدی پہلے گذرا ہے۔ ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اقبال نے مشرق کے ایک مقلد شاعر کی تقلید و پیروی کیوں کی ہے؟ اس کا جواب 'پیام مشرق' میں موجود ہے۔ اس کتاب کے شعری قالب اور افکار مشرقی ہیں، البتہ جس طرح گوئٹے نے مغربی افکار میں مشرقی عنصر سمویا تھا، اسی طرح اقبال نے مشرقی افکار میں مغربی تخیل کی رنگ آمیزی کی ہے۔ گوئٹے ایک جرمن شاعر اور فلسفی تھا۔ اسے فارسی افکار کی ۱۸۱۲ء تک خبر نہ تھی۔ اس سال فان ہیمر نے دیوانِ حافظ کو جرمن زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا اور ۶۵ سالہ گوئٹے حافظ کا مجذوب و عاشق بنا۔ گوئٹے نے حافظ کی تقلید کی، اور اس کے اسلوب کو اپنے 'دیوان شرق و غرب' میں سمویا۔ اب کوئی سو برس بعد ڈاکٹر اقبال نے، جو جرمن جانتے ہیں، گوئٹے کے دیوان کا جواب دیا ہے۔
ایک ایرانی فاضل ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے مجلہ 'ایران شہر' (تہران) سال چہارم کے بارہویں شمارے میں حافظ اور گوئٹے کے موازنے میں ایک مقالہ لکھا ہے جسے دلچسپی رکھنے والے حضرات مطالعہ کر سکتے ہیں۔ پیام مشرق کا اجمالی تعارف البتہ مجھ سے سُن لیں۔

کتاب کی زبان۔

پیام مشرق کی زبان مذکورہ دوسری دو کتابوں کے مقابلے میں واضح تر اور شیریں تر ہے۔ اس کا اسلوب مجموعی طور پر متاخر ایرانی شعراء کے اسلوب سے نزدیک ہے۔ دو مثنویوں کے نمونے نقل ہو چکے۔ اب پیام مشرق کا نمونہ اس کے 'پیشکشی دیباچہ' سے ملاحظہ کریں۔

خطاب بہ پادشاہ افغانستان۔

ای امیر کامگار، ای شہریار — نوجوان و مثلِ پیران پختہ کار
چشم تو از پردگیہا محرم است — دل میان سینہ ات جام جم است
عزم تو پائندہ چون کہسار تو — حزم تو آسان کند دشوار تو
ہمتِ تو چون خیالِ من بلند — ملّتِ صد پارہ را شیرازہ بند

هدیه از شاهنشاهان داری بسی — لعل و یاقوت گران داری بسی

ای امیر، ابن امیر ابن امیر — هدیه ای از بی نوائی هم پذیر

تا مرا رمز حیات آموختند — آتشی در پیکرم افروختند

یک نوای سینه تاب آورده ام — عشق را عهد شباب آورده ام

پیر مغرب، شاعر آسمانوی — آن قتیل شیوه های پهلوی

بست نقش شاهوان شوخ و شنگ — داد 'مشرق' را 'سلامی از فرنگ'

در جوابش گفته ام 'پیغام شرق' — ماه تابی ریختم بر شام شرق

او ز افرنگی جوانان مثل برق — شعلهٔ من از دم پیران شرق

او چمن زاده، چمن پروردهٔ — من دمیدم از زمین مردهٔ

او چو بلبل در چمن فردوس گوش — من به صحرا چون جرس گرم خروش

هر دو دانای ضمیر کائنات — هر دو پیغام حیات اندر ممات

هر دو خنجر صبح خند آئینه فام — او برهنه، من هنوز اندر نیام

هر دو گوهر ارجمند و تابدار — زادهٔ دریای ناپیدا کنار

او ز شوخی در تهٔ قلزم تپید — تا گریبان صدف را بردرید

من به آغوش صدف تابم هنوز — در ضمیر بحر نایابم هنوز

آشنای من ز من بیگانه رفت — از خمستانم تهی پیمانه رفت

من شکوه خسروی او را دهم — تخت کسری زیر پای او نهم

او حدیث دلبری خواهد ز من — رنگ و آب شاعری خواهد ز من

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید — آشکارم دید و پنهانم ندید

برگ گل رنگین ز مضمون من است — مصرع من قطرهٔ خون من است

از تر سرمایه دارم کرده اند — در دیار هند خوارم کرده اند

لاله و گل از نوائم بی نصیب — طائرم در گلستان خود غریب

دیده ای، ای خسرو کیوان جناب — آفتاب 'ما توارت بالحجاب'

ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت ‎ ‎ از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت

مصریان افتادہ در گردابِ نیل ‎ ‎ سست رگ تورانیان ژندہ پیل

آلِ عثمان در شکنجِ روزگار ‎ ‎ مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار

عشق را آئینِ سلمانی (رض) نماند ‎ ‎ خاکِ ایران ماند و ایرانی نماند

سوز و سازِ زندگی رفت از گلش ‎ ‎ آن کہن آتش فسرد اندر دلش

مسلمِ ہندی شکم را بندہ ‎ ‎ خود فروشی، دل ز دین برکندہ

در مسلمان شانِ محبوبی نماند ‎ ‎ خالد (رض) و فاروق (رض) و ایوبی (رح) نماند

ای ترا فطرت ضمیرِ پاک داد ‎ ‎ از غمِ دین، سینۂ صد چاک داد

تازہ کن آئینِ صدیق (رض) و عمر (رض) ‎ ‎ چون صبا بر لالۂ صحرا گذر

ملتِ آوارۂ کوہ و دمن ‎ ‎ در رگِ او خونِ شیران موج زن

زیرک و روئین تن و روشن جبین ‎ ‎ چشمِ او چون جرہ بازان تیز بین

قسمتِ خود از جہان نایافتہ ‎ ‎ کوکبِ تقدیر او نا تافتہ

در قہستان خلوتی ورزیدۂ ‎ ‎ رستخیزِ زندگی نادیدۂ

جان تو بر محنتِ پیہم صبور ‎ ‎ کوش در تہذیبِ افغانِ غیور

تا ز صدیقان این امت شوی ‎ ‎ بہر دین سرمایۂ قوت شوی

زندگی جہد است و استحقاق نیست ‎ ‎ جز بعلم انفس و آفاق نیست

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ‎ ‎ ہر کجا این خیر را بینی، بگیر

علم و دولت نظمِ کارِ ملت است ‎ ‎ علم و دولت، اعتبارِ ملت است

آن یکی از سینۂ احرار گیر ‎ ‎ وان دگر از سینۂ کہسار گیر

کشورِ محکم اساسی بایدت؟ ‎ ‎ دیدۂ مردم شناسی بایدت

کتاب کے حصے۔

کتاب کے چند حصے ہیں۔ ۱۔ دو بیتیاں (لالہ طور) ۔ ۲۔ متفرقات جن میں غزل، قطعہ، دو بیتی، مثنوی اور مسمط اصناف مختلف موضوعات جیسے گلِ

نخستیں، ہلالِ عید، تسخیر فطرت، بوئے گل، نوائے وقت، فصل بہار، افکار انجم، محاورہ علم و عشق اور محاورہ خدا و انسان وغیرہ پر ہیں۔ اس حصے کا عنوان "افکار" ہے۔

۳۔ غزلیات (مئے باقی) ۴۔ غزل، قطعہ، مثنوی اور فردیات وغیرہ پر مشتمل متفرق اشعار جن کا عنوان "نقش فرنگ" ہے۔ کتاب میں کل ۷،۱۰۱ اشعار ہیں۔

لالۂ طور (دو بیتیاں)۔ یہ دو بیتیاں یا رباعی نما قطعے بابا طاہر ہمدانی کے اشعار (پہلو بات/فہلو یات) کے وزن میں ہیں (ہزج مسدس مزاحف "مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل یا فعولن) رباعی کا وزن "مثمن" ہوتا ہے (شعر میں ۸ اور مصرع میں ۴ رکن) مگر بعض قدما کی طرح بابا طاہر ہمدانی اور اقبال نے مسدس (شعر میں ۶ اور مصرع میں ۳ رکن) کے وزن کو اپنایا ہے۔ بیشتر دو بیتوں میں اقبال کا خاص فلسفہ، فلسفۂ خودی جھلک رہا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

دریں گلشن پریشان مثل بوئم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئم
برآید آرزو یا بر نیاید — شہید سوز و ساز آرزوئم

جہان مشت گل و دل حاصل اوست — ہمیں یک قطرۂ خون مشکل اوست
نگاہ ما دو بین افتاد ورنہ — جہان ہر کسی اندر دل اوست

ز آب و گل خدا خوش پیکری ساخت — جہانی از ارم زیبا تری ساخت
وی ساقی بہ آن آتش کہ دارد — ز خاک من جہان دیگری ساخت

چہ لذت یارب اندر ہست و بود است — دل ہر ذرہ در جوش نمود است
شگافد شاخ را چون غنچۂ گل — تبسم ریز از ذوق وجود است

بگردون فکر تو دارد رسائی[1] — ولی از خویشتن نا آشنائی
یکی بر خود کشا چون دانہ چشمی — کہ از زیر زمین نخلی برآئی

سحر در شاخسار بوستانی — چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانی

---

[1] بعد کی اشاعتوں میں مصرع یوں ہے: رہی در سینۂ انجم کشائی

برآور هر چه اندر سینه داری — سرودی، ناله‌ای، آهی، فغانی
ز مرغان چمن ناآشنایم — بشاخِ آشیان تنها سرایم
اگر نازک دلی، از من کران گیر — که خونم می تراود از نوایم
سحر می گفت بلبل باغبان را — درین گِل جز نهالِ غم نگیرد
به پیری می رسد خار بیابان — ولی گُل چون جوان گردد بمیرد
گذشتی تیز گام ای اختر صبح — مگر از خوابِ ما بیزار رفتی
من از ناآگهی گم کرده راهم — تو بیدار آمدی، بیدار رفتی
شنیدم در عدم پروانه می گفت — دمی از زندگی تاب و تبسم بخش
پریشان کن سحر خاکسترم را — ولیکن سوز و ساز یک شبم بخش
زبان بینی ز برِ بوستانم — اگر جانت شهیدِ جستجو نیست
نمایم آنچه هست اندر رگِ گل — بهار من طلسمِ رنگ و بو نیست
اگر در مشتِ خاکِ تو نهادند — دلِ صد پارهٔ، خونابه باری
ز ابر نو بهاران گریه آموز — که از اشکِ تو روید لاله زاری

افکار۔

اس حصّے میں شاعری کا اسلوب تو قدیم ہے، مگر افکار جدید ہیں۔ خودی کی ترقی و تکامل کے علاوہ کئی دوسرے فلسفیانہ مطالب بھی جلوہ گر ہیں۔ مثلاً چند موضوعات پر اشعار کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کرمکِ شب تابؔ

شنیدم کرمکِ شب تاب می گفت — دمی از نه آن مورم که کس نالد ز نیشم
توان بی منتِ بیگانگان سوخت — نه پنداری که من پروانه کیشم

لہ یہ قطعہ، دو بیتوں میں لکھا گیا تھا اور ہم نے اس کو یہاں قطعات و منظومات میں لکھا ہے۔ (مترجم)

اگر شب تیره تر از چشمِ آہوست　　خود افروزم، چراغِ راہ خویشم

میلاد آدم

نعره زد عشق که خونین جگری پیدا شد　　حسن لرزید که صاحب نظری پیدا شد
خبری رفت ز گردون به شبستانِ ازل　　حذر ای پردگیان، پرده دری پیدا شد
آرزو بی خبر از خویش به آغوشِ حیات　　چشم وا کرد و جهان دگری پیدا شد
زندگی گفت که در خاک تپیدم همه عمر　　تا ازین گنبد دیرینه دری پیدا شد

حیات جاوید

گمان مبر که بپایان رسید کارِ مغان　　هزار باده ناخورده در رگِ تاک است
چمن خوش است ولیکن چو غنچه نتوان زیست　　قبای زندگیش از دمِ صبا چاک است
اگر ز رمزِ حیات آگهی، مجو و مگیر　　دلی که از خلشِ خارِ آرزو پاک است
بخود خزیده و محکم چو کوهساران زی　　چو خس مزی که هوا تیز و شعله بی باک است

محاورهٔ خدا و انسان

خدا:

جهان را ز یک آب و گل آفریدم　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک، پولادِ ناب آفریدم　　تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نهالِ چمن را　　قفس ساختی طائرِ نغمه زن را

انسان:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم　　سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کهسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم که از سنگ آئینه سازم　　من آنم که از زهر نوشینه سازم

مئے باقی۔

غزلیات تو اس حصے میں نظیری اور بیدل وغیرہ کے اسلوب میں ہیں، مگر ان سب میں فلسفۂ خودی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے نیز ان میں مسلمانانِ عالم کو کوشش و کار کی

دعوت دی گئی ہے۔ چند غزلوں کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)

دانۂ سبحہ بہ زنّار کشیدن آموز	گر نگاہِ تو دوبین است، ندیدن آموز
پا ز خلوت کدہ، غنچہ بروں نہ چو شمیم	با نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز
آفریدند اگر شبنم بی مایہ ترا	خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگرت خارِ گلِ تازہ رسی ساختہ اند	پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابانِ تو برکند ترا	صفت سبزہ دگر بارہ دمیدن آموز
تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیروں	عزلت خُم کدہ گیر و رسیدن آموز
تا کجا در تۂ بالِ دگراں می باشی	در ہوای چمن آزادہ پریدن آموز
در بتخانہ زدم، مغ بچگاں گفتند	آتشی در حرم افروز و تپیدن آموز

(۲)

ز خاکِ خویش طلب آتشی کہ پیدا نیست	تجلّی دگری در خورِ تقاضا نیست
اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکری انگیخت	تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناس نہ ای، وز مقامِ بی خبری	چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست
نظر بہ خویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست	جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست۔
بیا کہ غلغلہ در شہرِ دلبراں فگنیم	جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گردِ صحرا نیست
ز قید و صید نہنگاں حکایتی آور	مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
مرید ہمت آں رہروم کہ پا نگذاشت	بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش	حذر ز بیعتِ پیری کہ مردِ غوغا نیست
برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است	حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

نقشِ فرنگ۔

'پیامِ مشرق' کے اس چوتھے حصّے میں اقبال نے مغربی تمدّن کے بعض بنیادی نقائص بیان کئے اور مشہور فلاسفر جیسے طالستائی، نٹشے، بائرن اور ہیگل وغیرہ کے بعض افکار

کو فلسفیانہ زبان میں ادا کیا ہے ۔ یہ حصہ عوام کی فہم سے دور ہے اور ساحرؔ نے علماء و فلاسفروں کو مستفید کیا ہے ۔ اس حصے کے چند ابیات ملاحظہ ہوں ۔

پیغام

ازمن ای باد صبا گوی بہ دانای فرنگ	عقل تا بال کشود است، گرفتار است
برق را این بہ جگر می زند، آن رام کند	عشق از عقل فسون پیشہ جگردار تر است
عجب آن نیست کہ اعجازِ مسیحا داری	عجب این است کہ بیمار تو، بیمار تر است
علم و حکمت اگرش خوی سگی باز دہد	آدمی زادہ دانا ز ددان خوار تر است
خواجہ را قیمت عیش است اگر مزدِ غلام	بندۂ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر است[1]

زندگی و عمل

ساحلِ افتادہ گفت: گرچہ بسی زیستم	ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم؟
موجِ ز خود رفتہ، تیز خرامید و گفت	"ہستم اگر می روم، گر نروم نیستم"

طنزی بر جمعیت اقوام (سازمان ملل متحد)

برفتد تا روش رزم در این بزم کہن	دردمندانِ جہان، طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں پیش ندانم کہ کفن دزدی چند	بہرِ تقسیم قبور انجمنی ساختہ اند

رومی و ہیگل

می کشودم شبی بہ ناخن فکر	عقدہ ہای حکیم آسمانی
آنکہ اندیشہ اش برہنہ نمود	ابدی را ز کسوتِ آنی
پیش عرض خیال او گیتی	خجل آمد ز تنگ دامانی
چون بدریای او فرو رفتم	کشتیٔ عقل گشت طوفانی
خواب بر من دمید افسونی	چشم بستم ز بانی و فانی
نگہ شوق تیز تر گردید	چہرہ بنمود پیرِ یزدانی

---

[1] آخری دو شعر اب محذوف ہیں ۔ دوسرے شعر کا مصرعِ ثانی یہاں غلط نقل ہوا تھا (مترجم)

آفتابی کہ از تجلیٔ او — افق روم و شام نورانی
شعلہ اش در جہان تیرہ نہاد — بہ بیابان، چراغِ رہبانی
معنی از حرف او ہمی روید — صفت لالہ ہای نعمانی
گفت بہ من "چہ خفتہ ای" برخیز — بہ سرابی سفینہ می رانی
"بہ خرد راہ عشق می پوئی؟ — بہ چراغ آفتاب می جوئی؟"

زبور عجم

جناب اقبال کی چوتھی فارسی کتاب 'زبور عجم' ہے جس کے دو حصے ہیں۔ ایک غزلیات کا حصہ ہے جس کے مزید دو جزو ہیں، اور بعد کے حصے میں دو مثنویاں ہیں۔ اشعار کی تعداد ۱۲۳۴ ہے۔ غزلیات، زبان اور اسلوب کے لحاظ سے مولانائے رومؒ کی غزلیات کے مشابہ ہیں، لیکن ان میں ہر کہیں اقبال کا خاص فلسفہ اور تصوف اجاگر ہے۔ یہ غزلیں زبان اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے 'پیام مشرق' کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ مثنوی اول میں فلسفیانہ نکات کو مشکل تشبیہات اور استعارات کی مدد سے اور علمی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ عوام کے پلّے یہاں کچھ نہ پڑے گا۔ یہ حصہ علماء کے لئے مخصوص ہے، اور اس میں اسلوب بیان 'اسرار خودی' کا سا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا تمام بیان 'خودی' کے لئے مخصوص ہے، اور یہ نظریہ ان کا مقصودِ حیات ہے۔ اب پہلے غزلوں کے چند نمونے دیکھیں۔

(۱)

غزل سرای و نواہای رفتہ باز آور — بہ این فسردہ دلان حرف دل نواز آور
کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا را — ہزار فتنہ از آن چشم نیم باز آور
زبادہ ای کہ بخاکِ من آتشی آمیخت — پیالہ ای بجوانانِ نو نیاز آور
نئی کہ دل ز نوائش بہ سینہ می رقصد — مئی کہ شیشۂ جان را دہد گداز آور
بہ نیستانِ عجم، باد صبحدم تیز است — شرارہ ای کہ فرو می چکد ز ساز آور

(۲)

ای کہ زمن فزودۂ گرمی آہ و نالہ را — زندہ کن از صدای من خاک ہزار سالہ را
با دل ما چہا کنی تو کہ بہ بادۂ حیات — مستی شوق می دہی آب و گل پیالہ را
غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ گشای — تازہ کن از نسیم من داغ درون لالہ را
میگذرد خیال من از مہ و مہر و مشتری — تو بہ کمین چہ خفتۂ ای صید کن این غزالہ را
خواجۂ من، نگاہ دار آبروی گدای خویش — آنکہ ز جوی دیگران پُر نکند پیالہ را

(۳)

تکیہ بر حجت و اعجاز بیان نیز کنند — کار حق گاہ بہ شمشیر و سنان نیز کنند
گاہ باشد کہ تہ خرقہ زرہ می پوشند — عاشقان بندۂ حال اند و چنان نیز کنند
چون جہان کہنہ شود پاک بسوزند اورا — وز ہمان آب و گل ایجاد جہان نیز کنند
ہمہ سرمایۂ خود را بہ نگاہی بدہند — این چہ قومی است کہ سودا بہ زیان نیز کنند
آنچہ از موج ہوا یا پر کاہی کردند — عجبی نیست کہ با کوہ گران نیز کنند
عشق مانند متاعی است ببازار حیات — گاہ ارزان بفروشند و گران نیز کنند
تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ — عشق کاری است کہ بی آہ و فغان نیز کنند

(۴)

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما — ای جوانان عجم، جان من و جان شما!
غوطہ ہا زد در ضمیر زندگی اندیشہ ام — تا بدست آوردہ ام افکار پنہان شما
مہر و مہ دیدم، نگاہم برتر از پروین گذشت — ریختم طرح حرم در کافرستان شما
فکر رنگینم کند نذر تہی دستان شرق — پارۂ لعلی کہ دارم از بدخشان شما
می رسد مردی کہ زنجیر غلامان بشکند — دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما
حلقہ گرد من زنید ای پیکران آب و گل — آتشی در سینہ دارم از نیاکان شما

مثنوی گلشن راز جدید، شیخ محمود شبستری کی مثنوی "گلشن راز" کے اتباع اور جواب میں لکھی گئی اور اس کے اشعار[1] کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

---

[1] ۔ اس تبصرے میں مثنوی بندگی نامہ، کا ذکر مفقود ہے ۔ اس مثنوی میں اقبال کے انتقادات
(باقی اگلے صفحہ پر)

زجان خاور آن سوز کہن رفت
دمش وا ماند و جانِ او زتن رفت
چو تصویری کہ بی تار نفس زیست
نمیداند کہ ذوقِ زندگی چیست
دلش از مدعا بیگانہ گردید
نیِ او از نوا بیگانہ گردید
بطرز دیگر از مقصود گفتم
جواب نامۂ محمود گفتم
زعہد شیخ تا این روزگاری
نزد مردی بجانِ ما شراری
کفن در بر بجاکی آرمیدیم
ولی یک فتنۂ محشر ندیدیم
گذشت از چشم آن داناى تبریز
قیامت ہا کہ رُست از کشتِ چنگیز
نگاہم انقلابی دیگری دید
طلوعِ آفتابِ دیگری دید
کشودم از رخِ معنی نقابی
بدستِ ذرہ دادم آفتابی
مرا ذوقِ خودی چون انگبین است
چہ گویم؟ واردات من ہمین است
نخستین کیف او را آزمودم!
دگر بر خاوران قسمت نمودم

حضرات! ایک تقریر میں اس سے زیادہ آپ کو کیلئے زحمتِ استماع دوں۔ میں نے کوشش کی کہ اختصار کے ساتھ اس موضوع پر کچھ عرض کر دوں۔ اب تقریر ختم ہو گئی۔ اتنی بات اور عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال صاحب کی کتابیں اگرچہ بہترین ہندی خوشخطی سے مزین ہیں، اور اچھے کاغذ پر چھپی ہوئی ہیں، پھر بھی اپنے حجم کے لحاظ سے گراں قیمت ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان کے سستا بیچا جانے کی کوئی تدبیر فرماتے تو میرے خیال میں زیادہ اچھا ہوتا۔

(بقیہ) انتہائی شدید ہیں اور مقرر تے اس کا ذکر نہ کرنا ہی غالباً مناسب سمجھا ہوگا۔ (مترجم)

افغانستان اور ایران میں اقبال شناسی

ابتدائیہ:

افغانستان اور ایران میں مطالعۂ اقبال کی ایک خاص اہمیت ہے کیونکہ علامہ مرحوم کے منظوم کلام کا تقریباً دو تہائی حصہ فارسی میں ہے۔ مقدم الذکر ملک کے فضلا کے ساتھ اقبال کے ذاتی مراسم بھی خاص اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین سلجوقی اور سرور خان گویا ان کے خاص احباب میں شامل تھے اور ان دونوں مرحومین کا سارا افغانستان ارادت مند اور معتقد ہے۔ اس کے علاوہ افغانستان کے سفر (اکتوبر و نومبر ۱۹۳۳ء) کے دوران میں اقبال نے متعدد افغانی فضلا و اُدبا کو اپنے افکار اور تصانیف سے روشناس کروا دیا تھا۔ اُس وقت افغانستان کی واحد سرگرم اور فعال انجمن "انجمنِ ادبی کابل" تھی جو ماہنامہ "کابل" نکالتی رہی ہے۔ اس انجمن نے اقبال اور ان کے رفقائے سفر راس مسعود، سید سلیمان ندوی، غلام رسول خاں اور ڈاکٹر ہادی حسن) کو ایک اہم سپاسنامہ بھی پیش کیا تھا[1]۔ مذکورہ ماہنامہ "کابل" میں ۱۹۳۱ء سے اقبال کی وفات کے چند سال بعد تک علامہ مغفور پر مقالے اور ان کا منتخب فارسی کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ افغانستان میں اقبال شناسی کی روئداد اسی قدر ہے۔ البتہ چند سال قبل دو ماہی "ادب" کابل میں بھی اقبال پر دو مقالے شائع ہوئے ہیں جن کا ذکر مقالات کی فہرست میں آرہا ہے۔ افغانستان سے شائع ہونے والے دوسرے مقالات اور کتب میں اقبال کا ذکرِ جمیل اور ان کی تصانیف سے استناد

---

[1] ماہنامہ "کابل" دسمبر ۱۹۳۳ء۔ نیز دیکھیں "سیرِ افغانستان" مؤلفہ سید سلیمان ندوی (مقدمہ از سید عبدالقدوس ہاشمی)، حیدرآباد دکن، (نفیس اکیڈمی، ۱۹۴۵ء)

اس پر مزید ہے۔ اکثر پڑھے لکھے افغانیوں کو کلامِ اقبال کے ساتھ قابلِ رشک حد تک عشق ہے۔ (افغانی بالعموم اقبال کے اُردو کلام سے بھی آگاہ ہیں)۔

ایران میں اقبال خوانی کی کیفیت طویل تر ہے جسے کسی حد تک ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے اس سے قبل لکھا ہے[1]۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ اقبال کی فارسی کتابیں پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم (م: ۱۹۴۵ء) وغیرہ کے ذریعے ایران کے بعض اساتذہ (جیسے سعید نفیسی متوفی ۱۹۶۶ء اور سید محمد محیط طباطبائی متولد ۱۹۰۶ء) کو تقریباً شائع ہوتے ہی ملتی رہیں اور وہ مصنف کو تعریف بھرے خطوط لکھتے رہے، مگر اقبال پر مقالات اور کتب لکھے جانے کا سلسلہ علامہ مرحوم کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ (البتہ ایک ایرانی استاد نے ۱۹۲۸ء میں بھی حیدر آباد دکن سے اقبال پر ایک فارسی کتابچہ شائع کیا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ادبی روابط کے انقطاع کے اس دور میں ایرانی ادبا و علماء کو اقبال کی تصانیف ملی ہی نہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایران کے ساتھ ہمارے جو خصوصی نزدیک کے برادرانہ تعلقات استوار ہوئے، اس سے ایران میں مطالعۂ اقبال کی خاطر ایک مناسب ماحول پیدا ہو گیا۔ چند سال قبل یہاں "کلیاتِ فارسی اقبال" شائع ہوا تھا جو دوسری بار بھی چھپ چکا ہے (اس میں اغلاط[2] ہیں مگر ہمارے ہاں سے شائع ہونے

---

[1] "اقبال ایرانیوں کی نظر میں"، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی ۱۹۵۷ء۔ اس کتاب میں سید محمد علی داعی الاسلام اور سید محمد محیط طباطبائی کے کتابچوں اور مقالوں ("دکتر اقبال و شعرِ فارسی وی" ارمغان، ۱۹۳۸ء اور محیط ۱۹۴۵ء، دیکھیے بعد کے اوراق) کی تلخیص موجود ہے۔ مع فارسی متن)۔

[2] شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء۔ دیکھیے ذیل کے صفحات: ۳۹، ۴۰
۷۴۳، ۷۰۶، ۶۹۹، ۴۷۸، ۴۷۴، ۵۱۳، ۳۹۸، ۳۴۳، ۲۷۴، ۲۰۴، ۶۷، ۴۰، ۳۹
۷۶۰، ۷۶۳، ۷۷۱، ۷۷۴ (حاشیہ غائب ہے)، ۹۳۰ اور ۱۰۱۹ وغیرہ۔ بعض اغلاط بعد کی اشاعتوں میں درست کر لی گئی ہیں۔

ہونے والے اقبال کے فارسی کلیات سے کمتر)۔ اس کلیات نے اور کلام اقبال کے[1] بعض منتخبات نے (دیکھیے بعد میں 'دانائے راز' اور 'یک چمن گل') اقبال شناسی کی راہ خاطر خواہ طور پر ہموار کی۔ چنانچہ مختلف کتب و مقالات میں اقبال کے ذکر اور استناد نیز انکی تعریف میں لکھے جانے والے اشعار سے قطع نظر کتابوں اور سنجیدہ مقالوں کی مختصر کیفیت ذیل میں دیکھ کر ہم ایران میں اقبال شناسی کے تنوع سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

راقم الحروف کوئی سات سال تک تہران میں قیام پذیر رہا ہے[2]، اس لیے افغانستان اور ایران میں اقبال پر شائع ہونے والے جملہ فارسی مقالے اور کتابیں اس کی نظر سے گذر چکی ہیں۔ بعض اہم تر مقالوں کو اُردو میں بھی منتقل کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ کوئی جامع ببلیوگرافی نہیں کیونکہ راقم نے اخباری، سرسری اور وقتی نوعیت کے بیانات اور تحریرات کو قلم زد کر دیا ہے، البتہ اہم تر مقالات اور بیانات اور تحریرات کو قلم زد کر دیا ہے، البتہ اہم تر مقالات اور کتب کی کیفیت تقریباً اسی قدر ہے۔ راقم السطور نے پاکستان کے فارسی مجلات (پاکستان مصور، سروش، صدائے پاکستان اور ہلال) اور کتب میں اقبال سے مربوط مقالوں کو اس جائزے میں شامل نہیں کیا۔ البتہ فارسی زبان والوں کی بعض تحریریں جو پاکستان میں شائع ہوئیں، انہیں مستثنیٰ جاننا چاہیے۔ دیگر توضیحی امور حسب ذیل ہیں:

(الف) یہ فہرستِ مقالات و کتب، مجلات اور کتب کے ناموں کی ترتیب سے ہے (حروفِ تہجی کے اعتبار سے) اور ہر مقالہ اور کتاب کے بارے میں، جہاں ضرورت محسوس کی گئی، ضروری وضاحت کر دی گئی ہے۔ یہ امر اس لیے ضروری نظر آیا کہ یہ مجلے اور کتب، عام طور پر پاکستان میں دستیاب نہیں ہیں۔

(ب) افغانستان اور ایران میں متداول ہجری شمسی سال، عیسوی سال سے تقریباً ۶۲۱ سال پیچھے ہے۔ ہجری شمسی مہینے کا آغاز عیسوی مہینے کے اعتبار سے ۲۱ یا ۲۲ کو ہوتا ہے، مگر ہم نے تاریخ درج کرنے میں بعد کا مہینہ دکھایا ہے۔ تاکہ ۲/۳ ایام ماہ کی مطابقت رہے۔

---

[2] نومبر ۱۹۶۵ء سے جنوری ۱۹۶۹ء اور ستمبر ۱۹۷۳ء سے اگست ۱۹۷۷ء تک۔

(ج) فکرِ اقبال سے مانوس و مشعوف ادبا و فضلا کی نشاندہی اور دیگر توضیحات حواشی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ذیل میں نام مجلہ، مقام و تاریخ، مقالے کا مختصر عنوان، مقالہ نگار اور صفحاتِ مجلہ دیے جا رہے ہیں:

ادب (دو ماہی)، کابل، جون، جولائی ۱۹۶۵ء، یادبود علامہ اقبال، پروفیسر غلام حسن مجددی[1]، ص ۳۰ - ۳۸۔

ادب (دو ماہی)، کابل، اپریل تا جولائی ۱۹۶۷ء، فلسفۂ اقبال، پروفیسر غلام حسن مجددی، ص ۳ - ۸۔

کابل (ماہانہ)، کابل، مارچ ۱۹۳۱ء، دکتر اقبال (معرفی شعرِ فارسی[2]) سرور خان گویا، ص ۱۹ - ۲۳۔

کابل (ماہانہ)، کابل، جون ۱۹۳۲ء، علامہ اقبال (احوال زندگی)، شہزادہ احمد علی خان درانی، ص ۱۳ - ۲۳۔

کابل (ماہانہ)، کابل، اگست ۱۹۳۲ء، اشعارِ علامہ اقبال[3] (جاوید نامہ)، ادارۂ مجلہ، ص ۳۹ - ۴۰۔

کابل (ماہانہ)، کابل، دسمبر ۱۹۳۲ء، انتخاب "سخنی با نژاد نو، از اقبال"، ادارۂ مجلہ، ص ۳۰ - ۳۹۔

---

[1] پروفیسر غلام حسن مجددی، کابل یونیورسٹی کی ادبیات فیکلٹی کے ڈین ہیں۔ موصوف کے یہ دونوں مقالے ان کے وہ خطابے ہیں جو یومِ اقبال کے موقع پر پاکستانی سفارت خانے (کابل) کے زیر اہتمام انھوں نے پڑھے تھے اور ان میں اقبال کے فلسفۂ اسلامی (خودی) کو اجاگر کیا ہے۔

[2] بیشتر "اسرار خودی" اور "رموزِ بے خودی" پر تبصرہ ہے۔

[3] انتخاب از "آں سوئے افلاک" (افغانستان اور ایران کی تعریف اور انتقاد کے حامل اشعار)۔

کابل (ماہانہ)، کابل، اکتوبر ۱۹۳۳ء، درود معارف ہند[۱]، ادارۂ مجلہ، آخری صفحہ۔

کابل (ماہانہ)، کابل، دسمبر ۱۹۳۳ء، افغانستان از نظرِ فضلای ہند[۲]، ادارۂ مجلہ، ص ۸۱ - ۹۴۔

کابل (ماہانہ)، کابل، دسمبر ۱۹۳۴ء، تقریظ و نقد مثنوی مسافر، اقبال، سرور خان گویا، ص ۸۶ - ۹۰۔

کابل (ماہانہ)، کابل، اپریل ۱۹۳۴ء، اشعار اقبال (ساقی نامہ و کشمیر از پیام مشرق)، ادارہ، ص ۳۹ - ۴۰۔

کابل (ماہانہ)، کابل، مئی ۱۹۳۸ء، وفات دکتر اقبال، شاعر متفکر و فیلسوف، سرور خان گویا[۳] شاہزادہ احمد علی خاں درانی، ص ۸۹ - ۱۰۰۔

کابل (ماہانہ) کابل، اپریل ۱۹۳۹ء، علامہ اقبال کی پہلی برسی، ادارہ، ص ۴۳ - ۴۵۔

کابل (ماہانہ)، کابل، ستمبر اکتوبر ۱۹۳۹ء، خودی در نظر علامہ اقبال (ڈاکٹر سید عابد حسین کے اردو مقالے کا ترجمہ) از قیام الدین خادم، ص ۲۲ - ۳۹۔

اقبال نے مجلہ 'کابل' کی درخواست پر چھ اشعار مع اپنے فوٹو کے 'پیام بہ ملتِ کوہسار' کے عنوان سے انہیں بھیجے تھے۔ جون ۱۹۳۲ء کے 'کابل' میں ان کا عکس چھپا[۴] اور مئی ۱۹۳۸ء

---

[۱] اقبال اور ان کے رفقائے سفر کے دورۂ افغانستان کا خیر مقدم۔

[۲] اقبال، راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی ان اردو تقاریر کے فارسی تراجم جو انہوں نے انجمنِ ادبی کابل کے سپاسنامے کے جواب میں کی تھیں۔ (اقبال کی تقریر کا متن "مقالات اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد، لاہور (شیخ محمد اشرف) ۱۹۶۳ء میں بھی موجود ہے۔)

[۳] اقبال کے مرثیے میں فارسی اور پشتو میں نظمیں بھی ہیں۔ یہاں سرور خاں گویا نے اقبال کے بہترین فارسی اشعار کا ایک انتخاب بھی درج کیا ہے۔

[۴] اقبال کے دست نوشتہ اشعار کے ایک گوشے میں ان کا فوٹو بھی ہے۔ (یاد رہے "کابل" میں اقبال کے بیسیوں فوٹو شائع ہوئے ہیں)۔

کے شمارے میں (اقبال کی افغانوں کے لیے خاص وابستگی کے ذکر میں) ان اشعار کو دوبارہ نقل کیا گیا ہے (حالیہ سالوں میں یہ اشعار پاکستان کے کم از کم ایک مجلے[1] اور ایک کتاب[2] میں بھی درج ہو چکے ہیں:

صبا بگوی بہ افغانِ کوہسار از من — بمنزلی رسد ملتی کہ خود نگر است
مرید پیرِ خوابا تیانِ خود بین شو — نگاہ او ز عقابِ گرسنہ تیز تر است
ضمیر تست کہ نقشِ زمانہ نو کشد — نہ حرکتِ فلک است این، نہ گردشِ قمر است
دگر بسلسلۂ کوہسارِ خود بنگر! — کہ تو کلیمی و صبحِ تجلیِ دگر است
بیا، بیا کہ بہ دامانِ نادر آویزم — کہ مردِ پاک نہاد است و صاحبِ نظر است
یکی است ضربتِ اقبال و ضربتِ فرہاد — جز این کہ تیشۂ ما را نشانہ بر جگر است[3]

افغانستان سے شائع ہونے والے ان تیرہ مقالوں میں اقبال کی فارسی شاعری، عالمِ اسلام اور افغانوں سے ان کی محبت، ان کے فلسفۂ خودی و بیخودی اور اسلام کی بابت ان کی ترقی پذیر تعبیرات کی داد دی گئی ہے۔ اقبال افغانوں کی نظر میں (ماہنامہ کابل دسمبر ۱۹۳۴ء)

---

[1] "اسلامی تعلیم" (دو ماہی، مدیر: منظر حسین)، لاہور، مارچ تا جون ۱۹۷۵ء

[2] "اوراقِ گم گشتہ" مرتبہ رحیم بخش شاہین، لاہور (اسلامک پبلیکیشنز لیٹڈ) ۱۹۷۵ء، صفحہ ۲۱۸ - ۲۱۹۔

[3] اقبال نے "ارمغان حجاز" (حصہ اردو) میں بھی یہ بات دہرائی ہے کہ وہ بھی فرہادِ کوہکن کی طرح تیشہ زن اور محنت کش ہیں، مگر ان کی ضرب کا ہدف انسانی قلوب ہیں۔ اگر کوہکن نے بیستون سے جوئے شیر جاری کر دی تھی، تو انسانی قلوب سے خودی کے آبِ زلال کی نہریں کیوں جاری نہیں کی جا سکتیں۔ اس کتاب میں انہوں نے میرزا مظہر جانجاناں دہلوی (م: ۱۱۹۵ ہجری) کا ایک شعر بھی تضمین کیا ہے:

"ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد
تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است — خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

رومی، سعدی، حافظ اور بیدل کے بعد فارسی کے پانچویں بڑے شاعر ہیں۔ کابل کے اسی شمارے (صفحہ ۸۲) میں سرور خاں گویا اعتمادی مرحوم نے لکھا ہے:

"یکی از فضائل عمدہ و بزرگ علامہ ممدوح کہ مارا بہ مدحتش بی اختیار می نماید، این است کہ وی فضل و استعداد خود را مخصوص بہ ہند نساختہ بلکہ از جملہ فضلا و خدام بین المللی اسلام بشمار می رود۔ این فاضلِ شہیر یک سوز حقیقی ہموارہ برای معارف گذشتہ و عظمت رفتہ اسلام داشتہ و با تمام قوای و موجودیت خود در صدد رہنمونی و سنجیدن جادہ ہا برای عودت ترقی و عظمت اسلام می باشد۔"

ایران میں اقبال پر کتابیں: (الفبائی ترتیب سے)

ہر کتاب کا نام، مصنف، تاریخ و مقامِ اشاعت اور کیفیت درج ذیل ہے:

۱۔ اندیشہ ہای اسلامی اقبال (مقدمہ) سید غلام رضا سعیدی، ۱۹۶۸ء، طبع اسلامی قُم (ایران)۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ایک انگریزی مقالے[لہ] کا ترجمہ اور ۴۰ صفحے کا مقدمہ۔

۲۔ احیای فکر دینی در اسلام (ترجمہ)، احمد آرام، ۱۹۶۷ء، تہران۔ اقبال کے انگریزی کے سات خطبات (مقالات) کا ترجمہ۔

۳۔ اقبال لاہوری[لہ]، پروفیسر مجتبیٰ مینوی، ۱۹۴۷ء تہران (ضمیمہ ماہنامہ یغما)۔ ۷۵ صفحے کا کتابچہ (فکر و فن اقبال)۔

۴۔ اقبال ـــــ متفکر و شاعر اسلام، سید محمد تقی مقتدری، ۱۹۴۸ء، تہران (چاپخانہ روشنی)۔ ۹۷ صفحے کا کتابچہ، (فکر و فن اقبال)

لہ اقبال ریویو (سہ ماہی) میں مندرج، صفحہ ۸۶ تا ۱۲۹، اکتوبر ۱۹۶۰ء "فلسفۂ اقبال، اس کی اہمیت اور ماہیت" مقدمے کو راقم نے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔

لہ اردو ترجمہ (مترجم پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم)، "علامہ اقبال کے عنوان سے بزمِ اقبال لاہور نے شائع کیا ہے۔ ۱۹۷۷ء کے اوائل میں "اقبال لاہوری" کے مصنف انتقال فرما گئے اور فروری ۱۹۷۸ء میں اس کے مترجم بھی۔

۵ - اقبال شناسی، (در ہنر و اندیشہ محمد اقبال) سید غلام رضا سعیدی، ۱۹۵۹ء، تہران (چاپ اقبال و شرکت)، ۲۱۲ صفحے۔
(فکر و فن اقبال)۔

۶ - اقبال و ایران، (دکتر خواجہ عبد الحمید عرفانی)[1] ۱۹۵۹ء، تہران (سفارتِ پاکستان) ۱۶ صفحے (بروشر)۔

۷ - دکتر اقبال و شعر فارسی وی، سید محمد علی داعی الاسلام مرحوم، ۱۹۲۸ء، حیدر آباد دکن[2] ۴۶ صفحے۔ (اقبال پر فارسی میں قدیم تر مقالہ)

۸ - دانای راز، دکتر احمد احمدی بیر جندی، ۱۹۷۰ء، مشہد (کتاب فروشی زوار) ۲۳۸ صفحے۔ (اقبال کا فکر و فن اور انتخابِ کلامِ فارسی)۔

۹ - روئی عصر، خواجہ عبد الحمید عرفانی، ۱۹۵۳ء، تہران (چاپ دانش) ۳۰۴ صفحے۔ اقبال کے حالاتِ زندگی اور افکار۔

۱۰ - سرود اسلامی اقبال، سید محمد علی صفیر، ۱۹۶۸ء، تہران، ۶۵ صفحے۔ اقبال کے اردو ترانۂ ملی کے عربی اور فارسی تراجم اور توضیحات۔

۱۱ - سرود اقبال، فخر الدین حجازی، جنوری ۱۹۷۶ء تہران، ۳۰۴ صفحے۔ اقبال کے فکر و فن پر تبصرہ[3] (۱۲۵ صفحے) اور انتخابِ کلامِ فارسی (۱۱۵ صفحے)۔

۱۲ - سیر فلسفہ در ایران (ترجمہ) دکتر امیر حسین آریا نپور، ۱۹۶۷ء (طبع اول) تہران۔ اقبال کی انگریزی کتاب "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا" کا فارسی ترجمہ مع مقدمہ۔

---

[1] ان دونوں بروشروں پر مصنف کا نام مرقوم نہیں ہے۔

[2] اس کتابچے کا میرا اردو ترجمہ اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

[3] مقدمے کا میں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۳۔ علامہ اقبال[1] (مجموعہ مقالات یوم اقبال)، مرتبہ ادارۂ حسینیہ ارشاد، ۱۹۷۳ء، تہران ۸ مقالے (۱۶۰ صفحے) مشتمل بر فکر و فن اقبال۔

۱۴۔ علامہ محمد اقبال ــــ شاعرِ ملی پاکستان، تہران ۱۹۵۵ء (از دکتر خواجہ عبد الحمید عرفانی) ۱۸ صفحہ۔ بروشر (سفارت پاکستان)

۱۵۔ فکرِ اقبال (دو مقالے بر نظریاتِ سخت کوشی و اتحادِ جہانِ اسلام)، سید محمد نقی مقتدری ۱۹۵۴ء، کراچی، (فیروز سنز)۔ ۹۱ صفحے کا کتابچہ۔

۱۶۔ کلیات فارسی مولانا اقبال لاہوری، مقدمہ از احمد سروش ۱۹۶۴ء (طبع اول) تہران (انتشارات سنائی، طبع ثانی ۱۹۷۳ء)۔

۱۷۔ محمد اقبال، دکتر فضل اللہ رضا، ۱۹۷۳ء، تہران (نشریہ انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان)۔ ۵۰ صفحے (افکار اقبال)۔

۱۸۔ محمد اقبال و شعر فارسی نمای اردوی وی، دکتر خواجہ عبد الحمید عرفانی، ۱۹۶۰ء تہران (سفارت پاکستان)۔ ۲۴ صفحے کا بروشر۔

۱۹۔ یک چمن گل (انتخاب اشعار اقبال)، دکتر غلام حسین صالحی علامی[2]، ۱۹۶۰ء، تہران (چاپ عطائی)۔ ۱۴۴ صفحے (مقدمہ ۱۴ صفحے)۔

کتابوں (مجموعۂ مقالات) میں اقبال پر شذرات:

اقبال ــــ شاعرِ شرق (ہفتاد سالگی "محمود فرخ"[3]، تہران، ۱۹۶۵ء میں مقالہ) از دکتر عبد الحسین زرین کوب (پیامِ مشرق سے مربوط)۔

---

[1] یوم اقبال، ۱۹۷۰ء (اپریل) میں منعقد ہوا مگر مقالات تین سال بعد شائع ہوئے۔ مقررین میں سید ابو الفضل مجتہد زنجانی، سید محمد محیط طباطبائی، سید غلام رضا سعیدی، حبیب یغمائی (مدیر ماہنامہ یغما)، ڈاکٹر علی شریعتی اور ڈاکٹر سید جعفر شہیدی ایسے فضلا شامل تھے، اور موضوعاتِ سخن اقبالیات کے اہم گوشے۔ سید ابو الفضل مجتہد زنجانی کا مقالہ (اقبال و اتحادِ جہانِ اسلام) ہم نے اردو میں ترجمہ کیا اور ڈاکٹر علی شریعتی کی مفصل تقریر کا میرا ترجمہ ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ خانۂ فرہنگ ایران، مرکز تحقیقات فارسی راولپنڈی ۱۹۸۲ء

[2] مصنف، ایران کی دانشگاہ مکاتبہ ای (تہران) کے پروفیسر ہیں۔ میں نے اس کتاب کا مقدمہ بھی اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔ [3] معروف شاعر۔

اقبال و قرآن[۱] (" یاد نامہ علامہ امینی" جلد اول، تہران، ۱۹۷۳ء مرتبہ دکتر سید جعفر شہیدی میں مقالہ) از دکتر احمد احمدی بیر جندی۔

اقبال، ایران کے مجلات میں:

آموزش و پرورش (ماہانہ)، تہران، محمد اقبال — شاعر و فیلسوف، ترجمہ صادق طوبیا مارچ ۱۹۵۳ء (فرانسیسی سے ترجمہ)۔

آموزش و پرورش (ماہانہ)، تہران، عظمتِ اقبال لاہوری، از رشید یاسمی، نومبر ۱۹۵۴ء

آموزش و پرورش (ماہانہ)، تہران، ہدفہای تعلیم و تربیت مکتب فکری اسلام از نظر علامہ اقبال ترجمہ از سید غلام رضا سعیدی۔

(قسط اول)، از سید غلام رضا سعیدی، اگست ۱۹۶۶ء۔ پروفیسر[۲] خورشید احمد کے انگریزی مقالے کا فارسی ترجمہ مع توضیحات۔

قسط دوم ستمبر ۱۹۶۶ء۔

قسط سوم اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء۔

ارمغان (ماہانہ)، تہران، ترجمان حقیقت، شاعر فارسی محمد اقبال، از سید محمد محیط طباطبائی مئی ۱۹۳۸ء۔ (ایران میں اقبال کے حالاتِ زندگی اور فکر و فن پر شائع ہونے والا پہلا مقالہ جو میں نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروایا ہے)

جہانِ نو (ماہانہ)، تہران، یادِ علامہ اقبال، از ملک الشعرا محمد تقی بہار، جولائی ۱۹۵۰ء تقریر کا متن[۳]

---

[۱] میرا اُردو ترجمہ اشاعت پذیر ہو چکا۔

[۲] 'اقبال ریویو' اکتوبر ۱۹۶۰ء (دیکھیے حوالہ صفحہ ۲۰۴)

[۳] یوم اقبال، منعقدہ سفارت خانۂ پاکستان (تہران) میں تقریر کا متن۔ دیکھیے "اقبال ایرانیوں کی نظر میں"، صفحہ ۵۰-۵۹۔

سخت کوشی اقبال، از دکتر سید محمد اکرم اکرام، بہار ۱۹۶۸ء۔ کل ۱۰ صفحے

مجلۂ دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی، دانش گاہ تہران (سہ ماہی)، تہران، علی بخش (خادم اقبال)، از دکتر مظاہر مصفا[۱]، بہار و خزان ۱۹۷۵ء (حیاتِ اقبال)

مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی (سہ ماہی) مشہد، دانش گاہ مشہد اب دانش گاہ فردوسی، تحلیلی از جاوید نامہ اقبال، از دکتر احمد علی رجائی بخارائی، بہار ۱۹۶۵ء۔ پہلے شمارے کا پہلا مقالہ۔

مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی، دانش گاہ مشہد، اقبال ـــــ شاعرِ حیات[۲]، بقلم دکتر غلام حسین صدیقی، ۱۹۶۶ء۔ خطابۂ یوم اقبال (۲۲ صفحے) پہلا مقالہ۔

ایضاً دانش گاہ مشہد، ہنر شاعری اقبال، از دکتر احمد علی رجائی، بہار ۱۹۶۷ء، پہلا مقالہ۔

ایضاً دانش گاہ مشہد، توضیح یک بیت اقبال، از دکتر احمد علی رجائی، خزان ۱۹۶۷ء ۲۰ صفحے کا مبسوط مقالہ۔ بیت یہ ہے:

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور   خود گری، خود شکنی، خود نگری پیدا شد[۳]

ایضاً دانش گاہ مشہد، نظری بر جاوید نامۂ اقبال، مترجم دکتر محمد ریاض، خزاں ۱۹۷۲ء (اصل اُردو مقالہ چوہدری محمد حسین مرحوم کا ہے)۔

محیط (ماہانہ)، شمارہ ویژہ علامہ محمد اقبال[۴]، سید محمد محیط طباطبائی، مئی ۱۹۴۵ء، ۶۵ صفحے۔

معارف اسلامی (سہ ماہی)، تہران، مبانی اسلامی فلسفۂ خودی علامہ اقبال،

---

۱ تقریر یوم اقبال تہران (۹ نومبر ۱۹۷۵ء) علی بخش مرحوم کے بارے میں مقالے میں صرف چند سطریں لکھی گئی ہیں۔ باقی مقالہ سیرتِ اقبال سے مربوط ہے۔

۲ راقم نے اسے اُردو میں منتقل کر کے شائع کروایا ہے۔

۳ راقم نے اسے بھی اُردو میں منتقل کر کے شائع کروایا ہے۔

۴ اس مجلے میں وہ مقالہ بھی شامل ہے جسے مئی ۱۹۳۸ء میں سید محمد محیط طباطبائی نے اقبال کی وفات پر "ترجمانِ حقیقت" کے عنوان سے لکھا تھا۔

دانش (اقبال نامہ) تہران، اقبال نمبر[1] (کئی لکھنے والے)، نومبر اور دسمبر ۱۹۵۱ء۔ ۹۰ صفحے۔

روزگار نو (ماہانہ)، تہران، اقبال شاعر و پیغام او، از سعادت علی خاں، مئی ۱۹۵۱ء، ص ۵۸ - ۶۳۔

عدل (ہفت روزہ)، تہران، علامہ اقبال (ادائے احترام) بقلم محمود منشی (کاشانی)، ۳ مئی ۱۹۵۲ء، ۳ صفحے (بڑی تقطیع)

دانش (ماہانہ)، تہران، رومی عصر (اثرات رومی بر اقبال)، از دکتر خواجہ عبدالحمید عرفانی، جنوری ۱۹۵۱ء - ۶ صفحے کا مقالہ تبصرہ۔

کتابہای ماہ (ماہانہ)، تہران، آثار اقبال، از سید محمد محیط طباطبائی، جون ۱۹۵۲ء ۶ صفحے تعارف کتب۔

گوہر (ماہانہ)، تہران، اقبال لاہوری، از دکتر نصرۃ اللہ کاسمی، جولائی ۱۹۷۵ء[2] - خطابے کی قسط اول۔

گوہر (ماہانہ)، تہران، اقبال لاہوری، از دکتر نصرۃ اللہ کاسمی، اگست ۱۹۷۵ء[3] خطابے کی قسط دوم۔

مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی۔ دانش گاہ تہران (سہ ماہی)، تہران۔ احوال و آثار و افکار اقبال، از دکتر حسین خطیبی، اکتوبر ۱۹۵۳ء۔ مجلے کے سب سے پہلے شمارے کا اولین مقالہ۔

مجلۂ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی، دانش گاہ تہران (سہ ماہی)، تہران، فلسفۂ

---

[1] ایک مقالہ "فلک عطارد و زحل جاویدنامۂ اقبال" (مصنف: دکتر عبدالحسین نوائی) میں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

[2] تقریر یوم اقبال، تہران (۹ نومبر ۱۹۷۳ء)۔

[3] مقالہ۔

دکتر محمد ریاض، جولائی ۱۹۷۴ء، ۱۰ صفحے۔

معارف اسلامی (سہ ماہی)، تہران، مناقب یدبلیع اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم در اشعار علامہ اقبال از دکتر محمد ریاض' بہار اور تابستان ۱۹۷۶ء، ۱۳ صفحے۔

مہر (سہ ماہی)، تہران، کمال اقبال، از مجید موقر (مدیر مجلہ)، جون ۱۹۶۳ء، قسط اول۔

مہر (ماہانہ)، تہران، کمال اقبال، از مجید موقر (مدیر مجلہ)، جولائی ۱۹۶۳ء، قسط دوم (کل ۱۲ صفحے)

نامۂ آستان قدس (ماہانہ)، مشہد، نظری بر مثنوی[1] 'پس چہ باید کرد'، از دکتر احمد علی رجائی، جنوری ۱۹۶۶ء، ۱۰ صفحات۔

وحید (ماہانہ)، تہران، تضمینات فکر اقبال از شعرای ایران، دکتر محمد ریاض' ستمبر ۱۹۷۴ء، کل ۱۵ صفحے۔

وحید (ماہانہ) تہران، اقبال و شاہ ہمدان سید علی ہمدانی' از دکتر محمد ریاض 'قسط اول۔

وحید (ماہانہ)، تہران، اقبال و شاہ ہمدان سید علی ہمدانی، دکتر محمد ریاض 'قسط دوم۔

ہفت ہنر (سہ ماہی)، تہران، سہم ایران در ہنر و اندیشہ اقبال' دکتر محمد ریاض، جنوری ۱۹۷۴ء، صفحہ ۵۰ تا ۵۹۔

ہنر و مردم (ماہانہ)، تہران، اساس فلسفۂ اقبال شاعر پاکستان، از علی اکبر کوثری' نومبر ۱۹۶۵ء (شمارہ ۳۵) صفحہ ۲ تا ۵۔

ہنر و مردم (ماہانہ) تہران، مثنوی اسرارِ خودی اقبال' دکتر سید محمد اکرم شاہ 'اکرام' جون۔ جولائی ۱۹۶۷ء، تقریر (صفحہ ۸ تا ۱۰)۔

ہنر و مردم (ماہانہ)، تہران - مولانا جلال الدین رومی و علامہ اقبال لاہوری، دکتر خ۔ ب۔ نسیم (پشاور)' جون ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۱۱ تا ۱۲

---

[1] مقالہ نگار پہلے مشہد یونیورسٹی کی ادبیات فیکلٹی کے ڈین تھے اور بعد میں تہران یونیورسٹی کے "دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی" میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ وہ مصنف کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔

ہنر و مردم (ماہانہ)، تہران، اقبال و پیام او، علی قلی محمودی بختیاری، اپریل ۱۹۷۶ء (خاص شمارہ) صفحہ ۲ تا ۶۔

یغما (ماہانہ) تہران، (مدیر حبیب یغمائی)، اقبال و سبک ہندی، نوشتہ دکتر حسین خطیبی[1]، مئی ۱۹۵۵ء خطابہ (۱۰ صفحات)۔

یغما (ماہانہ)، تہران، کیفیت تولد نظریۂ خودی در درون اقبال و ریشہ ہا و اجزای آن، از دکتر احمد علی رجائی، جنوری ۱۹۶۳ء - ابتدائی ایک صفحہ مدیر نے لکھا ہے۔

یغما (ماہانہ)، تہران، روز بزرگداشت اقبال در بغداد، از علی اکبر کوثری[2]، مئی ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۹ -

ایران میں اقبال پر لکھے جانے والے آثار کے بارے میں چند باتیں:

ایران میں اقبال کے بارے میں جو کتب و مقالات لکھے گئے ہیں ان کے دو نمایاں اور متفاوت پہلو ہیں، کچھ فن سے مربوط ہیں اور کچھ فکرِ اقبال سے۔ "دکتر اقبال و شعر فارسی وی" ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی مگر اس مختصر کتاب میں اقبال کی چار ابتدائی فارسی کتابوں (اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق اور زبورِ عجم) کے فنی اور فکری دونوں پہلوؤں پر نقد و نظر ملتا ہے۔ مصنف نظام کالج حیدر آباد دکن میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ "پنج جلدی فرہنگ نظام" (فارسی) ان کی قابل قدر تصنیف ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں دکن میں فوت ہوئے ہیں انہوں نے شعرِ اقبال کی خودی آموز، حریت پرور اور اتحادِ عالمِ اسلام کی بھرپور دعوت دینے والے شئون پر بحث کی اور ان کے اسلوبِ بیان کو کافی سراہا۔ ڈاکٹر احمد احمدی بیرجندی کی تالیف "دانائے راز" کا بھی یہی رنگ ہے۔ ایسی مستثنیات میں سید محمد محیط طباطبائی

---

[1] تقریر یومِ اقبال، تہران (۲۱ اپریل ۱۹۵۵ء)

[2] مقالہ نگار عراق اور خلیج کے ممالک میں ایران کے نمایندۂ فرہنگی رہے ہیں اور اقبال کے فلسفۂ خودی و بے خودی کا انہوں نے قابلِ قدر مطالعہ کیا ہے۔ راقم السطور نے ان کی ایک بصیرت افروز تقریر بھی سنی تھی جو انہوں نے "انجمنِ روابطِ فرہنگی ایران و پاکستان" (تہران) کے زیر اہتمام ۱۹۷۵ء کی ایک تقریب میں کی تھی۔

کے مقالے بھی شامل ہیں، وگرنہ دیگر تحریروں میں علامہ مرحوم کے شعرِ فارسی اور ضمناً انکے حالاتِ زندگی کا بیان ہے یا ان کے اسلامی افکار کا۔ سید غلام رضا سعیدی، سید محمد تقی مقتدری، ڈاکٹر فضل اللہ رضا، ڈاکٹر غلام حسین صدیقی، علی اکبر کوثری اور فخرالدین حجازی کی نگارشات پڑھیے۔ انہیں حیاتِ اقبال کے ماہ وسال سے معمولی دلچسپی ہے، ان کے شعری کمالات کا ذکر اشاروں میں کرتے ہیں مگر افکارِ اقبال سے گہری دلچسپی دکھاتے ہیں۔ یہ حضرات اقبال کو ایک ایسا عظیم مفکر اسلام مانتے ہیں جس نے عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کی نئی دل لگتی تعبیرات پیش کی ہیں۔ دیگر حضرات کی بیشتر توجہ اقبال کے شعرِ فارسی کے اسلوب سے مربوط ہے۔

دراصل اقبال کے ابتدائی تعارف کے دور میں ان کے ہنرِ شعر کی طرف توجہ مبذول کرنا ناگزیر تھا۔ استاد محمد تقی بہار ملک الشعرا، استاد مجتبیٰ مینوی، ڈاکٹر حسین خطیبی، مجید مؤقر، ڈاکٹر نصرۃ اللہ کاسمی اور ڈاکٹر احمد علی رجائی بخارائی کے مقالات کو اسی سیاق میں دیکھنا چاہیے۔ ان کی بحثوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ اقبال کا اسلوبِ بیان، شعرِ فارسی کے بہترین اسلوب (سبکِ عراقی) سے اقرب ہے، مگر نئے معانی وتعلیمات کی ادائیگی کے اعتبار سے یہ ایک نیا شیوۂ گفتار بن گیا اور اسے سبکِ اقبال، قرار دینا مناسب تر ہے۔ ڈاکٹر رجائی بخارائی، اقبال کے ایجاز بیان کو سراہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان کا ایک ایک شعر ایک پوری نظم کے ہم پلہ ہے۔ اقبال کا دوسرا بڑا ہنر (ان کے الفاظ میں) ترکیب سازی ہے انہوں نے صدہا نئی فارسی تراکیب تراشی ہیں جو ان کی زباں شناسی اور اعلیٰ ذوق کی بیّن دلیل ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فرماتے ہیں (مقالہ: ہنرِ شاعری اقبال) کہ "پیامِ مشرق" کے ہر چوتھے دوسرے پر ایک یا ایک سے زیادہ تراکیب دیکھی جاسکتی ہیں، مگر "سرودِ اقبال" کے مصنف لکھتے ہیں کہ شعر، صرف مؤثر اظہارِ بیان کا ذریعہ ہوتا ہے اور اقبال نے اسی لیے اس سے کام لیا اور اسے نبا ہا، مگر اب اس کے افکار پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ایسے دردمند مسلمان، اتحادِ عالم اسلام کے داعی، ہمدردِ انسانیت، عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، پیغامبرِ امن و آزادی، سعی و عمل اور نیکو کاری کے مؤثر داعی کو دیکھو کہ "ما قال" اور بھول جاؤ کہ کیف قال نہ

اقبالؒ کی فارسی تصانیف (تعارف برائے طلبہ)

اقبالؒ ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی اور بعد کی تعلیم کے لئے وہ لاہور اٹھ آئے۔ انہوں نے فارسی زبان بڑی محنت سے سیکھی۔ فارسی کے ان کے استادوں میں مولانا سید میر حسن کا نام بہت مشہور ہے۔ اقبال ایک فطری شاعر تھے۔ انہوں نے سکول اور کالج کی پڑھائی کے دوران شعر کہنے شروع کر دئے تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۹ء میں فلسفے کے مضمون میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا مگر اردو اور فارسی میں ان کی شاعری کے نمونے اس سال سے پہلے کے بھی موجود ہیں۔ مگر انہوں نے فارسی میں باقاعدہ شاعری کافی بعد میں شروع کی۔ ان کی پہلی فارسی کتاب پہلی جنگ عظیم شروع ہونے کے کوئی ایک سال بعد ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی اور علامہ کی آخری فارسی کتاب ان کی وفات کے کوئی سات ماہ بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں چھپی۔ ان ساری کتابوں کا ذکر آرہا ہے۔

فارسی میں اقبال کے شعر کہنے کی وجوہات کو لوگ ان کی زندگی کے دوران بھی لکھتے رہے اقبالؒ کے اردو مجموعۂ کلام 'بانگِ درا' کا آپ کو علم ہے۔ اس کا مقدمہ شیخ عبدالقادر نے لکھا اور یہ کتاب اقبالؒ کی پہلی تین فارسی کتابوں کے شائع ہو جانے کے بعد ۱۹۲۴ء میں پہلی بار چھپی تھی۔ اس مقدمے میں شیخ عبدالقادر نے ان وجوہات کا ذکر کیا ہے۔ ہم ان وجوہات کا خلاصہ بیان کرتے ہیں اور علامہ مرحوم کی اپنی رائے بھی بتاتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اقبالؒ کے زمانے تک اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں شعر کہنے کا رواج موجود تھا۔ اس برِّصغیر جنوبی ایشیا میں فارسی صدیوں تک سرکاری زبان رہی ہے۔ اس کی یہ حیثیت ۱۸۳۴ء میں انگریزوں نے ختم کی۔ انہوں نے فارسی کی جگہ اپنی زبان کو دفتروں میں رواج دیا۔ مگر اس سے نصف یا پون صدی بعد تک بھی فارسی

لکھنے والے اور اس زبان میں شعر کہنے والے برصغیر میں کافی تعداد میں موجود رہے ہیں۔ چنانچہ مومن، غالب اور شبلی کی فارسی شاعری مشہور ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فارسی افغانستان، ایران اور روس کے بعض حصوں کے لوگوں کی زبان ہی نہیں، وہ ایک ایسی اہم زبان بھی ہے جس میں دنیا بھر کے مستشرقین کو دلچسپی ہے۔ اس لئے اس زبان میں کہی گئی کوئی اہم بات بہت دور ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ فارسی ایشیا کی ایک اہم زبان ہے اور چونکہ دنیا کے مسلمانوں کی کوئی تین چوتھائی آبادی برِاعظم ایشیا میں ہی ہے، اس لئے اقبال نے اپنی فارسی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی اس وسیع آبادی کو اپنے خیالات سے آگاہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اقبال اپنی کتاب پیام مشرق میں بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی فارسی شاعری نے غیر عرب مسلمانوں کو جھنجوڑ کے اور جگا رکھا ہے۔ وہ یہ بھی آرزو رکھتے تھے کہ کاش غیر عربوں کی طرح عرب مسلمان بھی ان کے افکار سے جلد آگاہ ہوں۔ اقبال کی کتابوں کے ترجمے ہو جانے سے اب عرب بھی جلد ہی علامہ مرحوم کے پیغام سے واقف ہو گئے ہیں۔ اقبال کے فارسی کے شعر کہنے کی چوتھی وجہ فارسی زبان کی مٹھاس اور اس کی بعض دوسری خوبیاں ہیں۔ فارسی میں بابے کی طرح کے سابقے اور بان یا ور کی مانند لاحقے لگا کر باادب، بے تمیز، باغبان اور پیشہ ور جیسے الفاظ بنا لینے کی سہولت ہے پھر اس زبان کے تھوڑے الفاظ میں زیادہ معانی سما لیتے ہیں۔ اس میں بنی بنائی اصطلاحیں اور ترکیبیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ اس زبان کی مٹھاس اور شیرینی بھی دل کو موہ لیتی ہے۔ اقبال نے اپنی پہلی فارسی کتاب 'اسرارِ خودی' کے شروع میں اس وجہ کا خود بھی ذکر کر دیا ہے۔ پانچویں یہ کہ اقبال کو فارسی زبان پر عبور تھا، اپنی فارسی پر ان کو اعتماد تھا اور اس زبان کا ان کو بہت زیادہ ذوق تھا۔ انہوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے بھی ایرانی فلسفہ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کو لکھتے ہوئے انہیں سینکڑوں فارسی کتابیں پڑھنا پڑیں اور فارسی زبان کا ان کا ذوق مزید نکھر گیا تھا۔ آخر میں ایک چھٹی وجہ بھی لکھ دیں۔ یہ وجہ اقبال نے خود بتائی ہے۔ وہ ایک خط میں فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے اپنے خیالات دور دراز ملکوں تک پہنچانے کے

لئے فارسی میں شاعری کی ہے۔ مگر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں یہاں کے لوگوں سے اپنے خیالات کچھ عرصے تک پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ برصغیر میں اس وقت فارسی جاننے والے لوگ بہت تھوڑے سے ہیں۔ اس لئے اس زبان میں کہی گئی بات عام لوگوں تک دیر سے پہنچے گی اور اس وقت تک فارسی جاننے والے اسے آسان زبان میں سمجھا سکیں گے۔ اقبال کے افکار چونکہ عام ڈگر سے مختلف تھے، اس لئے وہ درست سوچتے تھے کہ عوام پر شروع میں ان کا شاید اچھا اثر نہ پڑے۔ مگر جن چند فارسی جاننے والوں نے اقبال کو پڑھا۔ ان میں سے بھی بعض نے شروع شروع میں علامہ مرحوم کی شدید مخالفت کی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ اقبال کا خلوص لوگوں کے دلوں پر اثر کر گیا، اور وہ علامہ مرحوم کے پیغام کی قدر کرنے لگے۔

اقبال کی منظوم کتابوں میں اردو کے صرف دو چار شاعروں کے حوالے ملتے ہیں مگر فارسی شاعروں کے حوالے بہت زیادہ ہیں۔ انہوں نے کسی نہ کسی موقع کی مناسبت سے ستر سے زائد فارسی شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ مگر ان سب شاعروں کا اقبال نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ انہوں نے بعض کے اسلوب کو اپنایا، اور بعض کے خیالات سے بیزاری ظاہر کی۔ کسی کی کوئی بات پسند کی اور کسی کی ناپسند۔ ان شاعروں میں سے بیدل، جامی، حافظ، امیر خسرو، سعدی، سنائی، عطار، عرفی، عمر خیام، غالب، فردوسی، مسعود سعد اور ناصر خسرو کے نام آپ نے شاید سنے اور پڑھے ہوں۔ مگر اقبال پر خاص اثرات صرف ایک فارسی شاعر کے ہیں۔ وہ مولانا رومی ہیں۔ اقبال کی کتاب جاوید نامہ کے ذکر میں ہم رومی و اقبال کے تعلقات پر کچھ لکھیں گے۔

اقبال نے اردو اور انگریزی نثر یا اردو اور فارسی نظم میں جو کچھ لکھا، وہ پاکستان اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور دنیا کے دوسرے لوگوں کے لئے بالعموم اہم ہے پھر بھی ان کی فارسی منظوم تصانیف کی بعض خاص فضیلتیں اور اہمیتیں ہیں جن میں سے بعض کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اول یہ کہ اقبال نے فارسی میں شاعری کی تقریباً تمام قسمیں پیش کی ہیں۔ ان قسموں یا اصناف میں قدیم اسلوب ہے اور جدید تجربے بھی۔ دوم یہ کہ اقبال نے اپنے

کئی خاص مضامین بھر پور انداز میں صرف فارسی شعر میں پیش کیے ہیں۔ ان کے نظریہ 'خودی' کا ذکر آئے گا۔ ارمغان حجاز کے اردو حصے میں اقبال فرماتے ہیں۔ ؎

خودی سے مردِ مسلماں کا ہے جلال و جمال   کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

مگر خودی کا پورا فلسفہ اقبال کی پہلی فارسی کتاب میں بیان ہوا ہے۔ 'بیخودی' کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اقبال کی دوسری فارسی کتاب کا موضوع ہے سوم یہ کہ دوسری فارسی کتابوں کی بعض خصوصیات وہ ہیں جو اقبال کی اردو کتابوں کو حاصل نہیں ہو سکیں۔ ایک فارسی کتاب (پیامِ مشرق) جرمن شاعر گوئٹے کے 'دیوان شرقی غربی' کے جواب میں ہے۔ ایک فارسی کتاب (زبورِ عجم) وہ ہے جس پر خود اقبال کو ناز تھا۔ ایک دوسری فارسی کتاب (جاوید نامہ) ان کا خیالی آسمانی سفر ہے جسے پورے اتفاق کے ساتھ لوگ ان کی سب سے بڑی اور اہم شعری کتاب مانتے رہے ہیں، اور یہ کتاب پوری فارسی ادبیات میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ ان کی ایک فارسی کتاب افغانستان کا منظوم سفرنامہ ہے (مسافر) اور ایک دوسری کتاب (ارمغان حجاز) سرزمین حجاز کا خیالی سفر ہے۔ اردو کتابیں ان خصوصیات سے خالی ہیں۔ ایک چوتھی بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اقبال کا زیادہ زور دار کلام، جو برِ صغیر اور عالمِ اسلام کی بیداری سے متعلق ہے یا غلامی کی مذمت میں ہے، وہ وافر مقدار اور زیادہ مؤثر انداز میں فارسی میں ہی ملتا ہے۔ اس کے باوجود، علامہ مرحوم کے اردو کلام کی بھی بعض خاص فضیلتیں ہیں۔ ان ابتدائی باتوں کے بعد اب علامہ اقبال کی ہر ایک فارسی کتاب کے تعارف پر توجہ رکھیے۔ کتابوں کا ذکر ان کی اشاعت کے سال کے مطابق ہے۔

۱۔ پہلی کتاب، '**اسرارِ خودی**'۔ اسرارِ خودی یعنی خودی کے راز اور بھید۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں چھپی تھی۔ پہلی اشاعت پر اردو میں ایک مقدمہ بھی تھا۔ دوسری اشاعت میں اسے حذف کر کے ایک نیا مختصر اردو مقدمہ شامل کیا گیا، مگر تیسری اشاعت سے دونوں مقدمے غائب ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس شعر کے دونوں مصرعے ایک جیسے ہم قافیہ الفاظ پر مشتمل ہوں، اسے مثنوی کہتے ہیں۔ 'اسرارِ خودی' مثنوی کی شکل میں ہے۔

اقبال کے خاص فلسفے کا نام بھی 'خودی' ہے۔ 'خودی' کا لفظ خود سے بنا ہے۔ اور

اقبال نے اسے ایک خاص اصطلاح بنا دیا۔ اس کے معانی اپنے آپ کو پہچاننا اور اپنی قوت و قابلیت سے آگاہ ہونا ہے۔ اقبال نے ۱۹۱۵ء میں اس نظریے کو پیش کیا اور اس کے بعد زندگی کے آخری سانسوں تک وہ اس کے مبلغ رہے۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف پروفیسر نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع کروا دیا تھا۔ اس طرح اقبال کا فلسفہ خودی جلد ہی ساری دنیا میں مشہور ہونے لگا تھا۔

اسرارِ خودی اقبال کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس کی تمہید میں اقبال نے اپنا تعارف پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہ ایک صاحبِ پیغام شاعر ہیں۔ وہ حال اور مستقبل کے شاعر ہیں مگر مسلمانوں کو ان کے ماضی سے آگاہ رکھنا بھی ان کے پیغام کا ایک حصہ ہے۔ تمہید کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ قدرتِ خداوندی نے ہر چیز کو ایک شخصیت اور وجود دے رکھا ہے۔ اس شخصیت اور وجود کا احساس اور اس کو ترقی دینے کا نام خودی ہے۔ اقبال ایک عام بحث کے بعد مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور انہیں قرآن مجید کی یہ تعلیم یاد دلاتے ہیں کہ اپنے وجود اور خدا کی پیدا کی تمام اشیاء کو غور و فکر کے ساتھ دیکھنا چاہیے 'خودی' خدا نے ہر کسی کو دے رکھی ہے، مگر زندگی بھر اس کو تربیت دیتے رہنا، اس کی مضبوطی کی کوشش کرنا اور اس کو کمزور کرنے والے برے کاموں سے بچنا ضروری ہے۔

اسرارِ خودی میں اقبال فرماتے ہیں کہ خودی کی حفاظت کی خاطر عمدہ مقصدِ حیات سامنے رکھنا چاہیے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر کوشش کرنا چاہیے۔ بے مقصد لوگوں کی 'خودی' مٹ جاتی ہے اور انہیں اپنی قابلیت اور قوت کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ مقصدِ زندگی کے علاوہ اقبال عشق و محبت برتنے پر زور دیتے ہیں۔ اقبال کا تصورِ عشق بہت اونچا ہے۔ عشق ان کے نزدیک ایک غیر معمولی قوت ہے۔ آپ کو علم ہے کہ علامہ مرحوم بہت بڑے عاشقِ رسولؐ تھے۔ یہاں بھی وہ مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وصلعم کی ذات سے محبت رکھیں اور ان کے اُسوہ و نمونہ کے مطابق اپنی زندگیاں بنائیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ بے عملی و بے کاری، گداگری، خوشامد اور دوسروں کے احسان اٹھانے کی عادات

'خودی' کی قوت کو کمزور کر کے رکھ دیتی ہیں ۔ اس لئے انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مصروف کار رہا کریں، دوسروں کی خوشامد نہ کریں اور کسی کے احسانات کا بوجھ نہ اٹھائیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسلمان شاعروں اور ادیبوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ شعر و ادب کے ایسے مجموعے پیش کریں جو پڑھنے والوں کو خودداری اور شرافت کی تعلیم دیں۔ شاعری اور ادبیات کو زندگی سنوارنے کا بندوبست کرنا چاہیے اسے بگاڑنے کا نہیں۔ قدیم یونان کے ایک فلسفی افلاطون اور اس کے پیروؤں نے خودی کو مٹانے اور بے عملی کی تعلیم دی تھی۔ ان کی تعلیمات کا مسلمانوں پر بھی خراب اثر پڑا۔ اقبالؒ یہاں افلاطون اور اس کے پیروؤں کی تعلیمات کی مذمت کرتے ہیں اور مسلمانوں کو ان تعلیمات سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اقبال نے یہاں اپنی تعلیمات کو سمجھانے کی خاطر بعض داستانیں بھی لکھی ہیں۔ مگر خودی کی تربیت و ترقی کے انہوں نے دو تین مرحلے بھی بتائے ہیں۔ پہلے مرحلے کو وہ اطاعت اور بندگی قرار دیتے ہیں۔ مقصد یہ کہ مسلمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے حکم بے چون و چرا ماننے اور ان پر عمل کرنے کی عادت ڈالیں۔ پھر یہ عادت رضا و رغبت سے ہو اور اُسے کوئی بوجھ نہ سمجھا جائے۔ دوسرے مرحلے کو اقبال نے ضبط نفس یعنی اپنے نفس پر قابو رکھنا قرار دیا ہے۔ یہ پہلے مرحلے سے ملا ہوا ہے۔ وہ ارکانِ اسلام کی پابندی کی ضرورت پر زور دیتے اور ان اعمال کو انجام دینے کی حکمت سمجھاتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام کی پابندی سے ہی ایک مسلمان کی خودی نشو و نما پاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

این ہمہ اسباب استحکامِ تُست پختہ ای محکم اگر اسلام تُست

یعنی اسلام کے ان احکام کی پابندی تیری اپنی خودی اور شخصیت کی پختگی کے لئے ہے۔ اگر تو اسلام کا پابند ہو تو تیری خودی پختہ اور مستحکم رہے گی۔

اب حکیم الامت کی زبانی اسلامی عقائد اور عبادات کی حکمت سنیے بعض حکمتیں انہوں نے دوسری کتابوں میں بھی لکھی ہیں۔ یہاں عقیدہ توحید کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ ایک اللہ کو ماننے والا، دوسروں کی غلامی قبول کرتا ہے نہ خدا کے سوا دنیا کی کسی

دوسری ہستی سے ڈرتا ہے۔ اللہ کو اپنا پروردگار اور تمام کاموں کا دارومدار ماننے والا جان کی قربانی کی پرواہ کرتا ہے نہ مال کی قربانی کی۔ اسی عقیدے کی وجہ سے مسلمانوں نے تاریخِ عالم میں بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے کیونکہ انہیں اللہ کی ذات پر پورا پورا ایمان تھا اور انہیں علم تھا کہ اللہ کے حکم کے علاوہ پوری کائنات میں کسی دوسرے کے حکم کا عمل دخل نہیں ہے۔ نماز، ظاہر اور باطن کی طہارت و پاکیزگی اور بے حیائی اور بُرے کاموں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں نماز کو مسلمان کے دل کا عمرہ یا چھوٹا حج کہا گیا ہے کیونکہ نماز کی پابندی سے دل کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ روزہ اس خاطر ہے کہ مسلمان بھوک پیاس برداشت کرنے کا عادی ہو، خدا پر ایمان رکھنے کا عملی مظاہرہ کرے اور بعض طبی فوائد بھی اسے مل سکیں۔ چنانچہ موٹاپا دور کرنے اور جسم کے فاسد مادے خارج کرنے کے لیے روزہ ایک کیمیا ہے۔ حج اس خاطر ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک مقام پر جمع ہوں اور اپنے اتحاد اور بھائی چارے کی اہمیت محسوس کریں۔ مسلمان اپنے وطن سے محبت رکھتا ہے، مگر حج اسے ہجرت اور ساری دنیا سے محبت رکھنے کے آداب سکھاتا ہے تاکہ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد جانے اور ساری دنیا کو اپنا ایک وسیع تر وطن جانے۔ اسی طرح زکوٰۃ مال کی قربانی سکھاتی ہے۔ تاکہ مسلمان جہاد یعنی جان کی قربانی کے لئے آمادہ رہا کریں کیونکہ جو مال کی قربانی نہ کر سکیں، وہ جان کی قربانی بھی بوقتِ ضرورت نہ دے سکیں گے۔ مال و دولت برے نہیں، مگر ان کی زیادہ محبت انسان کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔ زکوٰۃ کا یہ عمل یہ بات سکھاتا ہے کہ مسلمان اپنے مال کا ایک حصہ محتاجوں کے لیے دیتا رہے۔ اسی سے صدقات کے لئے خرچ کرنے کی اسے تربیت ملتی ہے یہاں تک کہ بوقتِ ضرورت وہ انہیں بنیادی ضرورت سے زائد سارا مال اللہ کی راہ دے ڈالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جو مسلمان اطاعت اور ضبطِ نفس کے مرحلے طے کرنے، وہ ایک تیسرے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی نیابت اور خلافت کا مرحلہ ہے۔ ایسا ہی انسان اللہ کے نائب اور خلیفہ ہونے کا لقب پاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو،

اللہ کی مخلوق اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کرنے لگتی ہے۔ پس اللہ کے نافرمان اور اس کے احکام نہ ماننے والے مسلمانوں کے حاکم بننے اور خلیفہ یا نائبِ خدا کہلانے کے قابل نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اقبالؔ یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ اطاعت اور ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گذرا ہوا انسان اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے قابل رہتا ہے۔ وہ یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی اور ان کی فتوحات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہاں سید علی جلابی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش کے بارے میں ایک واقعہ لکھا اور خودی کی ترقی کے لیے دشمنوں اور مخالفوں سے جہاد کرتے رہنے کی ضرورت بتائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ روسی ترکستان کے علاقہ مَرو کا ایک نوجوان حضرت داتا گنج بخش کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کی التماس کی۔ اس نے کہا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں بے حد تنگ ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اسے نصیحت کی کہ مرد دشمنوں اور مخالفوں کو دیکھ کر گھبرایا نہیں کرتے بلکہ دشمنوں سے مقابلہ کرنا اور انہیں زیر کرنا مردوں کا طریقہ رہا ہے۔ مقابلے اور کشمکش سے ہی 'خودی' کو قوت ملتی ہے۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ اپنی مشکلات کو حل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔ اسی کتاب میں اقبالؔ اپنی قومی روایات اور آداب کو محفوظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ جہاد کے بھی مبلغ ہیں، مگر جہاد غیر مسلموں کی اصلاح کی خاطر ہونا چاہیے یا اپنے دفاع اور بچاؤ کی خاطر۔ فتوحات کی خاطر جہاد کرنا حرام ہے۔ اقبالؔ وقت کی قدر کرنے اور ضروریاتِ زمانہ کا خیال رکھنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔

اس کتاب کی دو تین داستانوں کا علم بھی آپ کو ہونا چاہیے۔ ایک شیروں اور بھیڑوں کی کہانی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ جب کوئی قوم دوسری پر غالب آتی ہے، تو مغلوب قوم حیلوں اور بہانوں سے اس کی قوتِ خودی کو خراب کرنے کا سوچتی ہے۔ مسلمانوں کی مغلوب بعض قوموں نے ایسے ہی کیا اور مسلمانوں کو ان کی 'صفاتِ خودی' سے محروم کرکے رکھ دیا۔ اور اس طرح مسلمان غالب ہونے کی بجائے مغلوب ہوتے گئے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک چراگاہ کی بھیڑیں شیروں کے ہاتھوں عاجز آگئیں۔ شیر ناگہانی حملے کرتے اور بھیڑوں کی

جان لے لیتے ۔ چونکہ وہ چراگاہ بہت عمدہ تھی، اس لئے بھیڑوں نے وہاں سے دوسری جگہ چلے جانے کا نہ سوچا ۔ ایک چالاک بھیڑ نے ایک ترکیب سوچی ۔ اس نے شیروں سے خطاب کرنا شروع کیا ۔ اس نے پیغامبری کا دعویٰ کیا اور شیروں سے کہا کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو بھیڑوں پر ظلم کرنے سے باز آجاؤ ۔ خدا گوشت کھانے والوں اور دوسروں کا لہو پی جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔ تم سبزی اور گھاس کھا کر بھی تو جی سکتے ہو ۔ ہم مظلوموں پر یہ ظلم کب تک روا رکھو گے ؟ ۔ تم طاقت کے ذریعے کمزوروں کو دباتے کیوں ہو ؟ آخر خدا کے ہاں بھی تمہیں جواب دینا پڑے گا ۔ بھیڑ کا وعظ کارگر رہا اور شیروں نے گوشت کھانے اور بھیڑوں پر حملہ کرنے سے توبہ کرلی ۔ اس طرح وہ دیکھنے میں شیر رہے، مگر عملاً بھیڑ بن گئے ۔

ایک داستان ایک پیاسے پرندے اور ہیرے کے ایک ٹکڑے کے مکالمے کی صورت میں ہے ۔ پیاسے پرندے نے ہیرے کے ٹکڑے کو پانی کا قطرہ جان کر چگنا چاہا، مگر ہیرے کے ٹکڑے نے اسے خبردار کہا ۔ "چونچ کی اور معدے کی خیر مانگتے ہو تو ہٹ جاؤ ۔ میں ہیرے کا ٹکڑا ہوں 'قطرۂ آب' نہیں ہوں ۔ میں نے اپنی 'خودی' کی حفاظت کر رکھی ہے ۔ اس لئے کوئی مجھے مٹا نہیں سکتا ۔ مجھ پر جو پرندہ جھپٹا، اس کی چونچ گئی یا جان ۔" چنانچہ پیاسے پرندے کو یہ دعویٰ سن کر وہاں سے پیچھے ہٹ جانا پڑا تھا ۔ بھلا خودی والے کو کوئی کیسے ہاتھ لگاتا ؟ ۔

ایک دوسری داستان میں ہیرے اور پتھر کے کوئلے کا مکالمہ اور گفتگو ہے ۔ پتھر کا کوئلہ ہیرے سے پوچھتا ہے کہ کان میں ہم دونوں ساتھ ہی ہوتے ہیں، مگر باہر نکل کر ہم دونوں میں بہت زیادہ فرق پڑ جاتا ہے ۔ تیرا یہ حسن کہ بادشاہ اپنے تاجوں کو تجھ سے زینت دیتے ہیں ۔ مگر میری سیاہی مجھے انگیٹھیوں اور چولہوں میں پہنچاتی ہے جہاں مجھے جلنے سے کام ہوتا ہے ۔ ہم میں اس قدر فرق کیوں ہے ؟ ۔ ہیرے نے کہا کہ بات اتنی ہے کہ میں سخت ہوں اور تو نرم ۔ سخت چیز دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے اور نرم چیز سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور بس ۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مثنوی 'اسرار خودی' میں دینی تعلیمات کے ساتھ ساتھ سیاسی تلقینات بھی ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے لئے دین اور سیاست ایک ہی ہیں۔

۲۔ رموزِ بیخودی ۔ رموز بیخودی یعنی بیخودی کے راز۔ یہ اسرار خودی کا دوسرا حصہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بھی مثنوی کی صورت میں ہے۔ یہ سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی اور اس کے ساتھ ایک مختصر اردو مقدمہ بھی تھا جسے دوسری اشاعت سے حذف کر دیا گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسرار خودی کی تیسری اور رموز بیخودی کی دوسری اشاعت کے وقت اقبال نے انہیں ایک کتاب بنا دیا اور اس کا نام 'اسرار و رموز' رکھ دیا۔ اب انہیں مختصر طور پر 'اسرار و رموز' کہا جاتا ہے

'بیخودی' بھی 'خودی' کی طرح اقبال کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ اس کے معانی ہیں فرد کے معاشرے کے کام آنا۔ 'خودی' کی تربیت کا پروگرام آپ کو معلوم ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ جب انسان اپنی خودی کو ترقی دے دے، تو اسے اس سے دوسروں کو بھی فائدہ دینا چاہیے۔ اقبال دراصل ایک مسلمان کا پروگرام پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت سے دوسرے مسلمانوں کے کام کس طرح آسکتا ہے۔

شروع میں وہ فرد اور قوم کا تعلق بتاتے ہیں۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں توحید، رسالت اور ختم نبوت کی بڑی اہمیت ہے۔ اقبال ان امور کی وضاحت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تصور توحید، فرد کی طرح قوم کو بھی خوف و غم سے پاک رکھتا ہے۔ رسالت محمدیؐ میں عقیدہ ختم نبوت بھی موجود ہے۔ ختم نبوت کا مدعا یہ ہے کہ نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینِ اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ ہدایت قرار دے دیا گیا اور اس دین کے لانے والے پیغامبر، سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی قرار پائے۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک بے حد ہمت افزا بات ہے۔ رسالتِ محمدیؐ نے انہیں متحد اور متفق قوم بنا دیا اور ختم نبوت کے عقیدے نے انکے اتحاد کی ضمانت دے دی اور نئی نبوتوں کے فتنوں سے بچا لیا۔ لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ توحید اور رسالت کے تقاضوں کے مطابق ایک متحد قوم بنیں اور اپنی ذمہ داریوں

کو تیا ہیں۔ اقبال یاد دلاتے ہیں کہ مسلمانوں کا آئینِ حیات قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے اور چونکہ قرآن مجید کی حفاظت خدا نے اپنے ذمے لی ہے، لہٰذا اس پاک کتاب کے ماننے والے بھی خدا کی حفاظت میں رہیں گے۔ مسلمانوں کا وجود دائمی رہے گا اور وہ کسی خاص وطن سے بھی منسلک نہیں ہیں بلکہ ان کا وطن ہر کہیں ہے۔ نبی اکرمؐ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر آئے تھے۔ اس ہجرت کی وجوہات سیرت رسولؐ اور تاریخوں میں جو بھی لکھی ہوئی ہوں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ محدود وطنیت کے تصور کے خلاف مسلمانوں کو ایک نمونہ فراہم کرنے کے لئے رسول اللہؐ نے ایسے کیا تھا۔ یعنی پیغامبرِ اکرمؐ نے یہ عملی تعلیم دی کہ مسلمانوں کا کوئی محدود اور معین وطن نہیں ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا مرکز کعبہ شریف ہے لہٰذا مسلمانوں کی متحد کوششوں کا مرکز ہمیشہ اسی مقدس مقام کو رہنا چاہیے کیونکہ جس قوم کا کوئی مرکز نہ ہو وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ اقبال زندگی کے نئے مسائل کے بارے میں اجتہاد اور جدت کے قائل تھے مگر کہتے ہیں کہ دینی امور میں جدت اور اجتہاد کرنے کے لئے مناسب ماحول کا موجود ہونا ضروری ہے۔ خراب حالات میں یہی بہتر ہے کہ مسلمان اجتہاد کرنے کے بجائے اپنے پرانے بزرگوں کے طریقے کی پیروی کرتے رہیں۔ دینِ اسلام کی بڑی اجتماعی خصوصیات اقبال کے نزدیک تین ہیں۔ انہیں اخوت، حریت اور مساوات کہتے ہیں۔ اقبال نے انہیں ایک ایک تاریخی واقعے کی مدد سے واضح کیا ہے۔

اخوت یعنی بھائی چارا۔ مقصد یہ کہ اسلامی معاشرے میں سب مسلمانوں کے حقوق بھائیوں کے سے ہیں اور عہدہ یا مرتبہ سے قطعِ نظر ہر کوئی صاحبِ حیثیت اور ذمہ دار ہے زیادہ محترم وہی ہے جو خدا ترس اور تقویٰ میں دوسروں سے آگے ہو۔ اقبال ایک تاریخی واقعہ نقل کرتے ہیں۔ آپ کو علم ہوگا کہ ایران کی فتح کے سلسلے میں عرب مسلمانوں کو ایرانیوں سے کئی جنگیں لڑنا پڑی تھیں۔ آخری جنگ وہ تھی جس میں ایرانی بادشاہ یزدگرد سوم شکست کھا کر بھاگ گیا اور مسلمان ایران پر قابض ہو گئے۔ اس جنگ میں ایرانی فوج کا کمانڈر جابان گرفتار ہو گیا۔ اس نے ایک مسلمان سپاہی سے جان کی امان کا قول اور وعدہ لے لیا۔

مسلمان سپاہی کو جابان کی کیفیت معلوم نہ تھی کہ وہ کون ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ اس قیدی کی جان کی حفاظت کی جائے گی۔ مسلمانوں کی فوج کے سالار حضرت ابو عبیدؓ تھے۔ جنگ کے بعد جب مسلمانوں کو جابان کے قید ہو جانے اور دھوکے اور جھوٹ سے اپنی جان بچا لینے کا علم ہوا تو انہیں بے حد غصہ آیا۔ انہوں نے حضرت ابو عبیدؓ سے التماس کی کہ اگرچہ جابان کی غلط بیانی کی بنا پر ایک مسلمان سپاہی نے اسے پناہ دے دی ہے مگر اسے قتل کر دینا چاہیے۔ مگر حضرت ابو عبیدؓ نے یہ بات نہ مانی۔ فرمایا: مسلمانوں میں اخوت قائم ہے اور ایک کا وعدہ سب کا وعدہ ہے۔ جابان نے بے شک اپنی پوزیشن چھپائی ہے، مگر چونکہ ہمارے ایک مسلمان بھائی نے اسے پناہ دے دی ہے، لہٰذا ہم اس کا خون نہیں بہائیں گے۔

اس کے بعد اقبال مساوات اسلامی کی بحث کرتے اور تاریخی واقعے سے ایک مثال نقل کرتے ہیں۔ 'مساوات' یعنی برابر ہونا۔ اقبال یہاں معاشرتی اور قانونی مساوات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ معاشی مساوات ایک غیر فطری اور غیر عملی بات ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید ایک ایسا آئین ہے جس کے سامنے ادنیٰ اور اعلیٰ سب جوابدہ ہیں۔ چنانچہ سلطان مراد عثمانی اور ایک معمار کا واقعہ معروف ہے۔ سلطان نے خجند کے علاقے میں ایک مسجد بنوانے کا اہتمام کیا۔ مگر مسجد کی عمارت دیکھ کر وہ بے حد غصے میں ہو گیا کیونکہ وہ اس کی ہدایات کے مطابق نہ بنی تھی۔ غصے میں اس نے معمار کا ہاتھ کٹوا دیا۔ معمار نے اس ظلم کے خلاف قاضیِ شرع کے پاس دعویٰ کر دیا اور اس نے بادشاہ کو عدالت میں طلب کر لیا۔ بادشاہ کو علم تھا کہ شریعتِ اسلامی کے مطابق اس کا ہاتھ بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ اس نے ہاتھ کٹوانا منظور کر لیا تاکہ اپنے گناہ کی تلافی کر لے، مگر آخری وقت میں معمار نے اسے معاف کر دیا کیونکہ شریعت میں گناہ معاف کر دینے کی بھی تلقین ہے۔ بہر حال، اس واقعہ کی روشنی میں مساواتِ اسلامی کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت کی رو سے چھوٹے بڑے سب قانون کے سامنے برابر ہیں۔

'حریت' آزادی کو کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح موجودہ جمہوریت کی اصطلاح کے قریب تر ہے۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان معاشرے میں اظہار خیال اور اظہار مقصد کی آزادی ہوتی ہے، اور کوئی ناروا بات اگر زبردستی منوائی جائے تو مسلمان اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اقبالؔ تاریخِ اسلام کے مشہور واقعے، واقعہ کربلا کی رو سے مثال فراہم کرتے ہیں۔ ہوا یہ کہ یزید زبردستی اپنی خلافت کی بیعت لے رہا تھا مگر اس میں خلافت کے مقام پہ فائز ہونے کی کوئی بھی اچھی خصوصیت موجود نہ تھی۔ اس لئے نبی اکرمؐ کے چہیتے نواسے اور حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ کے جگر گوشے حضرت امام حسینؓ نے پرچم حریت کو بلند کیا۔ انہوں نے اور ان کے بہتر ساتھیوں نے میدانِ کربلا میں جان قربان کر دی۔ مگر باطل قوتوں کے سامنے نہ جھکے۔ حضرت امام حسینؓ نے تعلیمِ حریت کی ایک ایسی مثال پیش کر دی جو کبھی فراموش نہ ہوگی۔ یہاں واقعۂ کربلا لکھتے وقت اقبالؒ نے حضرت امام حسینؓ کو جو نذرانۂ عقیدت پیش کیا، وہ فارسی ادب میں آپ اپنی مثال کہلانے کا مستحق ہے۔

اس مثنوی میں آگے اقبالؔ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے ماضی کے واقعات یاد رکھنے چاہییں کیونکہ ماضی سے کٹی ہوئی قوم اپنے حال کو بہتر بنا سکے گی نہ مستقبل کو۔ ان کے نزدیک توحید کی نشر و اشاعت اور تسخیر کائنات کی کوششیں مسلمانوں کا قومی نصب العین ہونا چاہیے یعنی مسلمان پیغامِ اسلام کو ہر کہیں پہنچائیں اور سائنسی علوم و فنون میں بھی دوسروں سے آگے رہنے کی کوشش کریں۔ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کائنات کے مطالعے اور مشاہدے کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ اس دین نے ہر قسم کی دنیوی ترقی کے امکانات بنا دئے ہیں۔ پھر بھی اگر مسلمان دوسروں کے دست نگر رہیں، تو یہ ایک افسوسناک بات ہوگی۔

اس مثنوی میں 'آئینِ الٰہی' اور 'آدابِ محمدیؐ' کے عنوانات کے تحت اقبالؔ نے چند ایمان افروز نکتے بیان فرمائے ہیں۔ پہلی بات وہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حقیقی اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ عجمیوں یعنی غیر عربوں نے اسلام میں عجیب عجیب باتیں داخل کر دی ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حقیقی اسلام حرکت، جدّ و جہد اور ترقی کی تعلیم دیتا ہے۔ علامہ مرحوم، حضرت شیخ احمد رفاعی بغدادی کی یہ

نصیحت نقل کرتے ہیں کہ حقیقی اسلام عربوں سے سیکھو کیونکہ عجمیوں کا اسلام، اکثر غیر متعلق اور بے کار باتوں سے بھرا پڑا ہے۔ دوسری بات اقبال یہ سمجھاتے ہیں کہ نبیؐ اکرمؐ کی محبت اور ان کے آداب اور ہدایات پیشِ نظر رکھ کر ہی مسلمان اعلیٰ اخلاق کا نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ وہ اخلاق جو سنتِ رسولؐ اور عشقِ نبیؐ سے روشنی حاصل نہ کرے، مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سنوار نہیں سکتا۔ یہاں اقبالؔ اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

ایک دن کوئی گداگر ان کے گھر پر آگیا۔ اقبال نے معذرت کر کے اسے ٹالنا چاہا، مگر وہ نہ ٹلا اور بار بار صدائیں دیتا رہا۔ اقبال کو غصہ آگیا۔ انہوں نے سائل کی پٹائی کر دی۔ اس بیچارے نے گداگری سے جو کچھ اکٹھا کر کے اٹھا رکھا تھا، وہ آٹا دانہ بھی زمین پر جا گرا۔

اقبال نے اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ آغازِ جوانی میں انسانی عقل غلط اور صحیح کام کی تمیز نہیں کر سکتی اس لئے اس عمر میں ان سے اس گناہ کا ارتکاب ہو گیا اور ان کے والد کو بھی اس بات کا پتہ چل گیا۔ علامہ مرحوم یہاں اپنے باپ کی ان دردمند اور غمناک باتوں کو شعر کی زبان میں بیان کر رہے ہیں جو انہوں نے اس واقعے کو سن کر کہی تھیں۔ وہ زار و قطار رو رہے تھے اور نرم انداز میں یوں فرما رہے تھے:

"بیٹا۔ قیامت کے دن نبی اکرمؐ کے حضور امتِ مسلمہ کا اجتماع ہوگا۔ وہاں صحابی، شہید، غازی، عاشقِ رسولؐ، عالم و فاضل اور گناہ گار سب ہی ہوں گے۔ میں اور تم بھی وہاں ہوں گے۔ بیٹا میری یہ سفید ڈاڑھی دیکھو کہ تیری اس حرکت کی بنا پر میں وہاں کیا منہ دکھاؤں گا؟ میں یہاں رو رہا ہوں اور وہاں بھی روؤں گا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی سوال فرمائیں تو میں کیا جواب دوں گا؟ اگر پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے ایک جوان بیٹا عطا کیا تھا، لیکن تو نے پیکرِ خاکی کو انسانیت کے لباس سے کیوں آراستہ نہ کیا، تو میں کیا جواب دوں گا؟ نبی اکرمؐ اگر پوچھیں کہ تو نے اپنے بیٹے کو میرے

مکتبِ اخلاق سے کیا حصّہ دیا ہے، تو میں لاجواب رہوں گا۔ بیٹا، تو باغِ مصطفیٰؐ کا ایک پھول ہے۔ تجھ میں اسی باغ کے پھولوں کی خوشبو ہونا چاہیے تھی مگر تو نے بڑھے باپ پر آج قیامت ڈھادی ہے۔ محمد مصطفیٰؐ کی امت کے جوانوں کا یہ اخلاق ہو گیا کہ گداگروں اور سائلوں سے ہمدردی نہ کریں اور ان پر یہ ظلم روا رکھیں؟" غرض اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ان کے والد رو رو کر انہیں اسی طرح ملامت کرتے رہے، اور اس ملامت کو علامہ مرحوم عمر بھر نہ بھولے۔ باپ کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی آخری فارسی تصنیف میں خدا سے یہ التماس کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کا حساب کتاب نبی اکرمؐ کے سامنے نہ لیا جائے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے اخلاق کے حوالے سے جب کسی مسلمان کو اپنی گناہ گاری کا احساس ہو جائے تو وہ جلد سنبھل جائے گا بشرطیکہ اس کے سینے میں عشقِ رسولؐ کا جوش موجود ہو۔

مثنوی رموز بیخودی میں اقبال نے عورتوں کے مقام و مرتبے سے بھی بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ماں ہونے کی حیثیت سے عورت کا مرتبہ بے حد بلند ہے۔ وہ انسانی نسل کی بقا کی ضامن ہی نہیں، اس نسل کی تربیت کا زیادہ کام بھی اسی کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ذات مسلمان عورتوں کے لئے ایک نمونہ ہے۔ انہوں نے شوہر کی اطاعت، اولاد کی تربیت اور عام گھریلو زندگی گزارنے کے سلسلے میں بے نظیر نمونے فراہم کئے ہیں۔ اقبالؒ مسلمان عورتوں سے کہتے ہیں کہ وہ حضرت فاطمہؓ کی پیروی میں اولاد کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دیں تاکہ مسلمان معاشرہ بہتر انسانوں سے بہرہ مند ہوتا رہے۔

کتاب کے آخر میں اقبالؒ سورہ اخلاص کی تفسیر پیش کرتے ہیں اور اسے وہ مثنوی کے مطالب کا خلاصہ قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں ایک خواب میں بتائی ہے۔ سورہ اخلاص، قرآن مجید کی ۱۱۲ ویں سورت ہے اور اس کی آیات کا اردو ترجمہ یوں ہے: "کہو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ

کسی نے اس کو جنم دیا اور نہ اس نے کسی کو جنم دیا ہے اور اس کی ہمسری اور برابری والا کوئی نہیں ہے۔" اقبالؔ فرماتے ہیں کہ 'قل ھو اللہ احد' سے مسلمانوں کو اتحاد کی تعلیم ملتی ہے۔ 'اللہ الصمد' سے مسلمان اللہ کے سوا دوسروں سے بے نیازی برتنا سیکھتا ہے۔ اسی بے نیازی کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ حضرت امام مالکؒ نے خلیفہ وقت ہارون الرشید عباسی کی یہ پیشکش ٹھکرا دی کہ وہ مدینہ منورہ ترک کر کے ایک بڑی تنخواہ پر بغداد آجائیں اور اس دار الخلافہ میں درس حدیث دینے لگیں۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا تھا کہ محمد مصطفیٰؐ کے غلام کو ان کے قرب کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ 'لم یلد ولم یولد' سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ مسلمان ایک عالمی برادری ہیں اور انہیں رنگ و نسل سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسی طرح آیت 'ولم یکن لہ کفواً احد' مسلمانوں کو ایک ممتاز اور بے نظیر قوم بننے کی تلقین کرتی ہے۔ اقبالؔ فرماتے کہ سورہ اخلاص کے تقاضے یہ ہیں کہ مسلمان متحد رہیں، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنیں، اپنے ہر قسم کے اختلافات مٹا دیں اور اپنی غالب و طاقتور حیثیت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

۳- پیام مشرق ۔ اقبالؔ کی یہ تیسری فارسی کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ پیام مشرق یعنی سرزمینِ مشرق سے ایک پیام۔ جرمنی کے ایک مشہور شاعر کا نام گوئٹے ہے۔ وہ ۱۸۳۲ء میں فوت ہوا تھا۔ اس نے 'مغربی اور مشرقی دیوان' کے نام سے اپنے اشعار کا ایک خوبصورت مجموعہ پیش کیا تھا۔ اس مجموعے میں وہ اسلامی تعلیمات اور ایران کے فارسی شاعروں کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی اس کے محبوب شاعروں میں سے ہے۔ اقبالؔ نے یہ کتاب گوئٹے کے اسی دیوان کے جواب میں لکھی ہے۔ لیکن جواب سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اقبالؔ نے گوئٹے کی باتوں کی مخالفت کی ہے۔ گوئٹے وہ شاعر ہے جس نے جرمنوں کو غفلت اور زوال کی نیند سے جگایا اور انہیں بیداری اور ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ اقبالؔ نے بھی مسلمانوں کو اسی طرح بیدار کیا ہے۔ لہٰذا گوئٹے اور اقبال ایک جیسے شاعر ہیں۔ گوئٹے کو حکیمِ حیات یعنی زندگی کے آداب سکھانے وال

فلسفی کہتے ہیں۔ اقبال بھی حکیم حیات اور شاعر حیات ہیں۔ پیام مشرق میں اقبال نے اپنے قارئین کو گوئٹے کے خیالات سے آگاہ کیا اور انہوں نے گوئٹے کی تائید میں اہل مغرب کو ایک پیغام بھی دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مغرب سے مراد یورپ اور امریکہ کے براعظم ہوتے ہیں اور مشرق سے زیادہ تر مراد براعظم ایشیا ہوتا ہے۔ اقبال نے اسی مناسبت سے اپنی کتاب کا نام 'پیامِ مشرق' رکھا اور آپ جانتے ہیں کہ اقبال کو شاعر مشرق بھی کہتے ہیں۔

'پیام مشرق' کے شروع میں اردو میں ایک مقدمہ ہے۔ مقدمے میں اقبال نے تین باتیں لکھی ہیں۔ ایک تحقیقی بحث اس بارے میں ہے کہ جرمن ادبیات پر فارسی ادب کے کیا اثرات ہیں اور گوئٹے نے فارسی شاعروں خصوصاً خواجہ حافظ سے کیا اثر لیا ہے اقبال چونکہ جرمن زبان اور ادب سے آگاہ تھے، اس لئے انہوں نے بڑی باریک تحقیقی باتوں کی ہمیں خبر دی ہے۔ دوسری بات وہ یہ لکھتے ہیں کہ گوئٹے نے پیام مشرق سے کوئی سو سال قبل جب 'مغربی اور مشرقی دیوان' مرتب کیا، تو اس وقت کے جرمنی کے حالات ایسے ہی تھے جیسے موجودہ مشرق کے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی گوئٹے کی طرح کوشش کریں گے کہ سرزمین مشرق کے لوگ بھی بیدار ہوں۔ تیسری بات وہ یہ لکھتے ہیں کہ جب دل تبدیل ہوتے ہیں، تو دنیا بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ قرآنِ مجید میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے دل اور ضمیر کو نہ بدلیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے کوشش کر رہے ہیں کہ مشرق کے لوگوں (خصوصاً "مسلمانوں") کے ضمیر بدل کر ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے برصغیر کے لوگوں کو گوئٹے کے نام اور اس کے پیغام سے آشنا کیا۔

مقدمے کے بعد کتاب کا فارسی متن شروع ہوتا ہے۔ کتاب کا انتساب افغانستان کے معاصر بادشاہ 'امان اللہ خان' کے نام ہے۔ اقبال اس بادشاہ کی ترقی کی کوششوں سے اس وقت خوش تھے۔ وہ بادشاہ کو عالم اسلام کے زوال کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ قومیں جب حق و باطل کی تمیز ترک کر دیں تو صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ وہ فرماتے

ہیں کہ مسلمان حاکم کو چاہیے کہ خلفائے راشدینؓ کے عہد کا سا عدل و انصاف برتے۔ حکومت دراصل خدمت کا نام ہے۔ سلطان مراد عثمانی کا ذکر مثنوی رموزِ بیخودی میں آچکا۔ وہ ایک بہت بڑا بادشاہ ہوتے ہوئے بھی درویشانہ زندگی گذارتا رہا۔ حضرت سلمان فارسیؓ مدائن کے گورنر تھے مگر ان کا سارا اثاثہ قرآن مجید اور ایک تلوار تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ حکومت ٹھاٹھ باٹ اور رعب و داب کا نام نہیں یہ ایک درویشانہ خدمت ہے مگر اس خدمت کے اہل عاشقانِ رسولؐ ہی ہوتے رہے ہیں۔

کتاب کو اقبال نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ دو سینتیوں بار رباعیوں کا ہے۔ دوسرے کا نام افکار ہے اور تیسرے میں غزلیات ہیں۔ چوتھے حصے میں اہل مغرب کے نام پیغام ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک ایک دو دو شعروں میں بعض لطیف نکتے بیان ہوتے ہیں۔ 'پیامِ مشرق' کو اقبال کا ایک مکمل دیوان کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں شاعری کی تقریباً ساری اقسام اور اصناف کے نمونے موجود ہیں۔ علامہ مرحوم نے یہاں جدید شاعری کے کامیاب نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ اب آپ 'پیامِ مشرق' کے چاروں حصوں کی بعض اہم باتوں پر توجہ دیں گے۔

پہلے حصے کا نام لالۂ طور رکھا گیا ہے۔ کوہ طور اور وادئ سینا کا آئینہ بنا ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے باری تعالیٰ کی ذات کے جلوے دیکھے تھے۔ لالہ کے پھول کو بھی آپ جانتے ہیں کہ وہ دل کے سوز اور تپش کی نمائندگی کرتا ہے۔ 'کوہِ طور کے لالہ' کی مناسبت سے اقبال نے اپنی رباعیوں کے سوز اور حرارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رباعیوں کی تعداد ۱۶۳ ہے۔ ہم یہاں چند رباعیوں کا ترجمہ اور مفہوم لکھتے ہیں۔

رباعی ۱۴۔

تو اپنے خاکی جسم کو اتنا مضبوط بنا کہ پختہ قلعوں کو اس پر رشک آنے لگے۔ لیکن اس جسم میں دل ایسا ہو جو دوسروں کے دکھ درد کا احساس کرے۔ پہاڑ کے پہلو میں ندیاں بہتی رہتی ہیں۔ تو بھی مضبوطی کے ساتھ ساتھ ایسی ہی نرمی رکھ۔

رباعی ۳۶۔

زندگی ہر لمحہ نئے نئے انقلاب لاتی ہے۔ اسے ایک حالت میں رہنا منظور نہیں ہے ایسی صورت میں اگر تیرے کل اور آج میں کوئی فرق نہ ہو تو جان لے کہ تو زندگی کی حقیقی حرارت سے محروم ہو چکا ہے۔

رباعی ۵۰۔

تیرے دل کو موت کا خوف کھائے جا رہا ہے۔ اس خوف سے تیرا رنگ ہلدی کی طرح ہو رہا ہے۔ تجھے چاہیے کہ اپنی خودی کو مضبوط کرو۔ اگر خودی مضبوط کر لی جائے تو آدمی مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔

رباعی ۷۶۔

اپنے پاؤں کے ساتھ تقدیر کی زنجیریں باندھ کر نہ بیٹھے رہو۔ اس آسمان کے نیچے راستوں کی کمی نہیں۔ تم جب بھی گھوڑا دوڑانے کا عزم کرو تو میدانوں کی کمی سے دو چار نہ ہو گے۔

رباعی ۸۳۔

ہم مسلمان ہیں اور افغان، ترک یا تاتار نہیں ہیں۔ ہم ایک ہی چمن میں پیدا ہوئے اور ہماری شاخ بھی ایک ہے۔ ہمیں دینِ اسلام کی ایک ہی بہار نے پالا پوسا، اس لیے کسی طرح کی نسل یا رنگ کا امتیاز کرنا ہمارے لیے بالکل ناجائز ہے۔

رباعی ۹۶۔

دل، بے خوف ہو تو بھیڑ، ببر بن جائے مگر خوف زدہ دل کے لیے ہرن ایک چیتا ہے۔ تو نہ ڈرے تو سمندر خشکی کی طرح ہے اور ڈرنے لگے تو اس کی ہر لہر میں مگر مچھ نظر آنے لگیں گے۔

افکار کے عنوان والے دوسرے حصے میں کئی موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں اور اکثر نظموں میں بالکل نئے خیالات ہیں۔ اقبالؔ اس نکتے پر بار بار توجہ دلاتے ہیں کہ اس دنیا میں سب سے اہم چیز انسان ہی ہے۔ وہ انسان کو اس کے وجود اور خودی کا احساس دلاتے ہیں۔ 'پیامِ مشرق' میں انہوں نے خدا اور انسان کا ایک مکالمہ لکھ کر اس بات کو واضح

کیا ہے۔ اس مکالمے میں خدا انسان سے کہتا ہے۔ میں نے ایک زمین بنائی اور تُو نے اُسے چھوٹے بڑے ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ میرے پیدا کئے ہوئے فولاد اور لوہے سے تُو نے طرح طرح کے ہتھیار بنائے۔ میں نے درخت بنائے اور تو نے انہیں کاٹنے کے لیے کلہاڑی اور آرہ۔ میں نے پرندے پیدا کیے اور تو نے انہیں قید کرنے کے لئے پنجرے بنائے' خدا کے جواب میں اقبال انسانی فضیلتیں اس طرح بتاتے ہیں: خدایا! تیری رات کو میں نے چراغوں سے روشن کیا۔ تیری مٹی سے میں نے خوشنما برتن بنائے۔ تو نے صحرا و جنگل پیدا کئے تھے میں نے وہاں مکان اور باغ بنا ڈالے۔ میں نے پتھر سے شیشہ بنایا اور زہر سے تریاق بنا ڈالا۔ جو زہر کا علاج ہے' اس مکالمے کے ذریعے اقبال انسان کے کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چند نظموں میں اقبال نے پروانے، جگنو، ستاروں، شاہین، شبنم، موسم بہار اور خوشبو کے بارے میں اپنے لطیف مشاہدات بیان کئے ہیں۔ پروانہ' روشنی کا عاشق ہے اور جلتے ہوئے چراغوں پر اپنی جان دے دیتا ہے۔ اقبال کو اس کا جوش پسند ہے۔ مگر وہ اپنی روشنی کا نہیں، دوسروں کی روشنی کا شیدائی ہے اس لئے جگنو بہتر ہے جس کی روشنی اپنی ہے' اور وہ کسی غیر کی روشنی پر اپنی خودی قربان نہیں کرتا' اقبال نے باز، شکرے، عقاب یا شاہین کی کئی جگہ تعریف کی اور اس پرندے کی ہمت اور بلند پروازی کو سراہا ہے۔ اقبال مسلمان نوجوانوں کو شاہین کا سا بلند پرواز' عالی ہمت اور چاق و چوبند دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ یہاں ایک نظم میں شاہین اپنے بچے کو نصیحت کر رہا ہے کہ وہ پست ہمت پرندوں سے الگ رہے اور اپنی جفاکش زندگی کی قدر کرے ایک دوسری نظم میں ایک چھوٹی مچھلی اور بچہ شاہین کی گفتگو ملتی ہے۔ بچہ شاہین' ایک ایک دن سمندر کی تہ پر بیٹھا اور ایک چھوٹی مچھلی سے گفتگو کرنے لگا۔ مچھلی نے اسے سمندروں کی لہروں اور مگر مچھوں کے حملوں کا بتایا۔ اس نے کہا کہ مچھلی بڑی ہمت والی ہے کہ سمندر کے سارے حادثے برداشت کر کے زندہ رہتی ہے۔ بچہ شاہین نے اس کی گفتگو سن کر پَر سنبھالے اور فضائے آسمانی کی طرف نکل گیا ہے

صحراست کہ دریاست تہ بال و پر ماست   زد بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمین چیست

یعنی شاہین نے آواز دی اور اپنا تعارف کروایا۔ کہنے لگا کہ وہ شاہین ہے اور اسے زمین سے کوئی مطلب نہیں۔ زمین ہو کہ سمندر، سب کچھ شاہینوں کے پروں کے نیچے رہتا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں غزلیات ہیں۔ اقبال نے ان کا نام 'مئے باقی' رکھا ہے۔ 'مئے باقی' کی ترکیب خواجہ حافظ شیرازی نے ایک شعر میں استعمال کی تھی اور اس کا مطلب ہے نشہ اور مستی قائم رکھنے والی شراب۔ اقبال نے ان ۴۵ غزلوں میں ایسی باتیں بیان کی ہیں جن کی شیرینی اور مستی دائمی ہے، اس لئے انہیں 'مئے باقی' کہا ہے۔ ان غزلوں میں فارسی غزل کی روایات کی پابندی موجود ہے، مگر کسی قدر ان روایات سے آزادی بھی ہے۔ مثلاً اقبال غزل کے آخری شعر میں جسے مقطع کہتے ہیں، اپنا تخلص بہت کم لاتے ہیں۔ غزل میں شاعر تغزل لاتے ہیں۔ یعنی عشق و عاشقی کی باتیں کرتے ہیں، محبوب اور دوسری حسین چیزوں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے دل کی کیفیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ کام اقبال نے بھی کیا ہے مگر بہت تھوڑا۔ اقبال ایک صاحبِ پیغام شاعر ہیں، اس لئے وہ حسن و عشق کے بیان کو طول نہیں دیتے۔ ان کی ہر غزل میں بیداری، جفاکشی اور انقلاب کا پیغام موجود ہے۔ یہی باتیں اقبال کی غزلوں کو دوسرے فارسی شاعروں کی غزلوں سے ممتاز کرتی ہیں، ورنہ زبان و بیان کی مٹھاس کے اعتبار سے اقبال فارسی کے بڑے سے بڑے شاعروں کی صف میں شامل ہیں۔ عاشقانہ مضامین کے لحاظ سے ان کے شعروں اور فارسی کے استاد شاعروں کے کلام میں کافی حد تک نزدیکی نظر آتی ہے، مگر اقبال کی کوئی ایک غزل بھی دینی یا سیاسی رنگ کے اشعار سے خالی نہیں۔ یہی بات اقبال کا خاص اسلوب ظاہر کرتی ہے۔ اشعار کی تعداد اقبال کے نزدیک کوئی اہم بات نہیں ہے۔ اُن کی غزلوں میں ۳ سے ۱۰ تک شعر نظر آتے ہیں۔ اقبال کی فارسی غزل پر مزید بحث 'زبورِ عجم' کے بیان میں دیکھیں۔

'پیامِ مشرق' کا چوتھا حصہ 'نقشِ فرنگ' کہلاتا ہے۔ پہلی نظم 'پیغام' ہے۔ اپنے پیغام میں اقبال، مغرب کے لوگوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مادیت کے ساتھ ساتھ روحانیت کو بھی اپنائیں۔ اقبال کے نزدیک عقل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک 'عقلِ خود بیں' ہے یعنی خود بینی، مادیت اور غرور سکھانے والی عقل۔ دوسری کو تو 'عقلِ جہاں بیں'

کہتے ہیں یعنی دنیا کے مسائل پر غور کرنے والی عقل۔ اس دوسری عقل کو وہ 'عشق' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں اقبال اہلِ مغرب کو کہتے ہیں کہ یہ دوسری عقل اپنائیں، دنیا کے کاموں کو دین کی روح سے جدا نہ کریں اور نوعِ انسان کو ایک برادری جانیں ورنہ ان کی سائنسی ترقیوں سے انسانوں کو بہت کم فائدہ ہوگا۔ اس حصے میں اقبال نے مشرق اور مغرب کے بعض اہم مفکروں اور فلسفیوں کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ ایک دو نظمیں سرمایہ داروں کی مخالفت اور مزدوروں کی حمایت میں بھی ہیں۔ وہ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ سرمایہ داروں کی دولت اور نفع سے محنت کشوں کو بہت کم حصہ ملتا ہے کتاب کے سب سے آخری حصے کے نکات کے نمونے ذیل کے چند ترجمہ کئے ہوئے حصوں سے واضح ہو جائیں گے۔

نکتہ ۵۔

سبزے، چلتے پانی اور حسین چہرے کو دیکھنے سے نظر تیز ہو جاتی ہے۔ ریشمی لباس پہننے، بے غم رہنے اور خوشبو سونگھنے سے موٹاپا آجاتا ہے۔

نکتہ ۹۔

اگر تجھ میں معاف کر دینے کی صلاحیت نہیں تو دشمنوں سے جنگ کر کے انتقام لے لے۔ مگر دل کو کینے اور دشمنی کا کارخانہ نہ بنا اور اپنے شہد میں سرکہ نہ ملا۔

نکتہ ۱۳۔

ڈاڑھی اور ابروؤں کو وسمہ اور خضاب لگانا چھوڑ دو۔ جوانی، سال و ماہ چرا کر نہیں مل سکتی۔

نکتہ ۱۴۔

پست ہمت والے عشق نہیں نباہ سکتے۔ شاہین کسی مردہ چکور کو نہیں کھاتا۔

نکتہ ۱۶۔

کتنا اچھا ہے کہ آدمی قدیم رسوم سے آزاد ہو سکے اور لگے بندھے رواج ترک کر سکے۔ اگر تقلید اور پیروی اچھی بات ہوتی تو نبی اکرمؐ بھی اپنے باپ دادا کے طریقوں

پر چلے ہوتے۔

۴۳ تا ۸۱ - زبورِ عجم - زبورِ عجم میں دو مستقل مثنویاں بھی شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب تین کتابوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ زبور ایک الہامی کتاب کا نام ہے۔ اس نام کی کتاب حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی تھی۔ زبورِ داؤدؑ بھی شعر میں ہے اقبال نے اپنے اس شعری مجموعے کو 'زبورِ عجم' یعنی فارسی کی زبور کہا ہے۔ اصل کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ۵۶ اور دوسرے حصے میں ۷۵ غزلیں یا غزل نما نظمیں ہیں۔ پہلے حصے میں شاعر کا خطاب خدا سے ہے اور دوسرے میں انسان سے دونوں حصوں میں پڑھنے والوں سے خطاب اور سرنامے کے شعر ہیں۔ اسکے علاوہ پہلے حصے میں ایک دعا بھی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ؎

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤدؑ برفروز ہر ذرّہ مرا پر و بالِ شرر بدہ

یعنی خدایا، میرا وجود نغمۂ داؤدؑ کے نور سے دمک اٹھے اور میرے جسم کے ہر ذرّے میں سے چنگاریوں کے پر و بال نکلنے لگیں۔ حضرت داؤدؑ بہت زیادہ خوش الحان تھے اور ان کی آواز بے حد دل پذیر تھی۔ اقبال بھی خوش الحانی کے طالب اور ایک دل پذیر آواز کے آرزومند ہیں۔ خدا نے ان کی دعا کو گویا شرفِ قبولیت بھی بخشا تھا کیونکہ یہ کتاب اب بھی اہلِ ذوق لوگوں کے دل موہ لیے جا رہی ہے۔ اقبال کو بجا طور پر اس کتاب پر ناز تھا۔ 'بالِ جبریل' میں فرمایا:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ 'زبورِ عجم' فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

مقصد یہ کہ اہلِ ذوق لوگ اگر خلوت و تنہائی میں زبورِ عجم پڑھیں تو انہیں زیادہ سرور ملے گا اور نئے نئے نکتوں سے آگاہ ہوں گے۔ یاد رہے کہ 'زبورِ عجم' غزلیات کے مذکورہ دو حصوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کتاب کے ساتھ 'گلشنِ رازِ جدید' اور 'بندگی نامہ' نام کی مثنویوں کی حیثیت جداگانہ ضمیموں کی ہے۔ یہ مثنویاں چونکہ مختصر تھیں، اقبال نے انہیں زبورِ عجم کے ساتھ شائع کروا دیا، ورنہ ان کے اور زبورِ عجم کے مضامین میں کوئی خاص جوڑ نہیں ہے۔

زبورِ عجم فارسی غزل اور اقبالؔ کی فارسی غزل دونوں کا انتہائی مقام ہے۔ اقبالؔ کی 'پیامِ مشرق' کی غزلیں عمدہ اور اعلیٰ ہیں، مگر زبورِ عجم کی غزلیں ان سے مزید عمدہ اور اعلیٰ ہیں۔ فارسی غزل میں دو شاعروں کے نام بہت مشہور اور قابلِ احترام ہیں۔ ایک مولانا جلال الدین رومی ہیں جن کا ذکر جاوید نامہ کے بیان میں آئے گا، اور دوسرے خواجہ حافظ۔ اقبالؔ کی زبورِ عجم میں رومیؔ کا جوش اور حافظ کی زبان کی شیرینی دونوں جمع ہوگئی ہیں۔ شاعر کو اسی لئے اس کتاب پر ناز تھا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، زبورِ عجم کے حصہ اول کا خطاب خدا سے ہے۔ اس میں ہر قسم کے مضامین ہیں۔ شاعر خدا سے مدد مانگتا ہے کہ اسے مشرقی اقوام، خصوصاً مسلمانوں کو بیدار کرنے کی توفیق ملے۔ وہ اپنی شاعری کی نعمت کا بار بار شکر بھی ادا کرتا ہے۔ مگر کہیں کہیں وہ یہ گلے شکوے بھی کرتا ہے کہ مسلمان بے حس ہیں۔ اقبالؔ نے زبورِ عجم میں شعر اور پیغام کو ایک کرلیا ہے۔ شاعری نقطۂ کمال پر ہے اور پیغام رسانی بھی نقطۂ عروج پر ہے۔ غزل نمبر ۱۲ کا مطلع دیکھیں:

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوے تو   راہ چو مار می گزد گر نروم بسوے تو

یعنی اے خدا، تیری جستجو اور تلاش میں زندگی کو سوز و گداز نصیب ہوتا ہے۔ میں اگر تیری طرف نہ چلوں، تو راستہ مجھے سانپ بن کر ڈسنے لگتا ہے۔ غور کریں کہ طلبِ حق اور خدا پرستی کے راہ کی لذت کو شاعر کس خوبی سے بیان کر رہا ہے۔ یہ بات کس قدر دل پذیر ہے اور بیان کس قدر اچھوتا اور نرالا ہے۔ تیسویں غزل کا آغاز جس مطلع سے ہوتا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"اللہ کی محبت میں ایک قدم اٹھانا ہزار پارسائیوں اور پرہیزگاریوں سے بہتر ہے۔" یہ بے حد عمدہ مضمون ہے کیونکہ خدا کے حقیقی عاشقوں کے مرتبے پرہیزگاروں کے مقام سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ انتالیسویں غزل کے پانچویں شعر کا ترجمہ اور مفہوم یوں ہے:

"خدایا، عبادت کا مقام اَور ہے اور عشق و محبت کا مقام اَور۔ فرشتوں سے

تجھے صرف سجدے کی طلب ہے، مگر انسانوں سے کچھ اَور بھی۔" اقبالؔ فرشتوں کو پابندِ عبادت قرار دے رہے ہیں، مگر انسان عبادت کے علاوہ انس و محبت کے لیے بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی عبادت کا مفہوم بہت وسیع اور جامع ہے۔ اس میں کار و کوشش اور جان و مال کی قربانی شامل ہے۔ اقبالؔ انسان کی اسی قسم کی فضیلتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اڑتالیسویں غزل کے مطلعے کا ترجمہ یوں ہے۔" اس بے قرار دل کو کھینچا تانی کی فرصت نہ دے۔ اپنی چمکیلی زلفوں کی ایک دو شکنیں اَور بھی بڑھا دو۔" یہ چمکیلی زلفیں کیا ہیں؟ نورِ الٰہی کے جلوے ہیں۔ اقبالؔ نے بالِ جبریل کی ایک غزل میں کہا ہے ؎

گیسوئے تابدار کو اَور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

زبورِ عجم کی فارسی اور بالِ جبریل کی اردو غزلیات ایک زمانے میں لکھی جا رہی تھیں اس لئے کئی اردو اور فارسی اشعار ایک مفہوم کے نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کے حصہ اوّل کے آخری شعر کا ترجمہ یوں ہے۔

"خدایا، ہم انسانوں کی خاک نئے آسمان بنانے کے لیے پرواز کر رہی ہے۔ یہ حقیر ذرہ دیکھو جو بیاباں بنانے چل نکلا ہے۔" مقصد یہ کہ انسان کا ظاہر کمزور دکھائی دیتا ہے، مگر اس کی باطنی قوتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔

زبورِ عجم حصہ دوم کا خطاب انسانوں سے ہے، خصوصاً مسلمانوں سے۔ آپ جانتے ہیں کہ اقبالؔ نے عمر بھر خودی، بیداری، ترقی، اتحاد اور اچھے مسلمان بننے کا پیغام دیا ہے۔ زبورِ عجم کے اس حصے میں بھی یہی باتیں کثرت سے بیان ہوئی ہیں۔ مگر غزل کی زبان نے یہاں ان باتوں کی تاثیر میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ اقبالؔ نے یہاں بھی غزل کے روایتی مضامین پر لکھا، مگر یہ مضامین قومی اور دینی موضوعات کے سامنے کچھ دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حصہ دوم کی غزلوں کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا ہے۔ پہلے حصے میں شاعر ادب و احترام کے ساتھ خدا سے مخاطب ہے، مگر حصہ دوم میں وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ خاصی بے تکلفی برت رہا ہے۔ اس حصے کی انیسویں نظم ایک مستزاد ہے جس کے ہر دو شعروں کے بعد ان الفاظ کی تکرار ہے کہ:

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

یعنی اے مخاطبو! گہری نیند سے جاگو، اٹھو اور سرگرم عمل بنو تیسویں نظم میں ہر بیت کے بعد یہ کلمات آئے ہیں :

انقلاب ، انقلاب ، اے انقلاب

خوابِ گراں سے لوگوں کو جھنجوڑ کر جگانے اور انہیں انقلاب پر آمادہ کرنے کے لیے، اقبال سے زیادہ مؤثر آواز غالباً کسی دوسرے شاعر نے کبھی نہ اٹھائی ہوگی۔ یہاں مثال کے طور پر چند غزلوں کے بعض اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

غزل ۹ (شعر ا تا ۴)

دنیا کے چمن کے لالے کا پھول ابھی تک رنگ بھرا ہے۔ ڈھال ہاتھ سے نہ پھینک کیونکہ ابھی جنگ موجود ہے۔ ابھی یورپ والوں کے گہوارے میں ایک ایسی لڑکی پروان چڑھ رہی ہے جو سینکڑوں فتنوں کا سبب بنے گی۔ ساحل پر بیٹھنے والے شخص! اٹھ اور سمندر کا رخ کر۔ ابھی تجھے بھنور اور مگرمچھوں سے سابقہ پڑنا ہے۔ نیشہ ترک کر دینا عقل کی بات نہیں۔ ابھی پتھروں کا دل چیر کر کتنے لعل نکالنے باقی ہیں۔

غزل ۱۱۔

پانی کی لہر کی طرح خودی کے ساتھ مست رہو اور طوفان کا مقابلہ کرو۔ تمہیں پاؤں توڑ کر بیٹھنے اور سر خم کرنے کا کس نے مشورہ دے رکھا ہے؟ چیتوں کا شکار کرنے گھر سے نکل پڑو۔ پہاڑوں پر خیمے گاڑو اور صحراؤں میں ڈیرے جمالو۔ سورج اور چاند پر کمند ڈالو اور ان کے گلے کس دو۔ ستاروں کو آسمان سے نوچ لو اور اپنے گریبان کی زینت بنا ڈالو۔ مانا کہ خودی کی شراب بہت تلخ ہے، مگر اپنے مرض کا خیال کر کے ہمارے اس زہر کو علاج کی خاطر پی ہی ڈالو۔

غزل ۸۴ (شعر ۱، ۳ تا ۵)

سادہ لوح انسان تو کب تک دنیا کو دیکھے گا اور اپنی خودی سے غافل رہے گا؟

دنیا سے باہر نکل جا تو اس سے وسیع زمستی ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے والے! تو موت سے کیوں ڈر رہا ہے؟ تو خود موت کے شکار کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ غیبی ہاتھ جان بخش کر واپس نہیں لیتے۔ البتہ بے یقینی اور کمزور ایمان والے لوگ مر جاتے ہیں۔

مثنوی گلشن راز جدید۔

اقبال نے یہ مثنوی ساتویں آٹھویں صدی ہجری کے ایک صوفی شاعر شیخ محمود شبستری کی مثنوی گلشن راز کے جواب میں لکھی ہے۔ شبستر، ایران کے شہر تبریز کے پاس واقع ہے شیخ سعد الدین محمود وہیں کے رہنے والے تھے۔ ان کے ہم زمانہ ایک بزرگ سید امیر حسینی تھے جو ہرات کے باشندے تھے۔ انہوں نے ۱۷ منظوم سوال کئی حضرات کو لکھ بھیجے اور ان سے جواب لکھنے کی درخواست کی۔ یہ سوال تصوّف یعنی صوفیا کے طریقوں کے بارے میں تھے۔ ان ہی سوالوں کے جوابات سے "گلشن راز" بنی ہے۔ یہ مثنوی صوفیا کے ہاں بہت مقبول اور مشہور رہی اور اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی روشنی میں اس کا جواب لکھا ہے۔ اکثر صوفیا کی طرح شیخ محمود نے بھی اپنی خودی مٹانے پر زور دیا ہے۔ مگر اقبال خودی کو مٹانے کے قائل نہ ہو سکتے تھے۔ انہوں نے "گلشن راز جدید" کو شیخ محمود کی مثنوی کے وزن میں ہی لکھا، مگر ان کے جوابات شیخ محمود کے نقطۂ نظر کی ضد ہیں۔ علامہ مرحوم نے ۱۷ سوالوں میں سے صرف ۱۱ کا انتخاب کیا۔ پھر دو دو سوالوں کو دو جگہ ایک ایک سوال بنا دیا اور کل ۹ جواب لکھے۔ اقبال کے جوابات بھی مختصر ہیں۔ مگر خودی کی تعلیم کے مطابق تصوّف کو سمجھنے کے سلسلے میں یہ مختصر مثنوی بے حد اہم ہے۔ یہ خلاصہ مطلب یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال نے پورا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ انسانی شخصیت اور خودی حقیقت رکھتی ہے اور اسے کسی صورت میں بھی کمزور نہیں کرنا چاہیے۔

مثنوی بندگی نامہ۔

یہ زبور عجم کے ساتھ منسلک دوسری مثنوی ہے۔ بندگی کے معنی غلامی کے ہیں۔ یہ پوری مثنوی اقبال نے غلامی کی برائیاں بیان کرنے میں لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غلاموں کے فنون لطیفہ جیسے موسیقی، مصوری اور فن تعمیر، نقالی پیش کرتے ہیں اور ان میں کوئی جدت

اور نیا پن نظر نہیں آتے۔ حتّٰی کہ غلاموں کا دین بھی قابلِ اعتبار نہیں کیونکہ یہ لوگ اپنے دین کی ایسی تاویلات پیش کرتے رہتے ہیں جو ان کے حاکموں کو پسند ہوں۔ مثنوی کی تمہید میں اقبال نے بڑی بے باکی سے غلامی کی برائیاں بیان کی ہیں۔ تمہید کے آخری بند کا مفہوم یہ ہے:

"ایک ایسے خراب مقام کا خیال کرو جہاں بچھوؤں کے ڈنگ مارنے کی نشانیاں ہوں۔ وہاں کی چیونٹیاں، سانپوں کو ڈسنے اور بچھوؤں کو شکار کرنے والی ہوں۔ وہاں کی گرم لُو میں دوزخ کی آگ کی تاثیر ہو۔ یہ لُو ابلیس کے لیے بھی قابلِ تکلیف ہو۔ لُو کی یہ آگ پوری فضا میں دہک رہی ہو اور شعلے پر شعلہ اٹھ رہا ہو۔ پھر یوں خیال کرو کہ اس آگ کے گرداگرد سیاہ دھواں ہو۔ یہ آگ بجلی کے کڑکے اور سمندر کی لہروں کی صدائیں دے رہی ہو۔ وہاں زہریلے پھن والے سانپ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں۔ آگ کے شعلے باؤلے کتوں کی مانند خوفناک، تباہی لانے والے، سیاہی و تاریکی پھیلانے اور پیچھا کرنے والے ہوں۔ مصیبتوں اور تکلیفوں بھرے ایسے وحشتناک مقام میں مدتوں رہنے سے غلامی کا ایک لمحہ گزارنا زیادہ مشکل ہے۔"

اقبال فرماتے ہیں کہ غلاموں کی موسیقی میں رونے دھونے کی دُھنیں ہوتی ہیں۔ ان کی موسیقی، روح کی طراوت کا سامان نہیں رکھتی۔ غلاموں کی مصوری اور فوٹو گرافی سے بھی کمزوری، زوال اور نقالی ٹپک رہی ہوتی ہے مثلاً:

دنیا سے روگرداں شخص برائیوں میں پھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے، قیدی پرندے کی تصویر سے کسی نامراد عاشق کو واضح کرتے ہیں یا کسی بادشاہ کے دربار میں ایک بیچارے فقیر کو دکھا دیتے ہیں۔ پہاڑی علاقے کا لکڑہارا، کسی حسینہ کا بت خانے میں یا کسی جوگی کا ویرانے میں ہونا، دوسروں کے گانے سے اثر پذیر گویا، فریادی بلبل، عشق کے ہاتھ سے بے بس نوجوان یا کسی بڈھے کی گردن پر سوار بچہ، غلاموں کی مصوری کے نمونے ہیں اور یہ سب پستی اور کمزوری سکھاتے والی تصاویر ہیں۔ ان میں کوئی جدت ہے نہ جرأت۔ غلاموں کے دین و ایمان بھی حاکموں کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں۔ "غلام" خدا کی بندگی کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن دراصل ان کا معبود، حاکمِ وقت ہوتا ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ غیر ملکی حاکم ہو یا ظالم و جابر ڈکٹیٹر اور بادشاہ، یہ لوگوں کو دین کی روح سے دور رکھنے میں یکساں ہیں۔

غلاموں کے فنون لطیفہ کا ذکر کر کے اقبال آزاد لوگوں کے فنونِ لطیفہ پر غور کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مثلاً قطب الدین ایبک کی بنائی ہوئی عمارتیں۔ ان میں دہلی کی مسجد قوت الاسلام اور اس کے پہلو میں واقع قطب مینار۔ یہ دونوں عمارتیں خستہ حالی میں ہونے کے باوجود آزاد لوگوں کے فنونِ لطیفہ کے عمدہ نمونے فراہم کر رہی ہیں۔ شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی عمارتوں کا بھی یہی حال ہے۔ پھر شاہجہان کا بنوایا ہوا تاج محل تو ایک عجوبہ ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ آگرہ میں واقع اس عمارت کو کبھی چاندنی رات میں دیکھو، تو اس کی شان و شوکت سے آگاہ ہونگے۔

آپ جانتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی کے وسط تک کوئی دو اڑھائی صدیوں تک برِ صغیر کے لوگ غلام رہے اور اس دوران فنونِ لطیفہ میں وہ کوئی قابلِ ذکر ترقی نہیں دکھا سکے۔ اقبال نے اس مثنوی میں یہی حقیقت بتا کر لوگوں کو آزادی حاصل کرنے کے لئے ابھارا ہے۔ اردو کتاب 'بال جبریل' میں بھی انہوں نے ایسے ہی کہا ہے کہ ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی	جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر	کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

۷ ۔ جاوید نامہ۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا نام علامہ مرحوم کے فرزند جاوید اقبال کی مناسبت سے ہے جو اپنے عہدے کے اعتبار سے اس وقت مسٹر جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کہلاتے ہیں۔ کتاب کے کوئی دو ہزار شعر ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ ایک طرح کا ضمیمہ ہے۔ اس کا عنوان یوں ہے:

'جاوید سے خطاب' (نئی نسل سے باتیں)

کتاب جاوید نامہ کو اقبال کی فکری اور ادبی معراج جاننا چاہیے۔ محقق لوگوں کا خیال ہے کہ جاوید نامہ، اقبال کا شاہکار ہے۔ رنگارنگ خیالات اور بے نظیر طرزِ بیان کے

لحاظ سے اقبال کی کوئی دوسری کتاب جاوید نامے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر پورے فارسی ادب میں بھی جاوید نامے کی طرز میں کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے۔

جاوید نامہ کیا ہے؟ اس کتاب میں اقبال نے اپنا خیالی آسمانی سفر بیان کیا ہے۔ اس سفر میں وہ چھ سیاروں یا آسمانوں سے آگے گذر جاتے ہیں۔ سفر کے دوران انہیں چالیس کے لگ بھگ مختلف افراد اور کرداروں سے ملنا اور گفتگو کرنا پڑتا ہے۔ اس گفتگو کے ذریعے اقبالؔ تمام بڑے بڑے مسئلوں کا حل پیش کرتے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو بعض نصیحتیں پیش کی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج شریف کے واقعے کو آپ نے پڑھا اور سنا ہوگا۔ یہ اپنی قسم کا پہلا اور آخری واقعہ ہے کہ نبی اکرمؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور مشاہدوں اور خدائی احکام کی دولت لے کر زمین پر لوٹ آئے۔ معراج کے واقعات، حدیث اور سیرتِ رسولؐ کی کتابوں میں تفصیل سے موجود ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں کئی مسلمان صوفی، ادیب اور شاعر اپنے عرفانی یا ادبی معراج نامے لکھتے رہے ہیں۔ یہ معراج نامے عربی میں ہیں۔ تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے ایک مشہور شاعر ڈینٹے کو ایسے معراج ناموں کا علم ہوا اور اس نے "ڈیوائن کامیڈی" کے نام سے تین جلدوں میں اپنے افلاکی سفر کی سرگذشت لکھی۔ اقبالؔ کا جاوید نامہ کافی حد تک اسی ڈیوائن کامیڈی کے طرز پر ہے۔ مگر کرداروں یا معانی کے لحاظ سے اقبال نے کسی کی پیروی نہیں کی اور بالکل نئے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈانٹے نے "ڈیوئین کامیڈی" میں دو تین راہنماؤں کے ساتھ اپنا افلاکی سفر طے کیا تھا۔ مگر اقبال کے واحد راہنمائے سفر مولانائے روم ہیں۔

رومی اور اقبال۔

رومی یا مولانائے روم کو دنیا جلال الدین محمد رومی یا مولوی کے طور پر جانتی ہے۔ اقبالؔ کے جاوید نامے میں ہی ان کا ذکر نہیں، بلکہ علامہ مرحوم کی تقریباً ہر کتاب میں ان کا نام کئی کئی بار دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبالؔ انہیں اپنا مرشد قرار دیتے ہیں اور اپنے قارئین کو

بار بار یہ مشورہ دیتے ہیں کہ رومی کا مطالعہ کریں۔ اس لئے اقبال کے پڑھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ رومی سے کسی قدر آشنا ہوں۔

مولانا جلال الدین رومی کے والد بہاء الدین محمد تھے۔ رومی ساتویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں بلخ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن کے زمانے میں چنگیز خان اور اس کے قبیلے کے وحشی منگولوں نے وسطی ایشیا سے نکل کر ایران پر حملہ کر دیا۔ اسی زمانے میں رومی اپنے والد کے ساتھ بلخ سے عرب ممالک کی طرف چل نکلے۔ انہوں نے حج کیا اور کئی سال تک شام کے شہروں حلب اور دمشق میں قیام کیا۔ مگر بعد میں آپ ترکی کے شہر قونیہ آ گئے اور زندگی کا زیادہ حصہ یہیں بسر کیا ہے۔ رومی کا انتقال اسی مقام پر ۶۷۲ ہجری یعنی ۱۲۷۳ء کو ہوا ہے۔ رومی بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ ان کی پانچ کتابیں اس وقت موجود ہیں۔ مجموعہ خطوط، ملفوظات، تقریریں، دیوان اور مثنوی۔ اقبال نے رومی کے دیوان کے حوالے بھی دئیے ہیں، مگر ان پر زیادہ اثرات مثنوی شریف کے ہی ہیں۔ مثنوی کے چھ دفتر یا حصے ہیں اور اس کے اشعار کی تعداد تقریباً ۲۷ ہزار ہے۔ اسے دنیا کی اہم ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رومی نے حکایتوں اور مثالوں کی مدد سے زندگی کے مسئلوں کا حل اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کی مثنوی، فارسی زبان کا قرآن مجید، کہی گئی ہے۔

اقبال نے فارسی میں چھ مثنویاں لکھی ہیں: اسرار خودی، رموز بیخودی، بندگی نامہ، جاوید نامہ، مسافر اور پس چہ باید کرد۔ آخری دو مثنویوں کا تعارف پیش ہونا ابھی باقی ہے۔ یہ سب مثنویاں، رومی کی مثنوی کے وزن اور طرز پر ہیں۔ اقبال کی ساتویں مثنوی، گلشن راز جدید، البتہ شیخ محمود شبستری کی اس مثنوی کے وزن میں ہے جس کے جواب میں اقبال نے اپنی یہ کتاب لکھی تھی۔ جاوید نامے کے آخر میں اقبال نے فرمایا ہے کہ رومی سوز و گداز .... سکھلاتے ہیں۔ وہ اصل حقیقت کے بارے میں دو ٹوک بات کرتے ہیں۔ وہ ہوسناکی و ہوس پر غالب آنے کے طریقے بتاتے ہیں۔ ان کے پیرو صوفی جو مولویہ فرقے کے لوگ ہیں، مستی کے عالم میں رقص کرنے لگتے ہیں مگر رومی نے روح کے رقص کرنے کا گر

سکھایا ہے کیونکہ جسمانی رقص ایک ادنیٰ عمل ہے۔ اقبال نے اپنی دوسری کتابوں میں بھی مطالعۂ رومی کی اہمیت اسی طرح بیان فرمائی ہے۔ 'بال جبریل' میں ہے ؎

علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اُسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن　　اسی کے فیض سے میرے سبُو میں ہے جیحوں

اپنی آخری کتاب ارمغان حجاز میں اقبال کہتے ہیں کہ وہ اس زمانے کے رومی ہیں رومی نے اپنے زمانے کے فتنوں کا زور توڑا تھا اور وہ اس زمانے کے فتنے مٹا رہے ہیں۔

رومیؒ اور اقبالؒ کے مشترک مضامین اور ان کے ایک جیسے طریقِ کار کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رومی کے بعض مضامین کی دریافت کا سہرا اقبال کے ہی سر ہے ورنہ چھ سات صدیاں گذر گئیں اور کسی نے بھی رومی کو اس طرح نہ سمجھا تھا۔

رومیؒ کا زمانہ خوف و ہراس اور مسلمانوں کی تباہی کا زمانہ تھا۔ منگولوں نے ایران اور اس کے نواح کے ملکوں میں لاکھوں انسانوں کو قتل کیا اور دارالخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر خلافتِ عباسیہ کا چراغ گل کر دیا۔ مسلمان اقتصادی اور سیاسی طور پر بے حد کمزور ہو گئے۔ وہ مایوسی اور ناامیدی سے دوچار تھے۔ بے کار دینی بحثوں کا ایک طومار جمع ہو رہا تھا۔ ان بحثوں اور مناظروں میں بے عملی اور زندگی سے فرار کی راہیں تلاش کی جا رہی تھیں۔ رومی نے مغزِ دین پر توجہ دلوائی اور مسلمانوں کی ڈھارس بندھوائی۔ آپ اقبال کے کارناموں سے آگاہ ہیں کہ انہوں نے بیسویں صدی کے فتنوں کا کس طرح مقابلہ کیا ہے۔ مگر بڑے بڑے مضمون جو رومی اور اقبال کے ہاں مشترک ہیں، ان میں عشق، عظمتِ انسانی، امید و کوشش، خودشناسی انسان کی آزاد تقدیر، موت سے بے خوفی اور عالمی نقطۂ نظر کو سرِفہرست رکھا جا سکتا ہے۔

بہرکیف یہی رومی جاوید نامے کے آسمانی سفر میں اقبال کے راہنما ہیں۔

جاوید نامے کا آغاز۔

یہ کتاب ایک انوکھی مناجات و دعا سے شروع ہوتی ہے۔ اس مناجات

ہیں اقبالؔ اپنی تنہائی کی شکایت کرتے ہیں کہ ہم خیال دوستوں سے محروم ہیں۔ وہ اپنی نعمتِ شاعری کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں، وہ دعا کرتے ہیں کہ ہر دور کے نوجوان ان کے کلام کو سمجھتے رہیں تاکہ ان میں سے بعض قوم کی راہبری کے ذریعے انکے خیالات کو بھی عام کرسکیں۔ مناجات کے بعد شاعر نے آسمان اور زمین کا ایک مکالمہ لکھا ہے۔ یہ مکالمہ آسمان اور زمین کی پیدائش کے ابتدائی دنوں کا ہے۔ آسمان نے زمین کو پستی اور بے نوری کا طعنہ دیا۔ زمین اپنے دفاع کی بات نہ کرسکی مگر ایک غیبی آواز نے اسے سہارا دیا تھا۔ اس آواز نے زمین کے بسنے والوں کی فضیلت بتاکر آسمان کو لاجواب کردیا۔ فرشتوں نے بھی ایک غزل پڑھ کر زمین اور انسانوں کی برتری کی تائید کی۔ 'نغمہ ملائک' دراصل زبورِ عجم کی ایک غزل ہے۔ جاوید نامہ ہے تو مثنوی کی صورت میں، مگر اس میں غزلیں بھی موجود ہیں۔ یہ غزلیں اقبالؔ کی پیامِ مشرق اور زبورِ عجم میں سے ہیں۔ بعض نئی غزلیں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ترجیع بند اور ترکیب بند بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بعض اشعار دوسرے شاعروں کے بھی نقل ہوئے ہیں۔ کتاب چونکہ ڈرامائی انداز کی ہے اور اس میں مختلف ارواح اور بے جان چیزیں بولتی دکھائی دیتی ہیں، اس لیے اس طرح کے رنگا رنگ اشعار نے اس کی دلکشی میں بے حد اضافہ کر رکھا ہے۔ 'نغمہ ملائک' کے بعد رومیؔ کی روح ظاہر ہوتی ہے اور وہ معراج کے راز سمجھاتی ہے۔

شاعر کسی دریا کے کنارے بیٹھا رومیؔ کی ایک غزل پڑھ رہا تھا کہ روحِ رومی آ حاضر ہوئی۔ رومیؔ کی روح کہتی ہے کہ فکر و خیال میں انقلاب آجانے سے معراجِ روح ناممکن نہیں۔ اقبالؔ، رومیؔ کی گفتگو سن رہے تھے کہ اتنے میں زروان نام کا ایک فرشتہ آنکلا۔ زرتشتی مذہب کے مطابق یہ فرشتہ زمان و مکان یعنی وقت و مقام پر کنٹرول رکھتا ہے۔ اس نے شاعر کا رابطہ دنیا سے قطع کروا دیا۔ وہ تاریکی میں ستاروں کے نغمے سننے لگا۔ ستارے اسے اور اس کے راہنما کو آسمانوں کی طرف آنے وقت خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ شاعر، چاند پر جا پہنچا۔

چاند کی دنیا۔

یہاں رومی اور اقبال ایک ہندو جوگی وشوامتر سے ملاقات کرتے ہیں جو ہندوؤں کے افسانوں کے مطابق رام چندر جی کا استاد تھا۔ کئی باتوں پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ آگے انہیں چار پیغامبروں کی تعلیمات کے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پیغامبر گوتم بدھ، زرتشت، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ ہیں۔ گوتم بدھ اور زرتشت کا پیغامبر ہونا اختلافی مسئلہ ہے، مگر اقبال نے رواداری میں انہیں ایسے ہی لکھا ہے۔ مسیحی مذہب کی تعلیمات کو اقبال نے روس کے ایک عالم طالسٹائی کے خواب کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے یہاں اقبال نے توحید، مساوات اور اخوت کا ذکر کیا ہے۔ ان ہی تعلیمات سے ابوجہل کو شکایت تھی اور وہ کعبہ شریف میں جاکر ڈھائیں مار مار کر روتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بت پرستی کے ترک کرنے، خاندانی فضیلت کی نفی ہوتے اور تمام مسلمانوں کے بھائی بھائی بن جانے کی حکمتیں اسے معلوم نہ تھیں۔

عطارد میں

چاند کی دنیا کے بعد اقبال اور رومی عطارد میں جا پہنچتے ہیں۔ یہاں رومی، اقبال کو زندہ رود (بہتا دریا) کا لقب دیتے اور کتاب کے اصلی حصے کے آخر تک شاعر کا ذکر اسی لقب کے ساتھ ملتا ہے۔ عطارد میں سید جمال الدین افغانی اور شہزادہ سعید حلیم پاشا کی روحوں سے گفتگو ہوتی ہے۔ سعید حلیم پاشا بھی سید جمال الدین افغانی کی طرح مسلمانوں کا اتحاد چاہتے تھے۔ انہیں اس کی بڑی فکر تھی کہ مسلمان مغربی تمدن کے نیچے دب کر اپنی ثقافت کو بھول نہ بیٹھیں۔ وہ بڑے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ ترک حکومت کے وزیر خارجہ اور وزیر اعظم بھی بنے۔ ۱۹۲۱ء میں ایک آرمنی نے انہیں شہید کر دیا تھا۔ فلکِ عطارد کے حصے میں زندہ رود نے افغانی اور سعید حلیم پاشا کی زبان سے نظریہ وطنیت کے خلاف اور اسلامی تعلیمات و قوانین کی حمایت میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی دوسری کتابوں میں بکھرا پڑا ہے اور ایک مقام

پر نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے جاوید نامے کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ اس حصے میں اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظام کی خصوصیات ملتی ہیں۔ نئے علوم و فنون سیکھنے اور اپنے کلچر کا دفاع کرنے کے آداب بھی یہاں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ آخر میں سید جمال الدین افغانی کی زبانی، ملتِ روس کے نام ایک پیغام ہے۔ اس پیغام کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پذیر، قابلِ عمل اور عدل و انصاف والا ابدی دین ہے۔ اسلئے دین و رسوم کی پابندیوں سے رہائی پانے والی ملتِ روس کو بھی اس دین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر یہ قوم، اسلام کا مطالعہ کرے، تو دیکھ لے گی کہ یہ دین مظلوموں کی حمایت اور دولت کی منصفانہ گردش کے وہ سارے تقاضے پورے کرتا ہے جو اسے عزیز ہیں۔

فلک زہرہ۔

فلک زہرہ پر قدیم دیوتا اور بت نظر آتے ہیں۔ قدیم فنیقی قوم کا سورج دیوتا بعل، مغربی اقوام کی آثار قدیمہ سے دلچسپی کی بنا پر خوش ہوکر ناچتے گاتے نظر آتا ہے۔ وہ مطمئن ہے کہ پرانے کھنڈروں کی کھدائی کے نتیجے میں بت پرستی کے دوبارہ شروع ہونے میں آسانی ہوگی۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کا معاصر فرعون نظر آتا ہے اور اس کے ساتھ لارڈ کچنر بھی کچنر نے سوڈان کے ایک مذہبی راہنما سید محمد احمد مہدی کی قبر کھدوا کر اس کی نعش کی بے حرمتی کی تھی۔ زندہ رود اس ظالم کی روح پر لعنت بھیجتے ہیں اور عربیوں کو مہدی سوڈانی کی قربانیوں کا واسطہ دے کر نصیحت کرتے ہیں کہ مغربی اقوام کے فتنوں سے چوکنا رہیں۔ سید محمد احمد نے سوڈان کے مسلمانوں کو جمع کئے رکھا اور انگریزوں کو کئی بار اپنے ملک سے دور بھگایا تھا۔ وہ ۱۸۸۵ء میں فوت ہوئے اور اس کے ۱۳ سال بعد کچنر نے سوڈان فتح کر لیا۔ اس موقع پر اس نے سید محمد احمد کی نعش قبر سے نکلوا کر سمندر میں پھنکوا دی۔ لیکن چند سال بعد ۱۹۱۶ء میں اس کی اپنی نعش کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ جس بحری جہاز میں روس جا رہا تھا، اسے جرمن آبدوز نے ڈبو دیا اور کچنر کی نعش تک نہ ملی۔ زندہ رود فیلڈ مارشل لارڈ کچنر کو ایک چھوٹا فرعون قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی حضرت موسیٰؑ کے معاصر بڑے فرعون کی طرح پانی میں غرق ہوا۔ بڑے فرعون کی نعش قاہرہ کے

عجائب گھر میں دیکھنے والوں کے لئے عبرت ہے اور کچھ کی نعش کا صفحۂ ہستی سے نابود ہو جانا، ایک دوسری قسم کی عبرت ہے۔

چیست تقدیر ملوکیت ؟ شقاق   محکمی جستن ز تدبیر نفاق

یعنی ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ لوگوں میں جدائی اور تفرقہ ڈال کر چلائی جاتی ہے، مگر اس کا اپنا انجام بھی تفرقہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے۔

مریخ۔

فلکِ مریخ: پر رومی اور زندہ رود ایک نجومی سے ملتے ہیں۔ وہ تقدیر اور تدبیر کے مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے بدل جانے سے اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ خدا کے ہاں تقدیروں کی کمی نہیں اور وہ ہر کسی کو اس کی کوشش کا پھل دیتا ہے۔ دوسرا کردار ایک عورت کا ہے جو پیغامبری کی مدعی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سائنسی ترقی کے نتیجے میں عورت، شوہر کے بغیر بھی صاحب اولاد ہو سکے گی۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ٹسٹ ٹیوب بے بی پیدا ہونے لگے ہیں مگر رومی اور زندہ رود نے ایسی بے پدر و مادر اولاد سے خدا کی پناہ مانگی ہے۔

فلکِ مشتری۔

اس سیارے پر حسین ابن منصور حلاج، قرۃ العین طاہرہ اور میرزا اسد اللہ خان غالب کی ارواح سامنے آتی ہیں اور ابلیس یا شیطان کی سیاہی بھی نظر آتی ہے۔ حسین ابن منصور حلاج تیسری چوتھی صدی کے ایک مشہور صوفی تھے جنہیں ان کے بعض دعووں کی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا۔ قرۃ العین طاہرہ ایک ایرانی شاعرہ تھیں۔ وہ ایک نئے پیغامبر محمد علی باب شیرازی پر ایمان لے آئی۔ اور اسی جرم میں قتل کر دی گئی۔ زندہ رود اس کی بے باکی کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ معاصر ایرانی بادشاہ، ناصرالدین شاہ قاچار نے اسے بابی مذہب چھوڑنے کے لئے اس خاتون پر کافی دباؤ ڈالا، اور اُسے اپنی ملکہ بنانے کی پیشکش بھی کی، مگر وہ اپنے عقائد پر جمی رہی یہاں تک کہ ۱۸۵۲ میں قتل کر دی گئی۔ ابن حلاج سے اقبال نے چند سوال پوچھے جن میں ایک تقدیر کے بارے

ہیں ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر کس حد تک اختیار رکھتا ہے اور کس حد تک وہ مجبور ہے ؟ حسین ابن حلاج جواب دیتے ہیں کہ جس قدر انسان خدا کا فرماں بردار ہو اور جس قدر باہمت ہو، اسی قدر وہ اپنی تقدیر میں آزاد ہو جاتا ہے۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ انہوں نے کسی جنگ میں شکست نہیں کھائی۔ اس کے مقابلے میں ایک کم ہمت زرتشتی مذہب کے شخص کی مثال مولانائے رومؒ نے اپنی مثنوی میں دی ہے۔ وہ تیسری صدی ہجری کے مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامیؒ کی عبادت و ریاضت دیکھ کر دینِ اسلام کو ناقابلِ عمل سمجھ بیٹھا اور ایک مسلمان مبلغ کی دعوتِ اسلام پر معذرت کر لی۔

اقبالؒ نے ابلیس و شیطان کے بارے میں کافی لکھا ہے۔ اسی جاوید نامے میں اس ملعون کا ذکر ایک دو جگہ پھر آئے گا مگر فلکِ مشتری پر اس کا کردار بے حد دلچسپ رنگ میں پیش ہوا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر نے ابلیس کی ایک فریاد بھی لکھی ہے۔ ابلیس سے یوں تو سب ہی فریاد کرتے رہتے ہیں مگر زندہ رود نے دیکھا کہ اس زمانے کے انسانوں سے ابلیس فریاد کر رہا ہے۔ ابلیس کو نیک اشخاص سے مقابلہ کرنے اور انہیں شکست دے کر گمراہ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے مگر اس زمانے کے اکثر لوگ ابلیس کو مقابلے کی تکلیف دئے بغیر اس کے فرماں بردار بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے ابلیس.... رو پیٹ کر خدا سے دعا کرتا ہے کہ ؎

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست　　لذتے شاید کہ یابم در شکست

یعنی اے خدا مجھے کسی ایسے زندہ دل حق پرست کے روبرو کر جس سے ہارنے کا تجربہ ہو اور کبھی کبھار کی اس ہار سے مجھے لذت ملے۔

فلکِ زحل پر۔

مشتری کے بعد زندہ رود اور رومی فلکِ زحل پر آتے ہیں۔ یہاں بڑا خوفناک منظر ہے۔ روحِ ہندوستان آہ و فغاں کر رہی ہے اور دو بڑے غدار کبھی دوزخ میں پھینکے جا رہے ہیں اور کبھی ایک خون بھرے طوفانی سمندر میں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ دوزخ کی آگ

اور خون بھرا سمندر دونوں ان سے بیزار ہیں۔ روحِ ہندوستان چیختی دھاڑتی انہیں لعن طعن کر رہی ہے۔ یہ روح کہتی ہے کہ برصغیر میں انگریزی استعمار اور ان کی غلامی کا بیج ان ہی لعنتی غداروں نے بویا اور اس طرح کروڑوں انسانوں کو ایک طویل عرصے تک غلام بنا لیا گیا۔ ان دو غداروں کا اتا پتا اقبال کے اس شعر میں دیکھئے ؎

جعفر از بنگال، و صادق از دکن   ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

یعنی سرزمین بنگال کا میر جعفر اور ریاستِ میسور کا میر صادق جو انسانیت، دین اور وطن تینوں کی ذلت کا سبب بنے ہیں۔ میر جعفر نے ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی میں لارڈ کلائیو سے رشوت لے کر نواب سراج الدولہ شہید کے ساتھ غداری کی تھی۔ اس واقعہ کے ۴۰ سال بعد ۱۷۹۹ء میں میر صادق نے والیٔ میسور سلطان فتح علی ٹیپو شہید کے ساتھ غداری برتی اور انگریزوں اور ان کے حلیفوں کو فتح دلوائی۔ نواب سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کو اپنے راستے سے ہٹا کر انگریز جلد ہی پورے برصغیر پر قابض ہو گئے تھے۔

افلاک سے باہر۔

یہ جاوید نامے کا خاصا طویل حصہ ہے۔ زندہ رود اور اس کا راہنما چھ افلاک یا سیاروں سے گزرنے کے بعد افلاک سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے سورج میں جانے اور دوزخ کے طویل مشاہدے سے صرفِ نظر کر لیا تھا۔ افلاک سے باہر اعراف کے مقام میں انہوں نے جرمن فلسفی فریڈرک نیٹشے کو دیکھا ہے۔ اعراف، دوزخ اور بہشت کے بیچ کی جگہ ہے اور فلسفیوں کے لئے بھی مناسب مقام ہے۔ بالِ جبریل میں ہے ؎

تڑپ رہا ہے فلاطون میانِ غیب و حضور   ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

فلاطون یعنی یونانی فلسفی افلاطون۔ زندہ رود کہتے ہیں کہ اگر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی جیسا کوئی راہبر مل جاتا تو وہ انکارِ خدا سے توبہ کر لیتا اور راہِ راست پر آجاتا۔

اعراف کے بعد رومی اور زندہ رود بہشت میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں انہیں مندرجہ ذیل ارواح یا ان ارواح کے مقامات کی زیارت نصیب ہوتی ہے:

شرف النساء بیگم، امیر کبیر سید علی ہمدانی، سنسکرت شاعر بھرتری ہری، نادر شاہ افشان، احمد شاہ ابدالی، سلطان فتح علی ٹیپو شہید، حوریں اور جمالِ خدا کی تجلی۔

شرف النساء بیگم، نواب خان بہادر خان کی بیٹی اور نواب عبد الصمد خان کی پوتی تھی اس کے باپ اور دادا مغلوں کی طرف سے صوبہ پنجاب کے گورنر رہے۔ شرف النسا کا مزار لاہور کے محلہ بیگم پورہ میں موجود ہے اور اسے سرو والا مقبرہ کہا جاتا ہے شاعر نے اس پردہ نشیں خاتون کی روح سے کوئی بات نہیں کی۔ صرف اس کے شاندار محل کا ذکر کیا ہے جو اسے اور اس کے راہنما کو بہشت میں نظر آیا تھا۔ شرف النساء بیگم کا معمول تھا کہ ہر صبح ایک بلند چبوترے پر بیٹھتی اور خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتی۔ بعد ازاں قرآن مجید کے ساتھ اپنی تلوار وہیں رکھ کر نیچے اتر آتی۔ یہ خاتون جوانی میں فوت ہو گئی۔ اس نے اپنی والدہ سے وصیت کی تھی کہ قرآن مجید اور تلوار کو اس کی قبر کے تعویذ میں محفوظ کر دیں۔ اس وصیت پر عمل کیا گیا تھا۔ مگر سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں قبر کا تعویذ کھول کر قرآن مجید اور تلوار کو وہاں سے غائب کر دیا۔ زندہ رود یہاں سکھا شاہی دور کے مظالم کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کو علی ثانی اور حوارئ کشمیر بھی کہتے ہیں مگر وہ شاہ ہمدان کے طور پر زیادہ مشہور ہیں۔ آپ آٹھویں ہجری کے ایک صوفی اور مبلغ تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے ہمدان، روس کے صوبہ تاجکستان وادی جموں و کشمیر اور اس کے نواحی علاقوں میں قابلِ قدر دینی اور اصلاحی خدمات انجام دی تھیں۔ وہ کوئی دس برس تک کشمیر، گلگت اور بلتستان میں رہے اور ہزاروں افراد کو مسلمان کیا۔ وہ تاجکستان کے قصبہ کلیاب میں مدفون ہیں جسے پہلے ختلان کہتے تھے۔ زندہ رود اور رومی حضرت شاہ ہمدان سے ملتے ہیں اور وہاں مشہور شاعر ملا محمد طاہر غنی کشمیری بھی موجود تھے۔ دونوں حضرات کشمیریوں کو آزادی کی خاطر مزید جدوجہد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ شاہ ہمدان کی ایک اہم فارسی کتاب کا نام "ذخیرۃ الملوک" ہے۔ اس کے دس باب ہیں اور ان میں دینی تعلیمات ہیں اور سیاسی امور کے آداب بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اسی

کتاب کے حوالے سے زندہ رود شاہ ہمدان سے کئی سوال پوچھتے اور ان کے جوابات لکھتے ہیں۔ مثلاً شیطان کے وجود کے بارے میں شاہ ہمدان نے اپنی کتاب کے چھٹے باب میں لکھا تھا کہ شیطان کے مقابلے سے انسان کو روحانی ترقی ہوتی ہے، مگر شیطان کی ہم نشینی اور شیطانی کاموں میں شرکت سے انسان کا روحانی زوال ہو جاتا ہے۔ زندہ رود نے ایک سوال اس ہی موضوع پر پوچھا اور ذخیرۃ الملوک کی عبارت کے مطابق اس کا جواب لکھا ہے۔

بھرتری ہری سنسکرت زبان کا شاعر تھا۔ اس کے اشعار انگریزی اور کئی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ دوسری صدی ہجری / ساتویں صدی عیسوی میں مالوہ کے علاقے کا حکمران تھا مگر تاج و تخت ترک کر کے اس نے درویشی اختیار کر لی۔ زندہ رود نے یہاں اس کے بعض اشعار کو فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ بالِ جبریل کے ذیل کے اردو شعر کا مفہوم بھی بھرتری ہری سے ہی ماخوذ ہے کہ ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

نادر شاہ افشار کی یہ ادا زندہ رود کو پسند ہے کہ اس نے مختلف فرقوں کو نزدیک لانے کی کوشش کی تھی۔ زندہ رود اس بادشاہ کو ایران کے حالات بتاتا ہے۔ شاعر کے خیال میں اگر ایران میں اسلام نہ آتا، تو یہ ملک صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہوتا۔ مگر ایرانی وطن پرستی میں شدت رکھنے کی بنا پر عرب مسلمانوں کے ہاتھوں ایران فتح کئے جانے کے واقعے کی مذمت کرتے ہیں اور ایران کو بچانے کے سلسلے میں عربوں کے احسانات کو نہیں مانتے۔ بابا احمد شاہ درانی ابدالی مُلک افغانستان کے بانی ہیں۔ وہ نادر شاہ افشار کی فوج کے ایک اعلیٰ افسر تھے، مگر بعد میں انہوں نے اپنا علیحدہ ملک تشکیل کر لیا۔ وہ زندہ رود سے افغانستان کے حالات کا پوچھتے ہیں۔ زندہ رود افغانوں کی جرأت اور بہادری کی داد دیتے ہیں مگر ان کی برادر کشی اور خانہ جنگیوں کی شکایت کرتے ہیں جاوید نامے کے تصنیف کئے جاتے وقت افغانستان میں مغربی آداب اپنائے جانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ بادشاہ افغانستان امیر امان اللہ خان کو ایسی کوششوں

میں ناکامی ہوئی اور انہیں ملک بدر ہونا پڑا۔ اسی مناسبت سے ابدالی فرماتے ہیں کہ ترقی کرنے کی خاطر اہلِ مغرب کے علوم وفنون سیکھنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس ضمن میں اہلِ مغرب کا سا لباس پہننا اور ان کی طرح کا رہن سہن رکھنا ضروری نہیں ترکوں نے جو مغربیت اپنائی تھی، ابدالی اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔ فلک عطارد والے حصے میں سعید حلیم پاشا نے بھی یہی کہا تھا کہ اسلامی آدابِ زندگی، اہلِ مغرب کے آدابِ زندگی کے مقابلے میں زیادہ مناسب ہیں، لہٰذا مغرب کے علوم وفنون سیکھتے وقت اہلِ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کو اپنے آدابِ زندگی کو خیرباد نہیں کہنا چاہیے۔ اہلِ مغرب نے علوم وفنون کے ذریعے ترقی کی ہے، ان کی عریانی اور فحاشی نے انہیں آگے بڑھنے میں کوئی مدد نہیں دی۔ لہٰذا اصل کام کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

رومی اور زندہ رود اب سلطان ٹیپو شہید سے گفتگو کرتے ہیں اور برِصغیر کے حالات سے انہیں آگاہ کرتے ہیں۔ زندہ رود حکومتِ خود اختیاری کی کوشش اور تین گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے ریاست میسور اور حیدر آباد دکن کے اس سفر کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۲۹ء میں انجام دیا، اور جس میں انہوں نے اس شہید سلطان کے مزار پر بھی حاضری دی تھی۔ سلطان شہید اپنی ریاست کے پایہ تخت شہر سرنگا پٹم اور اس کے پاس سے گذرنے والے دریائے کاویری کو یاد کرتے ہیں۔ وہ زندہ رود سے کہتے ہیں کہ دریائے کاویری کو میرا ایک پیغام پہنچا دو اور اس طرح اس پیغام کو عام کر دو۔ اس پیغام میں زندگی، موت اور شہادت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اہم اور آسان نکتے یہ ہیں:

۱۔ طولانی زندگی کی آرزو بے معنی ہے۔ دعا کرو کہ مختصر زندگی میں زیادہ کارنامے انجام دے سکو۔ شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے زیادہ بہتر ہے۔ لہٰذا جرأت اور بہادری کے ساتھ جینا چاہیے۔

۲۔ موت، زندگی کا ایک مرحلہ ہے اور اس کا خاتمہ نہیں ہے۔ لہٰذا موت سے بے خوف رہنا چاہیے۔ مومن کو اپنی خودی کے بچاؤ کی فکر ہوتی ہے۔ اسے موت کی

کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

۳۔ زندگی، کوشش اور حرکت کا نام ہے اور جہاد فی سبیل اللہ، کوشش اور حرکت کی انتہا ہے۔ مومن موت کا منتظر رہتا ہے، مگر شہادت کی اُسے انتہائی آرزو ہوتی ہے۔ معمولی موت اور شہادت میں غیر معمولی فرق ہے۔ مومن غازی بن کے اصلاحی یا دفاعی جہاد کرتا ہے اور شہادت اسے زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔

سلطان ٹیپو شہید کی روح سے گفتگو کرنے کے بعد رومی کی روح وہاں سے رخصت ہو کر اپنے مقام پر چلی گئی مگر حوروں نے زندہ رُود کو گھیر لیا کہ ابھی نہ جائے۔ زندہ رود نے انہیں سمجھایا کہ روحانی سفر میں مسافر کا رک جانا مفید نہیں مگر آخر اسے شعر سنانے کی فرمائش پوری کرنا ہی پڑی۔ حوروں سے اجازت لے کر شاعر لوٹنے ہی والا تھا کہ اس کی قوتِ عشق نے بہشت کے گرداگرد پھیلی ہوئی ذات باری تعالیٰ کی تجلیٔ جمال سے خطاب کرنے کا حوصلہ پالیا۔ عرض کیا: 'خدایا' ہماری زمین کے حالات سے تو آگاہ ہے۔ حاکم عیش و عشرت میں مشغول ہیں اور محکوم خستہ حالی میں صبح کو شام اور شام کو صبح کر رہے ہیں۔ ملوکیت اور آمریت نے دنیا کو تاریک بنا رکھا ہے۔ اہلِ مغرب کی سائنسی ترقی مہلک ہتھیار بنا بنا کر انسانوں کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ مسلمان بیچارے اتحاد سے محروم ہیں۔ حاکموں، سود خواروں، ملاؤں اور پیروں نے انہیں دبا رکھا ہے۔ خدایا، یہ زمین تیرے جمال کی تجلیوں کے قابل کہاں رہی ہے؟' صفتِ جمال آواز دیتی ہے کہ زمین کے حالات خراب ہونے کے ذمہ دار انسان ہیں۔ وہ غلامی اور پستی پر مطمئن کیوں ہیں۔ اور حالات بدلتے کیوں نہیں؟ غیبی ہاتھ ان انسانوں کی مدد کرتے ہیں جو اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کریں۔ زندہ رود عرض کرتا ہے کہ مردہ قوموں کا بیدار ہونا اور ترقی کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ مثلاً مسلمانوں کو اب صبر ہی کرنا ہوگا۔ یہ بیچارے اب کیا کر لیں گے!۔ صفتِ جمال آواز دیتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ قوموں کا زوال و عروج ہوتا رہتا ہے۔ مسلمان اگر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو توحید، کے

تقاضوں کے مطابق ڈھال لیں، تو وہ دوبارہ ایک طاقت ور قوم بن جائیں گے۔ 'توحید' کا تقاضا یہ ہے کہ فرد اللہ سے لو لگائے اور اس کے علاوہ کسی سے نہ ڈرے۔ 'قوم' کو چاہیے کہ وہ عقیدہ و عمل میں متحد ہو جائے 'ضرب کلیم' میں اقبال نے یہ بات یوں کہی ہے:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علمِ کلام
روشن اس ضَو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

زندہ رود کو مسلمانوں کے دوبارہ طاقت ور بن جانے کی صدا نے بے حد خوش کیا۔ خوشی کے عالم میں وہ 'صفت جمال' سے دنیا کے آئندہ انقلابات کا پوچھنے لگے، مگر غیبی باتوں کا پوچھنا، خدا کی خدائی میں دخل دینے کے مترادف ہے۔ شاعر نے دیکھا کہ اس سوال پر 'صفت جمال' 'صفت جلال' سے بدل گئی۔ شاعر نے 'صفت جلال' کی طرف دیکھا ہی تھا کہ ہوش جاتے رہے۔ اس طرح زندہ رود، دوبارہ اقبال بن گیا اور جاوید نامے کا اصلی حصہ ختم ہو گیا۔

آپ نے جاوید نامے میں بیان کی گئی موٹی موٹی باتوں کا خلاصہ سنا۔ اتنی بات کا اور اضافہ کر دیں کہ شاعر نے ان باتوں کو پوری شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لہٰذا! فارسی اشعار سمجھنے والے پر جو اثر ہوگا، وہ ترجمے یا ترجمانی کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔

نئی نسل سے چند باتیں۔

جاوید نامے کے ضمیمے کا پہلے ذکر ہو چکا۔ اس حصے کے کوئی ڈیڑھ سو اشعار ہیں۔ یہ اشعار اخلاقی آداب اور ضروری نصیحتوں پر مشتمل ہیں۔ یہ اشعار لکھ کر اقبال نے فارسی شاعری کی اخلاقیات سکھانے کی روایات ہی پوری نہیں کیں، بلکہ نوجوانوں

کی بھر پور انداز میں راہنمائی بھی کی ہے۔

جاوید نامے کا خلاصہ چونکہ خاصا طویل ہو گیا، اس لئے اس ضمیمے کے ۱۳ بندوں کے اہم نکات لکھ دینے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

۱۔ تصور توحید سے مدد لیں۔ نوجوانوں کو یہ عقیدہ اس طرح اپنانا چاہیے کہ ان کے لیے غیر معمولی قوت اور جرأت کا سبب ہو۔

۲۔ مومن، غلامی پر راضی رہ سکتا ہے نہ اسے غداری، فرقہ پرستی اور غربت سے انس ہو سکتا ہے۔ آج کل کے مومنوں کے حالات پر غور کرو۔ وہ دولت کے بدلے قوم اور دین دونوں کو بیچ رہے ہیں۔ ان کی عبادات بے روح ہیں۔ اللہ سے لو لگانے کے بجائے انہیں دولت سے واسطہ ہے اور موت سے خائف ہیں۔ عصرِ حاضر کے دو نام نہاد پیغامبروں نے دین کی روح خراب کرنے اور مسلمانوں کے سینوں کو مٹے قرآن مجید کی گرمی سے خالی کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔ ایران کے چھوٹے پیغامبر بہاء اللہ نے حج ترک کروا دیا، اور برّ صغیر میں غلام محمد قادیانی نے جہاد کو۔ حج اور جہاد نہ ہو تو نماز اور روزہ بھی گئے۔ لہذا نوجوانوں کو چاہیے کہ بہائیوں، قادیانیوں اور احمدیوں کے فتنوں سے بچیں۔

۳۔ نوجوان غور کریں کہ آج ہماری عبادات بے روح کیوں ہیں اور قرآن مجید کی برکات سے ہم کیوں محروم ہیں؟۔ وجوہات یہ ہیں کہ مسلمان متحد نہیں اور وہ خدا کے علاوہ دوسروں کے آگے بھی خم ہو رہے ہیں۔

۴۔ ایشیائی اقوام کو جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، دین اور سیاست دونوں دیا رہے ہیں مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت و آمریت نے انہیں جکڑ رکھا ہے۔

۵۔ اقبال نے انگریزی میں سات خطبے لکھے تھے جنہیں اردو میں 'تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' کہا جاتا ہے۔ ان کا اسلوب علامہ کی شاعری سے جدا ہے۔ وہ نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ ان کی نثر اور نظم دونوں سے استفادہ کریں اور فکر و فن کی روایات کو آگے بڑھائیں۔

۶۔ موجودہ نظام تعلیم ناقص ہے۔ اس سے قلب کی اصلاح ہوتی ہے نہ خودی کی حفاظت اقبال فرماتے ہیں کہ نوجوان سخت محنت کریں، اپنے جذبات پر قابو رکھیں، اپنی جوانی کی

حفاظت کریں اور رزقِ حلال پر توجہ رکھیں۔ حلال روزی اور سچ بولنے کو اقبال دین کے راز قرار دے رہے ہیں۔ جو یہ راز پالے دین کی پابندی وہی کر سکے گا۔ علاقہ گجرات کاٹھیاواڑ کے سلطان مظفر بیگڑہ کی پرہیزگاری کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ اس سلطان نے سولہویں صدی عیسوی میں حکومت کی۔ اس سلطان اور اس کے والد سلطان محمود بیگڑھ نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ اقبال لکھتے ہیں کہ اس سلطان کا ذاتی گھوڑا بیمار ہوگیا اور حیوانات کے ڈاکٹر نے شراب سے اس کا علاج کیا۔ مگر سلطان نے اس گھوڑے پر اس کے بعد سواری نہ کی۔ فرمایا کہ شراب پینے والا جانور اب میرے کام کا نہیں رہا۔ سلطان نے فتویٰ پر عمل نہ کیا۔ اس کی توجہ تقویٰ پر تھی۔

۷۔ نوجوان کا حسن ادب و شرافت ہے۔ مسلمان ہو کہ کافر، آدمی ہونے کے اعتبار سے دونوں محترم ہیں۔ نوجوانوں کو رواداری، حسن ادب اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ فراہم کرنا چاہیے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ کسی بے ادب مسلمان نوجوان سے مل کر انہیں بے حد کوفت ہوتی ہے۔ انہیں عہد رسالت مآبؐ کے باادب جوان یاد آتے لگتے ہیں، جو بڑی عمر کے مسلم و کافر سب کا احترام کیا کرتے تھے۔

۸۔ مال و دولت کی فراوانی کے باوجود، دل کا گداز اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ باقی رہنا ضروری ہے۔ نوجوانوں کو توجہ رکھنا چاہیے کہ مال و دولت انکے دل کو سخت نہ کردیں اور وہ بے حس نہ بن جائیں۔

۹۔ عصرِ حاضر کے علما اور صوفیا بھی آزمائے بغیر، قابلِ اعتماد نہیں رہے۔ مغربی نقطہ نظر رکھنے والے مسلمان تو سراپا عیار ہیں۔ اقبال نوجوانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ نئی نسلوں کی حالت بدلنے پر توجہ دیں گے۔

۱۰۔ نوجوانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم مولانائے رومؒ اور اقبال کی کتابوں کو غور سے پڑھیں۔ یہ کتابیں ان کے لیے مرشد اور راہنما کا کام دیں گی۔

۸۔ **مثنوی مسافر**۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی مگر ۱۹۳۶ء سے یہ بعد کی

مثنوی 'پس چہ باید کرد' کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ افغان نے اقبال اور برصغیر کے دو دوسرے مشہور علماء، علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر راس مسعود، کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ انہیں کابل یونیورسٹی کے تعلیمی پروگرام کے سلسلے میں مشورے کے لئے بلایا گیا تھا۔ ان تینوں حضرات کے معاون ڈاکٹر ہادی حسن اور بیرسٹر غلام رسول خان تھے۔ یہ حضرات پشاور کے راستے کابل گئے اور نومبر کے پہلے ہفتے میں قندھار، چمن، کوئٹہ کے راستے لوٹ آئے۔ ان کے لوٹ آنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد نادر شاہ افغان کو شہید کر دیا گیا اور ان کے بیٹے ظاہر شاہ نے اقتدار سنبھالا۔ یہ نادر شاہ معزول ہو کر اب اٹلی میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ مثنوی 'مسافر' میں اقبال نے افغانستان کے اپنے کوئی دو ہفتے کے مشاہدات بیان کئے اور افغانیوں کو بیداری، اتحاد اور ترقی کا پیغام دیا ہے۔

نادر شاہ افغان، اقبال کے قدر دان تھے۔ انہوں نے اقبال کو جو دعوت نامہ بھیجا تھا، شاعر نے اس کا مفہوم یوں بیان کیا ہے: "اقبال، تیری نوائے شعر نے ہمیں جلا ڈالا۔۔۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جو تیرے پیغام کو سمجھ جائے۔ افغانی تیرے پیغام کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں تیرے تاثرات میں برابر کے شریک ہیں۔ تُو افغانستان کے کوہستانوں کی بجلی ہے اور تیری چمک سے پوری سرزمینِ مشرق کو روشنی مل رہی ہے لیکن اب مناسب وقت ہے کہ تم خود بھی ہمارے ہاں آؤ اور ہم میں گھل مل کر اپنے سوزِ دل سے ہمیں بہرہ ور کرو۔ تیری بجلی میدانوں میں کیسے مفید ہو رہی ہے۔ تجھے ہمارے کوہستانوں میں چمکنا ہوگا۔"

اقبال، درہ خیبر کے پیچ و خم والے راستے سے گذر کر افغانستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ افغانیوں کی جرأت اور بہادری کی داد دیتے ہیں، مگر ان کی بے نظمی اور افراتفری سے انہیں دکھ ہوتا ہے۔ وہ افغانیوں کو خود شناسی، اتحاد اور اتفاق کا پیغام دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نظم و نسق اور باہمی اتفاق سے ہی کوئی قوم مضبوط اور مستحکم ہو سکتی ہے مگر یہ کام شعور اور خود شناسی کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ فرما

ہیں کہ اگر افغان اپنی استعداد پہچان لیں، تو ان کے مقابلے کی کوئی دوسری قوم بمشکل ہی دنیا میں ہو گی، مگر معاشی بدحالی نے افغانیوں کو ابھی خودی سے بیگانہ کر رکھا ہے۔

تمہید کے بعد اقبالؔ اپنے کابل پہنچنے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کابل کی آب و ہوا اور اس شہر کے قدرتی مناظر کی تعریف کرتے ہیں۔ انہوں نے کابل پہنچ کر "دلکشا" نام کے محل میں بادشاہ سے ملاقات کی۔ نادر شاہ بڑی انکساری سے ملا اور بولا: "اقبالؔ! اپنے سوز و ساز کی وجہ سے تو مجھے سگے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اقبالؔ نے نادر شاہ کو ایک قرآنِ مجید تحفے کے طور پر دیا اور کہا: "سب قوتوں کا سرچشمہ یہی کتاب ہے اسی کی برکت سے ہی حضرت علیؓ نے قلعہ خیبر فتح کیا تھا" نادر شاہ رو رہا تھا اور کہتا تھا کہ اسی عظیم کتاب نے مجھے بادشاہی حاصل کروائی اور اسی کے سہارے میں سب مسائل کو حل کر رہا ہوں۔ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے بادشاہ کے پیچھے نماز پڑھی اور اس کی لذت کو کبھی نہ بھولیں گے۔

اقبالؔ نے برِّصغیر میں سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر بادشاہ کے مزار پر حاضری دی اور اس موقع پر ایک غزل لکھی۔ وہ اس بات سے خوش ہیں کہ بابر نے دہلی کی بجائے کابل میں دفن ہونے کی وصیت کی تھی اور اس طرح ایک آزاد ملک میں محوِ خواب ہو سکا۔ وہ عثمانی ترکوں کی ترقی دیکھ کر تیموری ترکوں یعنی مغلوں کے مٹ جانے پر افسوس کرتے ہیں۔ "بالِ جبریل" میں بھی انہوں نے اس افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ؂

کوئی تقدیر کا منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ   نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

کابل کے بعد اقبالؔ غزنی جاتے ہیں۔ یہاں وہ حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کرتے ہیں۔ سنائی پانچویں صدی ہجری کے ایک صوفی شاعر تھے۔ اقبالؔ انکی زبانی فرماتے ہیں کہ حقیقی تصوف وہی ہے جو اسلامی شریعت کی تعلیمات کے مطابق ہو۔ غزنی میں ہی سلطان محمود کا مزار ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی شخصیت اور کارناموں سے آپ واقف ہوں گے۔ اس نے گیارہویں صدی عیسوی کے شروع میں برِّصغیر پر کئی حملے کئے اور یہاں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے لیے زمین ہموار کی۔ اس کے حملوں نے

برِ صغیر کے کئی علاقوں میں اسلام پھیلانے میں بھی مدد کی تھی۔ اس کی سلطنت کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ اقبال سلطان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور غزنی کی موجودہ خستہ حالت کا سلطان کے زمانے کی غزنی سے مقابلہ کر کے رو پڑتے ہیں۔ انہیں افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان سر کہیں زوال کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلطان محمود کے جانشینوں کے ایک مخالف حاکم علاؤالدین غوری نے پورے غزنی کو جلا ڈالا تھا اور غزنی اب بھی ایک چھوٹا سا ہی شہر ہے۔ مگر سلطان محمود کے زمانے میں پایہ تخت غزنی کی وسعت کا اندازہ اس سے کر لیں کہ دربارِ محمود کے شاعروں کی تعداد ۴۰۰ کے قریب تھی۔ امرا، وزرا، علما اور افسر سب اس شہر میں رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۳ء کے بہت چھوٹے اور ویران غزنی کو دیکھ کر 'شکوہ' کا مصنف اللہ تعالیٰ سے پھر شکوہ و شکایت کرنے لگا کہ:

'خدایا' یہ دنیا تو نے بنائی یا کوئی دوسرا بھی تیرا شریک رہا ہے؟ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو مغربیوں کو ہی نواز رہا ہے اور مشرقی اقوام، خصوصاً مسلمان تیری التفات سے محروم ہیں۔ خدایا' ان مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ بے حس و بے حرکت ہیں۔ انہیں دولت کی ہوس اور موت کا خوف تباہ کر رہا ہے۔ خدایا، میری تلخ بیانی معاف' ان مردہ دلوں کو زندہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔' مگر اقبال جانتے تھے کہ مسلمان اپنے زوال کے آپ ذمہ دار ہیں۔

غزنی کے بعد اقبال قندھار آئے۔ یہاں انہوں نے بانی افغانستان' بابا احمد شاہ درّانی ابدالی' کے مزار پر حاضری دی اور ان کی زبانی افغانستان کے معاصر بادشاہ ظاہر شاہ کو قیمتی مشورے دیئے۔ مگر اس سے قبل انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک خرقے کی زیارت کا ذکر کیا ہے۔ روایات کے مطابق یہ خرقہ بڑا مستند ہے۔ یہ خرقہ مبارک قندھار کی ایک مسجد میں محفوظ ہے اور جمعرات کے دن اس کی زیارت کر سکتے ہیں۔ آپ اندازہ کر لیں کہ اقبال جیسے عاشقِ رسولؐ پر خرقہ پاک کی زیارت کا کیا اثر ہوا ہو گا۔ انہوں نے اس موقع پر ایک غزل لکھی ہے۔ آخری

شعر میں فرماتے ہیں کہ اس خرقے کو دیکھ کر ان کے وجود کا ہر ذرہ سراپا نور بن گیا اور وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ گویا وادیٔ سینا میں آ گئے ہیں یا وادیٔ فاران میں۔ وادیٔ سینا میں کوہِ طور واقع ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھا تھا اور وادیٔ فاران میں مکہ مکرمہ واقع ہے۔ اقبالؔ یہاں کچھ نعتیہ اشعار لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں

اس خرقے سے مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک کی خوشبو ملی مگر محبت کی شدت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں روئے بغیر نہ رہ سکا۔

ظاہر شاہ سے اقبال فرماتے ہیں کہ قوموں کی زندگی کوشش اور جہاد کے ذریعے باقی رہتی ہے۔ سخت کوشی سے ہی چند سال پہلے ترک قوم دوبارہ طاقتور بن گئی، اور اب کوئی بھی اسے کمزور نہیں کہہ سکتا۔ علوم و فنون میں ترقی کرنا بھی قوم کے لئے ضروری ہے مگر یہ ترقی، روحِ اسلام کے مطابق ہو۔ اسلام کے نام لیواؤں نے چند صدیاں پہلے علوم و فنون میں ایسی ترقیاں کی تھیں جو مغربی اقوام کی موجودہ ترقیوں کی راہبر اور راہنما بنیں، مگر انہوں نے ان ترقیات کے کاموں میں قرآنِ مجید، احادیثِ رسولؐ اور دین کے بزرگوں کی تعلیمات کو فراموش نہ کیا اور دین و دنیا کے کاموں کو ایک ساتھ نبایا تھا۔ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے بہترین طریقہ یہی تھا۔ اقبالؔ ظاہر شاہ اور سب مسلمانوں سے مخاطب ہیں کہ مغرب کے جدید علوم و فنون کو اپنائیں مگر مغربی تہذیب و تمدن کی معاشرتی خرابیوں سے بچے رہیں اور اسلامی آداب و اخلاقیات کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ ظاہر شاہ اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو اُن کے قرآنی پیغام پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ قرآن مجید نے فرد اور قوم دونوں کے استحکام کی ضمانت دی ہے لہٰذا اس عظیم کتاب سے روگرداں ہو کر مسلمانوں کو فرسودہ اور ناقص قوانین کا سہارا لینا بے سود رہے گا۔

۹۔ مثنوی "پس چہ باید کرد"۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اور اس وقت سے مثنوی "مسافر" بھی اسی کے ساتھ چھپتی رہی ہے۔ اس کتاب کے کوئی سوا پانچ سو اشعار ہیں، مگر اپنے مضامین کے لحاظ سے یہ اقبال کی اہم ترین کتابوں میں شامل

ہوتی ہے۔ 'پس چہ باید کرد' یعنی پھر کیا کرنا چاہیے۔ کتاب کا پورا نام دراصل اقبال کا ایک مصرع ہے کہ ؏ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ۔ اقبال کا مصرع کتاب کے ایک اہم حصّے کا عنوان بھی ہے اور پورا شعر یوں ہے ؎

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق　　　باز روشن می شود ایام شرق ؟

یعنی اے مشرق کی قومو، پھر ہم کیا کریں جس سے اہلِ مشرق کے اچھے دن آ جائیں۔

مثنوی کے ابتدائی دو عنوان، حکمت کلیمی، اور حکمت فرعونی ہیں کلیم، حضرت موسیٰؑ کا لقب ہے۔ اقبال نے اسلامی نظامِ حیات کا عنوان 'حکمت کلیمی' رکھا اور غیر اسلامی زندگی کو 'حکمت فرعونی' سے تعبیر کیا ہے۔ ابراہیمؑ و نمرود، موسیٰؑ و فرعون اور محمدؐ و ابوجہل بالترتیب حق اور باطل کی علامتیں رہی ہیں۔ پیغامبرانہ حکمت اور کافرانہ طریقِ کار ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں اور اقبال نے یہاں ان نظاموں کی اہم خصوصیات بیان کی ہیں۔

'حکمت کلیمی' وحی خداوندی کی تابع ہے۔ یہ ایک بے خطر طریق کار ہے۔ اس حکمت کی رو سے خدا کا حکم اہم ہے اور کسی بادشاہ یا آمر کے حکم کی کوئی حیثیت نہیں۔ پیغامبرانہ حکمت، بندوں کا رابطہ خدا سے قائم کرواتی ہے۔ یہ توحید سکھانے والی حکمت ہے جس سے انسان دوسرے انسانوں سے ڈرتے ہیں نہ ان کے غلام بنتے ہیں۔ اللہ کو کائنات کا حاکمِ اعلیٰ ماننے والا اور اس کی رضا و خوشنودی چاہنے والا انسان دوسرے انسانوں کی برتری اور حاکمیت کیسے مان لے گا؟ لا الٰہ الا اللہ، حکمتِ کلیمی پر ایمان رکھنے والے خدا کے قانون اور اس کی رضا و خوشنودی سے مطابقت رکھنے والے نظامِ حیات کے نافذ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کے برعکس 'حکمت فرعونی' ہے۔ افسوس کہ 'حکمتِ کلیمی' کے ماننے والوں کی بے عملی نے اسی دوسرے شیطانی نظام کو عالمگیر بننے کا موقع دے رکھا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ "یہ کلیمی" کو ہم دین والوں کی حکمت عملی کہہ سکتے ہیں۔ اور 'حکمت فرعونی'

کو بے دینوں اور مکاروں کی حکمت عملی 'حکمت فرعونی' ملوکیت، آمریت اور انسان پرستی سکھاتی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت مذہبی راہنما بھی ڈکٹیٹروں کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ جوان ہوں کہ بوڑھے، مرد ہوں کہ عورتیں، یہ نظام انہیں بے حیائی اور ڈھٹائی سکھاتا ہے۔ 'حکمت فرعونی' ایسا معاشی اور سیاسی چکر چلاتی ہے کہ لوگ چین سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دولت کی ہوس اور موت کا خوف ہر کسی کی جان کو کھائے جاتا ہے۔ امراء عیش و عشرت میں لگ جاتے ہیں اور غریبوں کی مدد کا انہیں خیال ہی نہیں ہوتا۔ ... 'حکمت فرعونی' دین دار طبقہ سے بھی اپنا کام لیتی ہے۔ عالم اور فاضل لوگ حاکموں کے مطلب کی باتیں لکھ دیتے ہیں۔ یہ علماء باتیں بناتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار دین کا نقطۂ نظر بھی پیش کرتے ہیں، مگر بے عمل اور منافق لوگوں کی باتوں میں اثر کہاں ہوتا ہے؟ یہ لوگ بت خانے بنانے کے لئے گویا خانۂ خدا کی اینٹیں اکھاڑ کر دے رہے ہوتے ہیں کیونکہ دینی توجیہات سے بے دینی کے کاموں کی حمایت کرتے ہیں! 'حکمت کلیمی' اور 'حکمت فرعونی' کی ان وضاحتوں کی روشنی میں یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور وہ دین کی خاطر کیا خدمت انجام دے رہا ہے!

مثنوی پس چہ باید کرد کا ایک عنوان ہے 'لا الٰہ الا اللّٰہ'۔ جس سال یہ مثنوی چھپی، اسی سال اقبال کی اردو کتاب 'ضرب کلیم' بھی شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں کی چند باتیں مشترک ہیں۔ 'ضرب کلیم' میں بھی اقبال نے 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کے موضوع پر ایک نظم لکھی ہے اور اس کے اشعار آپ اکثر سنتے ہوں گے۔ پہلا شعر یوں ہے:

خودی کا سرِ نہاں، لا الٰہ الا اللّٰہ خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللّٰہ

مگر فارسی مثنوی والا حصہ مفصل اور زیادہ جامع ہے۔ کلمہ طیبہ کے اس حصے کے دو جزو ہیں۔ ایک لا الٰہ ہے یعنی دنیا بھر کے معبودوں اور نام نہاد خداؤں کی نفی اور دوسرے الا اللّٰہ یعنی خدائے واحد کی خدائی کا اقرار۔ اقبال پہلے لا الٰہ کی تشریح کرتے ہیں۔ لا الٰہ انسانوں کو وہم و گماں اور خوف و ہراس سے آزاد کرتا ہے مگر الا اللّٰہ نہ ہو تو زندگی توازن، اعتدال اور کنٹرول کو ہاتھ سے دے دیتی ہے۔

الا اللہ یعنی ایک خدا کا خوف، ایک خدا کا سہارا اور اسی کے آگے جواب دہی کا احساس، انسان کو ایک مستحکم کردار کا مالک بنا دیتا ہے۔ جسے الا اللہ پر ایمان نہ ہو اور الا اللہ کے تقاضے نہ مانتا ہو، اس کی بے قید و بند زندگی کسی اخلاقی ضابطے کی پابند نہیں ہو سکتی۔ عرب مسلمانوں کی مثال پر غور کریں۔ انہوں نے لا الہ کہہ کر پرانے معبودوں کو ترک کر دیا، مگر الا اللہ نے ان کو وہ قوت اور کردار کی پاکیزگی دی جس پر مسلمانوں کو فخر ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ روس اور دیگر اشتراکی ممالک نے لا الہ کہنے کی حد تک اچھا کیا مگر جب تک وہ الا اللہ نہ کہیں گے، وہ ایک غیر فطری طریقے کے پیرو رہیں گے اور ؎

لا و الا برگ و سازِ امتان   نفی بی اثبات، مرگِ امتان

یعنی لا الہ الا اللہ امتوں کی زندگی کا سامان فراہم کرتا ہے اور صرف لا الہ کو کافی سمجھنے والی قومیں جلد یا بدیر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔

مثنوی 'پس چہ باید کرد' کا اگلا عنوان 'فقر' ہے۔ اس عنوان پر بھی اقبال نے خاصی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ فقر یہاں تصوف یعنی صوفیانہ طریقے کے ہم معنی ہے۔ فقر کے لفظی معنی غربت اور ناداری کے ہیں مگر صوفیا نے فقر کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک فقرِ مجبوری ہے اور دوسرا فقرِ اختیاری۔ فقر مجبوری یعنی انسان کا واقعی غریب ہوتا ہے اور فقرِ اختیاری مال و دولت ہوتے ہوئے بھی اس سے دل نہ لگانا ہے۔ ان دوسرے معانی کے لحاظ سے فقر کو تصوف کا مترادف بتایا جاتا ہے۔ ہم فقر کو درویشی کے لفظ سے واضح کر سکتے ہیں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ حقیقی فقر و درویشی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی ہے۔ یہ کوئی غیر اسلامی کام نہ تھا مگر کئی صوفیا کے طریقے نے اسے کمزوری اور دوسروں کی غلامی قبول کرنے کی صورت میں ظاہر کر کے مسلمانوں کو مایوس کر دیا مگر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اصلی اسلام اور اصلی فقر و درویشی پر توجہ دیں۔ فقر و درویشی کے سامنے بادشاہوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ حقیقی فقیر وہ تھے جن سے بادشاہ ڈرتے رہتے تھے۔

فقیر کا سرمایہ گودڑی اور پھٹے پرانے کپڑے نہیں، بلکہ قرآن مجید ہے۔ اسی عظیم کتاب سے اسے قوت ملتی ہے۔ وہ بے نیازی کا نمونہ بنتا ہے اور کسی کی شان وشوکت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ فقیر کی قوت دیکھنی ہو تو حضرت علیؓ کی زندگی پر غور کرو، جو جو کی روٹی کھاتے تھے مگر خیبر کے قلعے کو فتح کرنے کی مہم انہوں نے ہی سر کی تھی۔

اقبال اس غلط فہمی کو رفع کرتے ہیں کہ فقر و درویشی، ترکِ دنیا سکھاتی ہے۔ اسلام کی رو سے دین اور دنیا کے کاموں کی کوئی تفریق نہیں۔ اسلام نے یہ تعلیم دی ہے۔ کہ ہر کام خدا کے حکم کے مطابق انجام دیا جائے۔ اس لیے کوئی حقیقی فقیر دنیا کے کاموں سے منہ کیسے موڑ سکتا ہے۔ یہ غیر اسلامی تصوف ہے کہ جنگلوں میں بیٹھ لیا جائے اور دنیا کے امور سے دور بھاگا جائے۔ خودی کو مٹانا اور بدن کو نحیف و نزار کرتے رہنا، جوگیوں اور مسیحی مذہب کے زاہدوں کا طریق ہے، مسلمانوں کا نہیں۔ نبی اکرمؐ کی ایک حدیث ہے کہ یہ ساری زمین میرے لیے مسجد بنائی گئی ہے، مسجد ایک پاک اور پاکیزہ مقام ہوتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ دنیا کو اپنے تصرف میں لائیں اور اپنے مولا و آقاؐ کی اس مسجد حفاظت کریں۔ بدقسمتی سے اس وقت دنیا میں غیر مسلموں کا عمل دخل زیادہ ہے اور مسلمانوں کی آواز دبی دبی سی ہے۔ اس صورت حال میں حقیقی فقیر وہ ہے جو مسجدِ رسولؐ کو مسلمانوں کے قبضے میں دینے کی کوشش کرے اور جو دنیا کے کاموں سے منہ پھیر لے، اس کا فقر و درویشی دوسروں کے کس کام کا ہے؟ مسلمان ایک شاہین ہے مگر شاہین وہی ہے جو فضائے آسمان میں اونچی پرواز کرتا رہے۔ پرواز اور شکار کے کام کو ترک کر کے زمین کے کونے میں بیٹھ جانے والا شاہین کیا ہوا؟ فقر و درویشی، جہاد اور کوشش کا نام ہے۔ بدر و حنین کے معرکے اور حضرت امام حسینؓ کی عظیم شہادت اسی درویشی کے نمونے ہیں۔

اقبال برصغیر کے مسلمانوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں تین سو سال سے زوال اور پستی کا دور دورہ ہے اور حقیقی فقر و درویشی تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔ اقبال نے تین سو سال کی بات "بالِ جبریل" میں بھی کی ہے۔ ے

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند   اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

علامہ مرحوم کا بظاہر اشارہ حضرت شیخ احمد سرہندی یعنی مجدد الف ثانیؒ کی خدمات کی طرف ہے۔ حضرت مجددؒ اکبر اور جہانگیر کے زمانے کے ایک بزرگ تھے اور انہوں نے ان بادشاہوں کے زمانے کی کئی خرابیوں کی اصلاح کروائی تھی۔ اقبال فرماتے ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کی مایوسی کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں حقیقی فقیر و درویش ناپید ہو گئے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ دین اور فقر کی قوتوں کے منکر ہو جائیں۔ مسلمانوں کو ہمت کر کے دین کے حقائق سیکھنے چاہیے مگر موجودہ فقیروں اور درویشوں کی بے عملی دیکھ کر گزشتہ زمانوں کے فقیروں اور درویشوں کی خدمات کو فراموش نہ کر دینا چاہیے۔

مثنوی 'پس چہ باید کرد' کا بعد کا عنوان 'مردِ حر' ہے۔ 'حر' آزاد کو کہتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں حر، مومن، مسلمان، درویش اور قلندر تقریباً مترادف کلمات ہیں۔ 'مردِ حر' کے عنوان سے اقبال نے مردِ مومن کے اوصاف بتائے ہیں۔ مردِ مومن اللہ اور رسولؐ کے حکم کا پابند ہے۔ وہ بادشاہوں اور امیروں کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ دوسروں کی غلامی وہ کسی حالت میں بھی قبول نہیں کر سکتا۔ وہ برے حالات کی شکایت ہی نہیں کرتا، ان حالات کو بدلنے کی عملی جد و جہد کرتا ہے۔ وہ برے لوگوں کی ہم نشینی سے دور بھاگتا ہے اور اچھے انسانوں کی صحبت اختیار کرتا ہے۔

اگلے عنوان کے تحت اقبالؒ نے اسلام کے معاشی نظام کے اہم نکات سے بحث کی ہے۔ 'در اسرارِ شریعت' کا مطلب ہے شریعت کے رازوں کے بارے میں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام کے معاشی نقطہ نظر کی اہم باتیں مندرجہ ذیل ہیں،

۱۔ مال و دولت کی بہتات اسی صورت میں مفید ہے کہ اس سے دینی امور کی انجام دہی میں مدد لی جائے۔ مثلاً حاجتمندوں کی حاجت روائی۔ ورنہ دولت کی فراوانی فتنوں اور خرابیوں کا سبب بنے گی اور اس سے دولت والے کو فائدہ نہ ہوگا نہ کسی دوسرے کو۔ عام طور پر امراء طرح طرح کی بدکاریوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور غریب وہ کام کر

دکھاتے ہیں جو امیروں سے ممکن نہیں ہوتے۔

۲۔ اصل میں حلال اور حرام مال کی سخت تفریق ہے۔ مغربی اقوام ہر طرح سے دولت اکٹھی کرتی ہیں مگر اسلام نے دوسروں کا نقصان کر کے دولت بٹورنے کو حرام قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ جائز قسم کی تجارت کا نفع روا ہے، مگر بنکی سود اور تجارتی لوٹ کھسوٹ ناروا ہے۔

۳۔ اسلامی نظام حیات پر عمل ہو تو انسانی ہمدردی اور معاشی خوشحالی کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ قرآنِ مجید کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں کا محتاج نہ ہو۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ حقیقی اسلام قرآن مجید اور احادیث رسولؐ میں پوشیدہ ہے۔ نام نہاد عالموں اور غلام احمد قادیانی کی تاویلات سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ ان کا کہا ہوا اسلام ہے۔ ان کی باتیں اسلام کو خراب کرنے کی کوششیں رہی ہیں۔

سیاسیاتِ حاضرہ اس مثنوی کا ایک دوسرا عنوان ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی سیاست یہ ہے کہ دوسروں کو غلام اور اپنا آلۂ کار بنایا جائے، اور جو غلام ہیں، انہیں جکڑ کے رکھا جائے۔ موجودہ زمانے میں ملوکیت ہو کہ آمریت یا کوئی اور نظام ہو، انسانوں کو آزادی دینا ان کا خاصہ نہیں ہے۔ مسلمان ممالک اور دوسرے ممالک کا ایک جیسا حال ہے۔ مسلمان لا الہ الا اللہ کہہ کر بھی غیر اللہ کے سامنے خم ہو رہے ہیں۔ اس سے ان کے ایمان اور عمل کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ علامہ ایک دردناک بات لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ غلامی کی حالت میں مجھے نبی اکرمؐ پر درود و سلام بھیجتے ہوئے شرم آتی ہے۔ عشقِ رسولؐ کا تقاضا ہے کہ رحمۃ اللعالمینؐ پر درود و سلام پڑھا جائے مگر شرم اس بات سے ہے کہ آزادی کے پیغام لانے والے پیغامبرؐ کی امت میں ہو کر ہم لوگ غلامی کی حالت سے نباہ کئے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاستِ حاضرہ کی غلام ساز زنجیروں نے مسلمانوں کو دین و ایمان کی لذت سے بے بہرہ کر رکھا ہے۔ غلام، قرآن مجید کا حافظ ہو تو بھی اس کو ایمان کی لذت نصیب نہیں ہو سکتی۔ غلاموں کی بے روح عبادات کا کیا ذکر کریں۔ ایک نماز کو ہی دیکھیں۔ زندگی کا سوز و ساز

رکھنے والوں کی نماز میں ان کی معراج ہے مگر غلاموں کی نمازیں، پرانی رسمیں پورا کرنے کے مترادف ہیں۔ عید کے اجتماعات کا بھی یہی حال ہے۔ آزاد لوگوں کی عید سے ان کے دین اور ان کی قوم کا جلال اور رعب ظاہر ہوتا ہے، مگر غلام مسلمانوں کی عید ان کے بے روح اور بے وقار اجتماعات کا نام ہے۔ اقبالؔ نے غلاموں کی بے روح عبادات اور رسوم کا ماتم اپنے اردو کلام میں بھی کیا ہے۔ بانگِ درا میں ہے ؎

خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یادِ فصلِ بہار　　خوشی ہو عید کی کیوں کر کہ سوگوار ہوں میں

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے　　ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

'بالِ جبریل' کی دو دو بیتیاں ملاحظہ ہوں ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے　　وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج　　یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے　　مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق　　کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

مثنوی 'پس چہ باید کرد' کا لیہ کا عنوان 'حرفی چند با امتِ عربیہ' ہے یعنی عربوں سے چند باتیں۔ اس سے پہلے کا ایک عنوان تھا 'برصغیر کے باشندوں کی بے اتفاقی پر چند آنسو'۔ اس حصے میں اقبالؔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آئے دن کے فسادات پر افسوس کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد ہو سکتا، تو انگریز برصغیر میں قدم نہ جما سکتے۔ فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء والے خطبہ الہ آباد میں کیا، اور قائداعظم محمد علی جناح کے نام اپنے خطوط میں بھی۔ مثنوی کے زیرِ بحث عنوان میں وہ عرب مسلمانوں کے نت نئے اختلافات کا رونا روتے ہیں۔

ابتدا میں اقبال عربوں کو دینِ اسلام کی نعمت یاد دلاتے ہیں جو ان کے ذریعے دنیا کی دوسری قوموں کو نصیب ہو رہی ہے۔

دین اسلام نے ملوکیت کا خاتمہ کیا، مسلمانوں کو بھائی بھائی بنایا اور قرآن مجید ایسی کتاب دی جو علم کا سرچشمہ ہے اور عمل کا بھی۔ یہاں اقبال نبی اکرمؐ کی ایک ایمان پرور نعت لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ عربوں میں مبعوث کئے گئے، اس لئے انکے لحاظ سے عرب تمام مسلمانوں کی نظر میں قابلِ احترام ہیں مگر افسوس کہ عربوں میں اتحاد رہا نہ وہ مغرب کے فتنوں کا مقابلہ کر سکے۔ عرب ایک قوم تھے مگر انہوں نے اپنے آپ کو کئی ملکوں اور کئی قوموں میں بانٹ رکھا ہے۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ عربوں نے مغربی تمدن اپنا لیا اور مغربی اقوام کے فتنوں کو بھانپ نہ سکے۔ مغربی اقوام نے انہیں تتر بتر کر رکھا ہے مگر وہ ان ہی کو اپنا ہمدرد سمجھ رہے ہیں۔ عربوں کی ایسی حرکتوں پر نبی پاکؐ کی روح کو تکلیف ہو گی۔ شاعرِ مشرق کہتے ہیں کہ عربوں کو حضرت عمر فاروقؓ کی حکمت عملی اپنانی چاہیے اور اپنی قوت و شوکت کا ایسا مظاہرہ کرنا چاہیے جس کی بنا پر کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ اقبال عربوں سے کہتے ہیں کہ اپنے آباو اجداد کی طرح علوم و فنون کی راہبری اپنے ہاتھ میں لیں کیونکہ مغرب والوں کی سائنسی ترقی، اسلحہ سازی کے لئے مخصوص ہو گئی اور انسانیت کی تباہی کا سخت خطرہ درپیش ہو رہا ہے۔

اب ہم اس عنوان پر پہنچ گئے جو اس مثنوی کا نام بھی ہے یعنی 'پس چہ باید کرد، اے اقوام مشرق' اس حصے میں اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی کے ایتھوپیا پر حملے کی مذمت بھی ہے۔ آپ کو علم ہو گا کہ موجودہ عالمی ادارے 'اقوام متحدہ' کی تشکیل دوسری جنگِ عظیم کے بعد عمل میں آئی مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد بھی جمعیت اقوام 'یا لیگ آف نیشنز' کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا تھا۔ اس بے اختیارات ادارے سے اقبال خوش نہ تھے 'پیامِ مشرق' میں وہ اسے کفن چوروں کی ایک جماعت قرار دیتے ہیں جو مُردوں کے کفن بانٹتی ہے مقصد یہ کہ یہ ادارہ کمزوروں کے حقوق کا دفاع نہیں کرتا۔ یہاں وہ اس ادارے کی بے بسی کا ذکر کرتے ہیں کہ اٹلی کے جارحانہ حملے کو روکنے کے لئے وہ کچھ نہ کر سکا۔ ایتھوپیا کو پہلے حبشہ اور ابی سینیا بھی کہتے رہے ہیں۔ 'ضربِ کلیم' میں بھی اقبال نے مسولینی کے حملے کی مذمت کی ہے کہ ؎

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش

'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' کے عنوان سے اقبال پہلے مغربی اقوام کی جنگجو یانہ پالیسی اور ان کی اسلحہ سازی کی رقابت پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ علوم و فنون کی راہبری کبھی مسلمانوں نے بھی کی تھی، مگر وہ کم ظرف نہ تھے۔ مغربی لوگ کم ظرف ہیں کہ علوم و فنون کو اسلحہ بنانے اور لوگوں کو ہلاک کرنے کے کاموں میں صرف کر رہے ہیں۔ حال ہی میں یعنی اگست ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے بلا وجہ ایتھوپیا پر حملہ کر دیا اور لیگ آف نیشنز کو بھی توفیق نہ ہوئی کہ اُس کی مذمت کرے۔

اقبال مشرقی اقوام کو مشورہ دیتے ہیں کہ طاقت حاصل کریں مگر اس میں مکر و فریب شامل نہ ہو۔ اس طاقت سے انسانیت کی بہتری اور بہبودی کا کام لیا جائے۔ برّ اعظم ایشیا میں مسلمان بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ بڑے بڑے دین بھی اسی برّ اعظم سے ظاہر ہوئے اور معروف پیغامبر بھی یہیں سے اٹھے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ایشیائی اقوام کو، خصوصاً مسلمانوں کو دوسری قوم کے انسانوں کی راہبری کے لئے آگے بڑھنا چاہیے۔ مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایشیائی اقوام اپنے تمدن کی حفاظت کریں اور اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنائیں۔ مثنوی 'پس چہ باید کرد' کی تصنیف کے وقت مشرق و مغرب کی جو حالت تھی، ۴۳ سال گذرنے کے بعد اس میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اس وقت اہل مغرب ہی زخموں کے چرکے لگاتے ہیں اور خود ہی مرہم پٹی کے لئے دوڑتے ہیں۔ مغربی قومیں تاجروں کے روپ میں اٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا کی سیاست پر چھا گئیں۔ اگر مشرق کے لوگ مغربی صنعتوں کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے دیسی مال کو استعمال کرنے کو ترجیح دے سکیں، تو مغربی سامراج کا زور کم کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مشرق میں صنعتوں کی ترقی ہو اور یہاں کا خام مال ان صنعتوں کے کام آئے اور سستے داموں مغربی ممالک کے ہاتھ نہ لگے۔ اس طرح اقوامِ مشرق اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں گی اور اپنی قومی دولت کے ذریعے اپنی آبادی کی حالت بہتر بنا

سکیں گی۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(۱) اقوام مشرق اپنی اقتصادی حالت بہتر بنائیں ۔ مغربی علوم و فنون میں کمال حاصل کریں مگر اپنے تمدن اور آدابِ معاشرت کی حفاظت بھی کریں ۔ صنعتیں لگائیں اور اپنے (خام مال اور افرادی قوت سے کام لیں نیز مغرب کے) اس صنعتی مال کا بائیکاٹ کر دیں جو سامانِ عیش و عشرت اور زیب و زینت کی تعریف میں آتا ہے ۔ اس حصے کا آخری شعر یوں ہے ؂

وائے آن دریا کہ موجش کم تپید　　گوہر خود را ز غواصان خرید

یعنی اس سمندر پر حیف ہے جس کی لہروں میں جوش و حرکت نہ ہو، اور جو اپنے موتیوں کو غوطہ خوروں سے خریدے ۔

اس مثنوی کے آخر میں شاعر نے نبی اکرمؐ کے حضور میں ایک پرسوز التماس پیش کی ہے ۔ آپ کو علم ہوگا کہ علامہ اقبال زندگی کے آخری کوئی چار برس مریض رہے تھے ۔ اس دوران علاج کی غرض سے وہ ریاست بھوپال بھی تشریف لے گئے اور سر سید احمد خان کے پوتے ڈاکٹر سر راس مسعود کے مہمان رہے ۔ وہیں ۳۔اپریل ۱۹۳۶ء کی رات کو خواب میں انہیں سر سید احمد خان نظر آئے اور انہوں نے اقبال کو نصیحت کی کہ اپنی صحت اور تندرستی کے لیے نبی اکرمؐ کے حضور ایک عرضداشت پیش کرو۔ چنانچہ اقبالؔ نے یہی کام کیا مگر ساٹھ سے زیادہ اشعار کی اس درخواست میں ذاتی باتیں دو تین ہی ہیں ۔ زیادہ باتیں اجتماعی اور قومی ہیں ۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اقبال کی خودی پر بیخودی کا کتنا اثر تھا اور وہ قومی کاموں کو ذاتی آرزوؤں پر کس قدر ترجیح دیتے تھے ۔

اقبال نبی اکرمؐ کے حضور عرض کرتے ہیں کہ ان کے طفیل مسلمان موت سے ڈرنا چھوڑ دیں اور زندگی کے جہاد سے جی نہ چرائیں ۔ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے احسان سے ہم مسلمان "توحید" سے آشنا ہوئے تھے، مگر اس زمانے کے مسلمان پیٹ کی خاطر مغرب پرستی کرنے لگے ہیں ۔ ان کی آرزو ہے کہ حضور پاکؐ کے واسطے

سے مسلمان مغرب مآبی سے نفرت کرنے لگیں۔ فرماتے ہیں کہ حضورؐ انور کے طفیل شاعر کو دین کے علم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کی توفیق بھی ملے۔ انہیں صحت و سلامتی اس لیے عزیز ہے کہ مسلمانوں کی کوئی خدمت کر سکیں ورنہ انہیں جلد موت آجانے سے کوئی باک نہیں ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے ایک شاعر امام بوصیریؒ نے نعت شریف لکھنے کی برکت سے فالج کے مرض سے شفا پائی تھی تو کیا عجب کہ اقبال بھی رحمۃ اللعالمینؐ کی رحمت سے مستفید ہو جائیں۔

فرماتے ہیں کہ آواز بیٹھ جاتے سے صبح کے وقت قرآن خوانی کا لطف جاتا رہا ہے اور شاعری بھی بے کیف ہو گئی۔ کڑوی اور بدبودار دوائیں پی پی کر اکتا گیا ہوں۔ ناگوار ذائقے اور بو نے زبان اور دماغ پر خراب اثرات چھوڑ رکھے ہیں۔ طبیب ہنستے ہیں کہ میں تلخ دوا پینے سے چڑھتا ہوں، مگر میں شکر ملا ملا کر وہ ناگوار گھونٹ حلق سے اتار ہی لیتا ہوں۔ یا رسولؐ اللہ، اس گناہ گار مریض کو ایسی ناگوار تکالیف سے نجات دلوائی جائے۔ اس عرضداشت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں عاشقِ رسولؐ شاعر، بڑے معصومانہ انداز میں پیغامبر اکرمؐ سے مخاطب ہوا ہے۔

۱۰۔ ارمغان حجاز: ارمغان حجاز یعنی حجاز کا تحفہ۔ یہ کتاب علامہ اقبال کی وفات کے کوئی ۶ ماہ بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ حجاز، اس عرب سرزمین کا نام ہے جس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ واقع ہے۔ اقبال زندگی کے آخری ایک دو سالوں میں حج اور زیارت کے لیے حجاز کا سفر کرنے کے بے حد آرزومند رہے۔ بیماری نے انہیں سفر سے باز رکھا، مگر خیالی طور پر وہ ان سالوں میں گویا حجاز میں ہی رہے۔ 'ارمغان حجاز' اسی خیالی سفر کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اصل کتاب دو زبانوں اردو اور فارسی میں ہے۔ مگر ہم یہاں فارسی حصے کا مختصر تعارف پیش کریں گے۔ یہ سارا حصہ دو بیتیوں پر مشتمل ہے اور اردو حصے سے تقریباً دوگنا ہے۔ دوبیتی یا رباعی، دو دو شعروں میں اپنی دل کی کیفیت بیان کرنے کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔ اقبال نے اسی سے کام لیا ہے۔ اس کتاب کے پانچ حصے کئے گئے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے حضور (۲) نبی اکرم صلعم کی خدمت میں (۳) مسلمان قوم سے (۴) عالمِ انسانی سے (۵) اپنے دوستوں سے۔

دراصل کتاب کے پہلے دو حصوں کی مناسبت سے اس کا نام 'ارمغانِ حجاز' رکھا گیا ہے، مگر ان دو حصوں میں بھی دوسرا حصّہ 'حضور رسالتمآب' زیادہ قابلِ توجہ ہے۔

پہلے حصّے 'حضورِ حق' میں شاعر اپنے آپ کو حرم کعبہ میں خیال کرتا ہے۔ حرم کعبہ دعاؤں کی قبولیت کا مقام ہے۔ شاعر یہاں خدا سے گلے شکوے کرتا ہے، مسلمانوں کی بہتری کے لیے دعائیں مانگتا ہے اور ایک دو ذاتی آرزوئیں پیش کرتا ہے۔ اسے یہ گلہ ہے کہ مسلمان زوال اور پستی کے گڑھے سے باہر کیوں نہیں نکلتے؟ دردمند اور قابل لوگ دنیا میں ذلیل و خوار کیوں کئے جا رہے ہیں؟ انسان بالعموم خود شناس کیوں نہیں ہو رہے ہیں اور دنیا کے محنت کشوں کی حالت بہتر کیوں نہیں ہو رہی؟ اقبال دعا فرماتے ہیں کہ خدایا موجودہ مسلمانوں میں سے ایک ایسی غیرت مند قوم پیدا فرما جو جلد ہی اپنی پستیوں کا ازالہ کرلے اور دینِ اسلام کے مرتبے کے شایاں نظر آئے، وہ برِّ صغیر کے مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی غلامی کا رونا ایک بار پھر روتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ غلامی نے مسلمانوں کو ایسا بے عمل کر رکھا ہے کہ وہ دین و شریعت کے احکام کو ایک بوجھ جاننے لگے ہیں اور اگر ان احکام کو بجا بھی لائیں، تو ان کی روح سے دور رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی معاشی بدحالی کے بارے میں ایک رباعی کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

"فاقہ کاٹنے والا ایک مرید ایک دن اپنے مرشد سے کہنے لگا کہ خدا کو ہمارا کچھ پتا نہیں۔ وہ ہماری شاہ رگ سے نزدیک ہوگا مگر اسے ہمارے پیٹ کی حالت کی خبر نہیں ہے۔"

ایک دو بیتی میں اقبال مسلمانوں کی روش کی بھی شکایت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ میری سادہ لوحی ہے کہ میں ایک ایسی قوم کی بیداری اور ترقی کا خواب دیکھ رہا ہوں جس کے

علما بھی علم اور یقین کی دولت سے محروم ہو چکے ہیں۔

اقبال کی ذاتی دعا یہ ہے کہ قیامت کے دن اس کے اعمال کا حساب کتاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہ لیا جائے اور اسے اس ندامت سے بچایا جائے۔ وہ اس بات کا بھی آرزومند ہے کہ اس کے خیالات سے خواص کو بہرہ ملے اور وہ عوام کی خاطر اس کے خیالات کو آسان صورت میں پیش کریں کیونکہ بعض باتوں کو عوام شاید براہ راست نہ سمجھ سکیں اور ان کا غلط مفہوم لے لیں۔ وہ مسلمانوں اور دنیا کے کمزور انسانوں کی بیداری کے لئے اپنی شاعری کی مزید توانائی کا بھی طالب ہے۔ ان آرزوؤں کے اظہار کرنے کے بعد شاعر عالم خیال میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو روانہ ہوتا ہے تاکہ وہاں نبی اکرمؐ کے مقدس روضے پر حاضری دے سکے۔ آخری دوبیتی یوں ہے:

"میرا بدن تو تھک کے چُور ہو گیا، مگر روح اس شہر کی آرزومند ہے جہاں مکہ مکرمہ سے ہو کر پہنچ کرتے ہیں۔ خدایا! تو اپنے حرم پاک میں اپنے خاص بندوں کو دیکھتا رہ، مگر مجھے تو اب دوست کی یاد ستا رہی ہے۔"

حضور رسالت مآبؐ والا حصہ ارمغان حجاز کی جان کہا جا سکتا ہے۔ عاشقِ رسولؐ شاعر اس حصے میں کوئی شکوہ و شکایت نہیں کرتا اور اس کا لہجہ سراپا ادب و احترام بنا ہوا ہے۔ پہلے وہ اپنے خیالی سفر کا ذکر کرتا ہے کہ:

"جیسے کوئی پرندہ شام کے وقت اپنے آشیانے کی راہ لیتا ہے، میں بھی اس بڑھاپے میں عاشقانہ سوز و مستی کے ساتھ اسی طرح یثرب شریف کا مسافر بنا ہوا ہوں۔ میں نے سویرے اپنی اونٹنی سے کہا کہ چونکہ تیرا سوار بیمار اور بوڑھا ہے، اس لئے آہستہ آہستہ چل مگر وہ اس مست طریقے سے بھاگ رہی ہے گویا اس کے پاؤں کے نیچے کی ریت ریشم بن گئی ہے۔ ساربان نے اس کی لگام پکڑنا چاہی مگر میں نے منع کر دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بھی میری طرح عشق کی بصیرت رکھتی ہے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھاگ رہی ہے۔ اس کی سیاہ آنکھیں میری طرح آنسو بہا رہی ہیں۔ سحری کے وقت کی اس کی آواز سے میرا دل جل رہا ہے۔ جس شرارِ عشق سے میرا ضمیر

روشن ہے، وہ اس اونٹنی کی نگاہ سے ظاہر ہو رہی ہے۔

ساربانوں کے سالار کو میرے اشعار نے متوجہ کر ہی دیا۔ کہنے لگا یہ کوئی غیر عرب ہے۔ اس کی لے عربوں سے نہیں ملتی مگر شعر ایسے کہہ رہا ہے کہ ان کی تاثیر سے صحراؤں میں خنکی آئی جا رہی ہے۔ میں عراقی کے شعر پڑھ رہا ہوں اور کبھی جامی کے عربوں کے سُر سے میں ناواقف ہوں مگر ساربان کی حدی پڑھنے میں میں بھی شامل ہوں۔"

اوپر کی عبارت میں اقبال کی چند رباعیوں کا آزاد ترجمہ پیش کیا گیا۔ حدی اونٹ والوں کے نغمے کو کہتے ہیں۔ عراقی ساتویں ہجری اور جامی نویں صدی ہجری کے فارسی شاعر ہیں۔ جامی نے بھی اپنے اشعار میں اونٹنی کے سوز و ساز اور عشقِ رسولؐ میں مست ہونے کا ذکر کیا ہے۔

اب اقبال عالمِ خیال میں حضور پاکؐ کے گنبدِ خضرا پر حاضری دیتے ہیں اور اپنی عرض شروع کرتے ہیں کہ:

"یا رسول اللہ، مدد فرمایئے کہ مسلمان کا سوز و ساز جاتا رہا اور مایوسی میں اس کا دل آہ و فغان کر رہا ہے۔ مجھے آپؐ کی محبت و عشق کی تاثیر نے یہ مؤثر آواز دی۔ مگر رونا اس بات کا ہے کہ برِ صغیر میں عاشقانِ رسولؐ کا قحط ہے۔ یہاں کے مسلمان غلامی اور پستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم پر رحم فرمایئے۔ ہم جیسے بدبخت اور مظلوم مسلمان دنیا میں کم ہوں گے۔ میری زبان اور بیان برِ صغیر کے مسلمانوں کی بدبختی بیان کرنے سے قاصر ہیں، مگر میرے ظاہری اور باطنی احساسات آپؐ پر عیاں ہیں۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے مسلمانوں کی گزشتہ دو سو سالہ تاریخ کو یاد کر کے میرا دل لکڑی کے اس کندے کی طرح ہو گیا ہے جس پر قصاب گوشت کاٹتے رہتے ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کے حالات بدلے نہیں۔ اسے ابھی کوئی راہبر و راہنما بھی نہیں ملا۔ ان کی زندگی بے تاب و حرکت ہے۔ اپنی تلواروں کو انہوں نے نیاموں میں ڈال دیا اور قرآنِ مجید کو گھر کے طاقِ نسیان پر رکھ دیا...... ہم غیر اللہ کے سامنے جھک

رہے ہیں۔ آتش پرستوں کی طرح ہم غیر اللہ کے سامنے بھجن بجا رہے ہیں۔ میں دوسروں کا شکوہ کیا کروں اپنا شکوہ کر رہا ہوں کہ میں آپؐ سے کوئی نسبت رکھنے کا اہل نہ تھا۔"

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عشقِ رسولؐ نے انہیں غیر معمولی قوت دے رکھی ہے۔ یہ قوت ان کے شعر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے مگر اکثر مسلمانوں کو ان کے تصورِ خودی کی قدر ہے نہ ان کے شعر کی۔ وہ انہیں ایک عام شاعر سمجھتے ہیں اور ان سے غزل اور تاریخ وفات والے اشعار لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ انہیں فلسفیوں، ملاؤں اور صوفیوں کی صحبت سے کوئی لطف نہیں ملا۔ فلسفیانہ بحثیں سردردی ہیں جبکہ معاصر ملاؤں اور صوفیوں کی بے عمل باتوں سے دل میں کوئی سوز و گداز پیدا نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے افکار اور سوزِ دل کے اعتبار سے اپنے آپ کو ساری دنیا میں تنہا پاتے ہیں۔ اس لیے پیغامبر اکرمؐ سے اپنے احساسات عرض کر رہے ہیں کہ اس بے سوز زمانے میں ان کے دن بڑی مشکل سے کٹ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ انہیں جو کچھ ملا وہ عشقِ رسولؐ کے طفیل ملا مگر اکثر مسلمان عشقِ رسولؐ کی اہمیت سے غافل ہیں۔

"ابھی میری مٹی میں چنگاریاں موجود ہیں۔ ابھی میرے سینے میں آہ سحر گاہی کی ہمت ہے۔ نبی اکرمؐ اگر اپنی ایک تجلی سے نوازیں تو دیکھیں گے کہ بڑھاپے کے باوجود ابھی مجھ میں بصیرت موجود ہے..... آپؐ کے فیض سے ہی مجھے یہ سوز و ساز ملا۔ آپ کے آبِ زمزم نے ہی میرے انگور کے درخت شاداب کر رکھے ہیں۔ چونکہ میرے سینے میں تو جہ زرلی اب کا رازدار ہے۔ اس لئے میری درویشی کے سامنے جمشید کی سلطنت کی کوئی حیثیت نہیں ہے...... یا رسول اللہ! میری خاک سے ایک گلستان وجود میں آجائے اور میرے آنسو لالہ کے پھول کی لالی میں مل جائیں۔ اگر میں حضرت علیؓ کی شمشیر اٹھانے کے اہل نہیں، تو مجھے حضرت علیؓ کی تلوار جیسی تیز نگاہ تو مل جائے۔"

سعودی عرب میں حضور پاکؐ کے روضے کے سامنے کوئی غیر شرعی حرکت نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً روضہ پاکؐ کے سامنے سجدۂ تعظیمی کرنا، غیر معمولی جھکنا اور جالیوں کو

بوسہ دینا ممنوع ہے۔ 'ارمغان حجاز' کی تصنیف کے وقت سعودی عرب کے حاکم ملک عبدالعزیز تھے۔ اقبال ایسا محسوس کرتے ہیں کہ خیال کی رو سے وہ روضۂ پاک پر حاضر ہیں اور محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر انہوں نے پیشانی زمین پر رکھ دی ہے اور اتنے میں ملک عبدالعزیز وہاں آنکلتے ہیں اور اس حرکت پر اعتراض کرتے ہیں۔ شاعر نے اس اعتراض کا جواب یہ سوچ رکھا تھا:

"ملک عبدالعزیز، آپ بھی دوستؐ کی محبت کی شراب اس طرح پی لینے کہ ہمیشہ مست کے ساتھ رہتے۔ میں سجدہ نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی پلکوں سے دوست کے دروازے کی گرد جھاڑ رہا ہوں۔ کیا یہ بھی قابلِ اعتراض ہے؟" اس ایمان افروز حصے کی ایک مزید رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"یا رسولؐ اللہ! مجھے یہی آغاز اور انجام چاہیے کہ آپؐ کے کوچۂ محبت کی ایک بات کر لینے کا سوز حاصل کر لوں۔ میں تو اس جرأتمند عاشقِ رسولؐ کی ہمت کا عاشق ہوں جو خدائے تعالیٰ سے بھی کہہ دے کہ مجھے محمد مصطفیٰؐ کافی ہیں۔"

ارمغانِ حجاز کے تیسرے حصے کا عنوان 'حضور ملتِ مسلماں' ہے۔ یہ کافی طویل باب ہے اور اس کی کئی ذیلی سرخیاں ہیں جیسے محمد مصطفیٰؐ کے طریقے پر چلو، خودی، صوفی ملّا، رومی، عرب شاعروں سے خلافت و ملوکیت، مسلمان عورتوں سے، عصرِ حاضر اور تعلیم۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کے مسلمانوں کو اس وقت ترک اور مصری مسلمانوں کی ترقی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ان کی 'خودی' بیدار ہوئی تو وہ ممالک طاقت ور بننے لگے اور چند سالوں سے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ اقبال صوفیہ اور علما کا احترام کرتے تھے، مگر اکثر معاصر صوفیوں اور ملاؤں میں انہوں نے بے عملی ہی دیکھی، اسی لئے انہوں نے ان پر نکتہ چینی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ صوفیوں اور ملاؤں کو دینوی "پستی کی کوئی پرواہ نہیں ــ مغربی استعمار دین و ایمان کی چولہیں ہلا رہا ہے مگر یہ لوگ حاکموں کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہے ہیں اور 'یا الٰہی آخرت اچھی ہو' کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ ان کی تاویلات سے اللہ کی پناہ۔ وہ ذرا ذرا سے اختلافات پر لوگوں کو جہنم رسید کر رہے ہیں مگر غلامی کے

جہنم سے انہیں کوئی چڑھ نہیں۔ اقبال نے یہاں ایک بار پھر رومی کو پڑھنے کی ضرورت بتائی ہے۔ عرب شاعروں سے اقبال فرماتے ہیں کہ ان کی طرح قرآن مجید کی تعلیمات کے سمندر میں غوطہ زنی کریں اور مسلمانوں کو عروج اور ترقی کی دعوت دیں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی برکت سے میں نے بر صغیر کے مسلمانوں کے ۱۳۰ سالہ دور زوال کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اقبال نے یہاں سلطان ٹیپو کی شہادت سے شروع ہونے والے دورِ زوال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خلافت و ملوکیت کے عنوان پر اقبال نے فرمایا ہے کہ خلفائے راشدہ کے دور سے بعد کی خلافت، ایک طرح کی ملوکیت اور بادشاہت رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان عورتوں سے یہاں بھی اقبال نے تقریباً وہی باتیں کی ہیں جو پہلے مثنوی رموزِ بیخودی میں کر چکے تھے۔ یہاں اقبال نے اپنے بعض تعلیمی نظریات بھی پیش کئے ہیں۔ اقبال صحیح تربیت دینے، ادب و آداب سکھانے، دینی اور فنی تعلیم اور اخلاقی اوصاف سکھانے پر زور دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ غلط تعلیمی نظریات قوموں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے تعلیم وہی اچھی ہے جو 'خودی' کی نشوونما کے لیے سازگار ہو اور جو طالب علموں کو آزادانہ سوچنے میں مدد دے۔

ارمغان حجاز کا چوتھا حصہ حضورِ عالمِ انسانی ہے۔ اس حصے میں اقبال صرف مسلمانوں سے نہیں، پوری عالمی برادری سے مخاطب ہیں۔ اقبال کے بارے میں یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ پاکستان اور بر صغیر کے مسلمانوں کے قومی شاعر ہیں بلکہ اب پورا عالم اسلام ان کو اپنا قومی شاعر مان رہا ہے، مگر اس کے ساتھ وہ عالمی مفکر اور شاعر بھی ہیں۔ عام انسانوں کے لئے اقبال نے مندرجہ ذیل امور خاص طور پر پیشِ نظر رکھے ہیں:

خود شناسی، سخت کوشی، احترام انسانی، رواداری، حفاظتِ دل، انسانی تقدیر کی آزادی کے حدود اور ناری و خاکی ابلیسوں کی پہچان۔ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو علامہ مرحوم کے قائم کئے عنوانوں سے ہی ان کے افکار کا پتہ چل جاتا ہے۔ سخت کوشی

اور تکلیف برداشت کرنے کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں کہ :

" زمانے کی تکالیف کا گلہ چھوڑ دو۔ جس نے تکلیف نہ اٹھائی ہو، وہ ناخالص اور کچا رہتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ جن پتھروں پر آبشاروں اور سوتوں کا پانی بہتا رہے، وہ کس قدر صاف اور خوبصورت ہو جاتے ہیں "۔ انسانی تقدیر کی آزادی کے بارے میں ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

" اٹلی کے شہر روم میں ایک بڈھے پادری نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا ایک لطیف نکتہ یاد کر لو۔ ہر قوم اپنی موت کا سامان خود فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ تجھے تقدیر کے مسئلے نے مار ڈالا، اور ہمیں تدبیر کے نظریے نے "

اگر اقبال نے واقعی کسی بڈھے پادری سے بات کی ہو، تو یہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہوگا جب آپ اٹلی گئے تھے۔ اقبال کا مدعا یہ ہے کہ مشرقی قومیں خصوصاً مسلمان اپنے آپ کو تقدیر کا پابند مانتے ہیں جبکہ مسیحی اور دوسری مغربی قومیں اپنی تدبیر کو بالکل آزاد ماننے لگی ہیں۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ انسان بعض کاموں میں مجبور ہے اور بعض میں آزاد۔ انسان کو چاہیے کہ کوشش کرے اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دے۔ خاکی اور ناری شیطان والا حصہ بڑا دلچسپ ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے کمزور ایمان والے انسانوں کی گمراہی کے لئے خاکی شیطان کافی ہیں۔ ناری ابلیس آج کل بے کار بیٹھا ہوا ہے اور اس کی اولاد یعنی شیاطین بھی آرام فرما ہیں کیونکہ نئی تہذیب کے خاکی شیطان ان کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ضرب کلیم، میں اقبال نے مغربی تہذیب پر اسی طرح کی ایک طنز اردو اشعار میں بھی کی تھی کہ ؂

نری حریف ہے یارب سیاست افرنگ مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

ارمغان حجاز کا پانچواں یا آخری باب 'یاران طریق' کے عنوان سے ہے۔ اقبال نے کبھی کبھی اپنے بعض ارادتمند ملاقاتیوں کو دوست کہا اور ان کی موجودگی پر خوشی کا اظہار کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے اور ان کے ہم خیال

دوست جو اُن کا ذوق و شوق رکھنے والے ہوں، نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس حصّے میں ایک دو بیتی کا ترجمہ یوں ہے:

"مَیں جب دنیا سے چلا تو سب نے یہی کہا کہ ہمارا آشنا اور دوست تھا۔ لیکن میری زندگی میں کسی نے نہ جانا کہ اس مسافر نے کیا کہا، کس سے کہا اور تھا کون؟"۔ اسی کتاب میں" درحضور رسالت مآبؐ" کے عنوان سے ایک رباعی اس مفہوم کی ہے کہ:

"مَیں ساری دنیا میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں۔ رازدار دوستوں کے وجود سے میں محروم ہوں۔ مگر میں عجیب معصوم انداز میں اپنی تنہائی کو فریب دیتا ہوں اور اپنا دکھ درد اپنے ہی دل سے بیان کرتا ہوں"

اس سے واضح ہے کہ 'یارانِ طریق' ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں اقبال کے آشنا، ان کے ہم پیشہ وکیل، شاعر، ادیب اور ان کے سب دوست شامل ہیں۔ اس حصّے کی اہم باتوں کو مندرجہ ذیل عنوانات دئے جا سکتے ہیں:

شاعر کی شخصیت، بے نیازی اور غیرت، عشقِ رسولؐ، حقیقی عبادات، خودی

اقبال اپنے آپ کو قلندر کہتے ہیں۔ قلندر، آزاد طریقے کے درویشوں کا ایک گروہ رہا ہے۔ اس حصّے کے آغاز اور اختتام دونوں میں اقبال نے اپنی قلندری اور بے نیازی کا ذکر کیا ہے۔ وہ دوسروں کو بھی آزاد روش والا دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ فرماتے ہیں کہ موت سے بے خوفی اور دولت سے بے نیازی دل کی زندگی کے اصول ہیں۔ فرماتے ہیں کہ فلسفہ و منطق سے اب انہیں تشفی نہیں ہو رہی۔ ان بحثوں سے فارسی شاعروں کے حکیمانہ شعر کہیں بہتر ہیں۔ 'ارمغان حجاز' کے پانچوں بابوں کے سرنامے ہیں جن میں ایک ایک شعر ہے یا ایک ایک دو بیتی۔ اس حصّے کے سرنامے والی دو بیتی کو اقبال کے مزار کی ایک بیرونی دیوار پر لکھ دیا گیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یوں ہے:

"دوستو آؤ کہ مسلمان قوم کی بگڑی بنا دیں اور زندگی کا جوا مردوں کی طرح کھیل گذریں۔ آؤ شہر کی بڑی مسجد میں ایسا روئیں کہ ملّا کے سینے میں بھی دل پگھل اور پسیج جائے۔"

مگر اس باب کی ۷۳ رباعیوں میں مُلا یا صوفی سے اور کوئی چھیڑ چھاڑ نظر نہیں آتی۔

ذیل میں اس حصّے کی چند دو بیتیوں کا اردو ترجمہ اور ان کے مناسب عنوانات پیش کرتے ہوئے اقبال کی فارسی کتابوں کا یہ مختصر تعارف ختم کیے جا رہا ہے۔

بے نیازی۔ (رباعی ۸ و ۲۰)

"میں درویش ہوں۔ میرا سر و سامان نگاہ ہے۔ میری نگاہ میں دوستوں کے پہاڑ گھاس پھوس کے تنکے ہیں۔ یہ بات یاد رکھو کہ کسی بادشاہ کے ہاتھ میں پرورش پانے والے اور اس کے پاس قید رہنے والے باز سے وہ کوّا بہتر ہے جو پارسیوں کے مرگھٹ پر آزادانہ لاشیں کھاتا رہتا ہے۔"

"اہلِ ہنر کا بڑا سرمایہ یہ ہے کہ وہ خدا کی بے نیازی کی صفت اپنائے رہتے ہیں اور نورجہاں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انہیں اچھے لباس، سونے چاندی، لعل و جواہر اور سنہری پیٹیوں والے غلاموں کے دست بستہ کھڑے رہنے سے کوئی رغبت نہیں ہوتی۔"

خودی کی حفاظت۔ (رباعی ۲۶ و ۳۰)

"اے مسلمان، تو ہر دارا اور جمشید کو سجدہ کرنے لگا ہے۔ بے وقوف، اس طرح حرم اسلام کو بے عزت نہ کر۔ کسی مغربی اور انگریز کے سامنے اپنی کوئی حاجت مت پیش کرو بلکہ حاجت کے اس بت کو دل کے طاق سے باہر نکال کر دُور پھینک دو۔"

"ایک بوڑھے کی نصیحت مجھے یاد ہے کہ آدمی چونکہ اپنی روح کے سہارے جیتا ہے لہٰذا اس کمینے شخص سے دوری اختیار کر لینا چاہیے جو روح کو گروی رکھ کر صرف جسم کے ذریعے جینے کی کوشش کرے۔"

چند طنز آمیز باتیں۔ (رباعی ۴۴، ۴۶)

"روزی دینے کا ڈھنگ کوئی انگریز سے سیکھے۔ ایک سے چھینتا ہے اور دوسرے کو کھلاتا ہے۔ وہ شیطان کو بھی اس طرح کھلاتا ہے کہ خدا کو حیرت ہوتی ہے۔"

"خدا نے ایک بہشت حرمِ اسلام کے نیک اور پاک باز افراد کے لئے بنائی اور ایک

دوسری بہشت ہمت اور جرأت والوں کے لئے ۔ برصغیر کے مسلمانوں کو خوش خبری دے دو کہ وہ مطمئن رہیں کیونکہ مفت کی ایک تیری بہشت بھی موجود ہے ۔"

تازہ بتازہ نو بنو تراکیبِ اقبال

کلامِ اقبالؒ کے مطالعے کے دوران تازہ بتازہ نو بنو تراکیب پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ مرحوم نے الفاظ کو نئے معانی دینے کے علاوہ معتد بہ حد تک ترکیب سازی بھی کی ہے۔ مگر چونکہ ان کی وضع کردہ بعض تراکیب کو استعمال ہوتے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے، آج اس امر پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ خودی، بیخودی، خود پرست اور خود شکن قسم کی تراکیب کا واضع کون تھا۔ تراکیبِ اقبال ایک وسیع موضوع ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک مقالے میں اس کے صرف بعض پہلوؤں کی طرف ہی اشارے کیے جا سکتے ہیں۔ اقبالؒ نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ زبانوں کے ارتقائ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے خیالات سے مالا مال ہوتی رہیں[۲]۔ ان کے نزدیک جہانِ نو بھی وہی ہے جو افکارِ نو سے بہرہ مند ہو:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا[۳]

اقبال نے اُردو اور فارسی زبانوں کو جن افکارِ نو سے مالا مال کیا، ان کی کیفیت تا ابد بیان ہوتی رہے گی، مگر یہاں ہماری توجہ ان کی بعض تراکیب کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔

۱۔ یہ عنوان تراکیبِ اقبال سے ہی ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو جاوید نامہ، "تمہید زمزمۂ انجم":

در رہِ دوست جلوہ ہاست تازہ بہ تازہ نو بنو
صاحبِ شوق و آرزو دل نہ دہد بہ یکلیات

۲۔ شیخ عطاء اللہ، مرتب، "اقبال نامہ" (لاہور: شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱ء)، ۸۵/۲ (خط بنام مولوی عبدالحق)۔

۳۔ "ضربِ کلیم"، قطعہ "تخلیق"۔

جنہیں اپنے خداداد مذاقِ سلیم[۱] اور زبان شناسی کی استعداد سے اُنہوں نے وضع کیا اور نہایت چابک دستی کے ساتھ اپنے کلام میں استعمال فرمایا ہے۔

جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے، تراکیبِ اقبال کے بارے میں ابھی کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی گئی، مگر ایک دو ضمنی اشارے ضرور ملتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنے ایک مقالے[۲] "اقبال کی زبان" میں، اقبال پر فارسی زبان کے ایک عالم اور زباندان کی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے "زبورِ عجم" (غزلیات) کی چند تازہ تراکیب کی مثال دی تھی: طائرِ پیش رس، زادۂ باغ و راغ، حوصلۂ زمزمہ پرداز، آہ خانہ زاد، گرہ خوردہ نگاہ، شعلۂ نم ناک، آئندہ نگاری، حاضر آرائی، تہی ادراکی، تازہ کاری، گراں رکابی، افسونِ فرنگ یہ ایک درجن تراکیب مشتے از خروارے کا مصداق رکھتی ہیں کیونکہ کتاب مذکور میں کئی نئی تراکیب دیکھی جا سکتی ہیں، جیسے جوانانِ نو نیاز، مستیٔ شوق، غنچۂ دل گرفتہ، نشترِ چنگیزی جہانِ تشنہ مہر، نگاہِ سرمہ سا، مردادادان، غلط ریز، اشارتہائے پنہاں، متاعِ ناروا، دلِ ہزار پارہ، شکوۂ بے نیازی، قدر انداز، خانہ برانداز، فسون کاریٔ دل، فاختۂ کہن صغیر، پیچاکِ ہست و بود، فکر گرہ کشا، نگاہِ نارسا، فروغ کار، آنسوئے افلاک، پیمانۂ ادراک، گراں خیز، غمزۂ چالاک، جہدری، خیبری، نقش پرداز، چشمکِ محرمانہ، داغِ نارسائی، کم عیار، دیریاب، بیگانہ اندیش، دیدۂ تر، بینائے کور، بے مدار، نو بنو، نفس شماری، پختہ ترک، حسنِ بے پایاں، دامانِ ہستی، چمن سرا، دانائے راز، کراری، تماشا پسند بسیاری، گہرہائے نغمہ، مئے جوانہ، رقیبِ خام سودا، انجمنِ شوق، نرگس نگراں، آہِ اثر باختہ، دارائے جہاں، پرویزیٔ افرنگ، چنگیزیٔ افرنگ، پے سپر، گسستہ نفس، شبستانِ وجود، غلط خرامی، دانائے فرنگ، جوئے کہکشاں، مردِ خود آگاہ، دلیلِ کارواں (= قافلہ سالار)، مہرِ غزنوی، دردِ ابازی، زورِ بازوئے حیدر، ادراکِ رازی، کارِ نفس، ہنگامۂ افرنگ، خاوریاں، نورانیاں، شہر آشوب، صورت گری،

---

[۱] شیخ عطاء اللہ، مرتب کتاب مذکور، ۱/۵۷ (خط بنام سردار عبدالرب نشتر)۔

[۲] "بحث و نظر" لاہور (س ن)، نیز ماہ نامۂ ماہِ نو، اقبال نمبر، کراچی، اپریل ۱۹۷۰ء

دانش مغر بیاں، تن فراموش، کم روائی، کافر ماجرائی، چراغ لالہ، بلند بال، انجمن آرا، نگاہ دار خود، بیاضِ امکان اور نقشِ نوی، وغیرہ۔ جن اسّی (۸۰) تراکیب کا یہاں اضافہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض اقبال کی ان کتابوں میں بھی ملتی ہیں جو "زبورِ عجم" سے قبل[1] شائع ہوئی ہیں نیز بعض پیشترو شعرا و ادبا کے ہاں بھی، مگر اقبال کا استعمال خاص ہے، اور ان کی مدت آفرینی ایسی ہے کہ مستعمل تراکیب بھی (گو ان کی تعداد قلیل ہے) نئی شان سے جلوہ گر ہوئی ہیں۔

علامہ مرحوم کی ترکیب سازانہ صلاحیت کے بارے میں دوسرا اشارہ ایک ایرانی ناقد، ڈاکٹر احمد علی رجائی بخارائی، نے کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے مندرجہ ذیل شعر کی توضیح میں ایک مبسوط مقالہ[2] لکھا اور شعر کے مصرعِ ثانی میں مستعمل تین تراکیب کی دل آویزی اور معنی خیزی پر خاطر خواہ بحث کی ہے:

فطرتِ آشفتہ کہ از خاکِ جہانِ مجبور خودگرے، خود شکنے، خودنگرے پیدا شد

منقولہ بیت "پیامِ مشرق" میں سے ہے[3] مذکورہ مقالہ نگار نے "ہنرِ شاعریِ اقبال" کے عنوان سے ایک دوسرے مضمون[4] میں لکھا ہے کہ اقبال نے فارسی میں نئی تراکیب وضع کرنے کی غیر معمولی صلاحیت دکھائی ہے۔ ان کے بقول، مثال کے طور پر کتاب "پیامِ مشرق" کے ہر چوتھے صفحے پر اوسطاً ایک نئی ترکیب مل جاتی ہے۔ گویا اس کتاب میں پچھتر نئی تراکیب کی موجودگی کا امکان ہے، مگر ناقد نے صرف پینتیس مثالیں نقل کی ہیں: رنگین بیاں، بے چگوں، پختہ کار، نرم خیز، حرف باز، بیگانہ شو، مژگاں گسل، سکندرِ فطرت، کم نظر، چمن زاد، خلوت آباد، صنم کدہ، جادو نوا، شعلہ زار، آئینہ تاب، آتش گزار، کلاں گیر، پختہ تدبیر، ہمہ گیر، صید بند، رمز آشنا

---

[1] یعنی "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی"، "پیامِ مشرق" اور "بانگِ درا"۔

[2] "مجلہ دانش کدہ ادبیات"، مشہد یونی ورسٹی، اپریل ۱۹۶۵ء

[3] نظم "تسخیرِ فطرت"، (میلادِ آدم)

[4] "مجلہ دانش کدہ ادبیات"، مشہد یونی ورسٹی، اپریل ۱۹۶۷ء

زخمہ ور، ادافہم، خودگیر اور باختہ رنگ۔ ان تراکیب میں سے بعض برصغیر پاکستان و ہند کے شعرا و ادبا کے ہاں مستعمل نظر آتی ہیں، مگر ایرانیوں کے ہاں یہ تعبیرات اور الفاظ نئے ہیں۔ لیکن "پیامِ مشرق" میں نئی تراکیب ڈاکٹر رجائی بخارائی کے اندازے سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ راقم السطور سرِدست صرف مندرجہ ذیل مفرد الفاظ اور مرکب تراکیب کی طرف توجہ دلا رہا ہے: نوائے سینہ تاب، حدیثِ دلبری، دوں پرور، سست رگ، خود فروش، قلزم شگاف نارائی، پاچراغ، تبسم ریز، آذر نہاد، آزار گوش، شعلہ نوش، لبتستان، بستان سرا، مئے برنا و رطۂ بود و عدم، خوبانِ بے پروا، سوزِ ناتمام، ذوقِ مہجوری، یَمِ ایام، بیچوں، کودک منش، آئینہ ساز، خاکی نہاد، عالمِ کون و فساد، حلقۂ شام و سحر، خود پرست، خدا جوئے، ترکستان ضمیر، کُن فکاں، آواز درا، درائے کارواں، شاعرِ جادو نگار، مئے آئینہ تاب، لالائی، قبائے زندگانی: گل دو رو، خم خانۂ فطرت، ماہ تمام، چراغِ لالہ، خونیں جگر، سست رگ، پردگی، پردہ در، دو حرص، غو تندر، تنگ مایہ، دوں نظر، کم سواد، شہیدِ جستجو، آنسوئے گردوں، چشمِ تماشا، بادۂ ناخوردہ، بود و نبود صفات، دیر بینہ تابی، نو آفریں، برق سبک سیر، جلوہ گاہ شہود، کشمکش و جود، سست نہاد، پروانگی، حق اندیش، فتنہ ریا، فتنہ زا، ممکناتِ جسم و جاں، مرد گزیں، یک فنی، ساحل افتادہ، گہوارۂ سحاب، نخچیر گر، حرفِ نشاط آور، پختہ کار، باد سنج، غازۂ تہذیب، افسونِ قلم، بلبلِ شوریدہ، کارگاہِ حیات، خونیں جگر، حریم سینہ، خلوتی، خویشتن نگر، نوائے دل گداز، پروگیانِ ساز، قافلہ نیاز، جانِ نیم سوز، عروسِ لالہ، قطرۂ محال اندیش، رمیدہ بو، معرفتِ مشتری، نوائے بے سرود، تیز ترک، آہ شرر ریز، آشوب بلاکو، ہنگامۂ چنگیز، چشم کرشمہ زا، نوائے پریشاں، آتشِ تبریزی، تنگ افشانی، زمزمہ درا، کم طلبی، حرفِ شوق انگیز، دلِ خونیں نوا، عجم رمیدہ بو، فطرتِ اضداد خیز، عقلِ ناپروا، کار فرما، پیچاکِ زلف پُر شکن، بادۂ سر جوش اور عقلِ فسوں پیشے۔

اُردو تراکیب ۔ دونوں مثالیں اقبال کی فارسی ترکیب سازی کی تھیں۔ ان کی اُردو تراکیب سازی جداگانہ توجہ کی محتاج ہے مگر اقبال کی بہت کم ایسی تراکیب ہیں جو ان کی فارسی کتابوں تک محدود رہیں، اور کلیاتِ اردو میں وارد نہ ہو سکیں۔ بات دراصل یہ ہے

کہ میرزا غالب کی مانند اقبال کی اُردو فارسی سے اقرب ہے اور اُردو میں انہوں نے فارسی کی وہی تراکیب استعمال کرنے سے اجتناب کیا ہے جن سے کلام اجنبی بن سکتا تھا، اور ایسی ترکیبوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یہاں اقبال کی "فارسیت" سے بحث کرنا بے محل ہے، مگر مجملاً اس امر کی طرف اشارہ ناگزیر ہے کہ اقبال نے فارسی سابقوں، لاحقوں، محاوروں اور امثال سے اپنے اُردو کلام میں بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے گو غالب کی طرح اپنی اُردو شاعری کو "رشکِ فارسی" نہیں کہا، مگر حقیقت میں وہ ایسی ہی ہے۔ ذولسانین شعرا میں غالب کے ابتدائی کلام میں فارسی تراکیب زیادہ ہیں، مگر اقبال کے ہاں مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ "فارسیت" میں اضافہ ہوتا رہا ہے جیسا کہ شیخ سر عبدالقادر نے بھی "بانگِ درا" کے دیباچے[۲] میں لکھا ہے۔ مثنوی "اسرارِ خودی" کے آغازِ تصنیف سے اقبال کی بیشتر توجہ فارسی گوئی کی طرف منعطف ہو گئی تھی، اور اس کے بعد اُنہوں نے اُردو میں جو کچھ کہا، اس پر "فارسیت" کی چھاپ زیادہ نمایاں ہونے لگی۔ "اسرار و رموز" ("اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" نام کی مثنویاں) ۱۹۱۸ء تک شائع ہو گئی تھیں۔ ان مثنویوں میں اقبال کی نئی فارسی تراکیب کی ایک فہرست ملاحظہ ہو: لطفِ خرام، تخلیقِ مقاصد، شکوہ آشوب، سخت کوش، سخت کوشی، تن پرستی، جنگاہ[۳] (= جنگ + گاہ)، درائے کارواں، اندازِ بیاں[۴]، ذوقِ عمل، تجلی زار،

۱؎ غالب نے کہا ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی — گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

۲؎ "کلیاتِ اقبال اُردو" ("بانگِ درا")، ص ۱۷۔

۳؎ لفظ "جنگاہ" کو اقبال "جاوید نامہ"، "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" میں بھی لائے ہیں۔ یہ مرکب لفظ (ایک گ حذف کرکے) کسی دوسرے متقدم شاعر کے ہاں نظر نہیں آیا۔

۴؎ لفظ انداز (بمعنی اسلوب اور طرز) ایرانی فارسی میں نہیں آتا۔ برصغیر کے شعرائے فارسی کے ہاں البتہ مستعمل رہا ہے۔

بیابانِ طلب، جگر پرکالہ، کم غو نما، شکوہ سنج، دیدۂ امکاں، ندرت کوش، جذبِ خاک، نگر آشام، دانشِ حاضر، دانشِ نو، گلبرگ (= برگِ گل، اضافتِ مقلوب کے طور پر) نم گر افشاگر، یک اندیش، یک بیں، برگیر، گردوں آستاں، کیوں جناب، جولانگر، خود نما، خودشکن، وِنا اندیشہ، نابود مند، مئے نوشیں، گردوں فر، گوہر گر، آسان گزار، نفسہائے رمیدہ، مزرعِ تسلیم، زرفروش، خطِ اندیش، یک نما، سرائے آب و گل۔ اقبال خواں حضرات توجہ فرمائیں گے کہ ان میں سے اقبال کی معدودے چند تراکیب اقبال کے اُردو کلام میں وارد نہیں ہو سکیں مگر اکثر موجود ہیں۔

سابقے اور لاحقے۔ فارسی زبان کی ترکیب سازانہ استعداد سابقوں اور لاحقوں (پیش آوندہا و پس آوندہا) کے استعمال میں بیشتر جلوہ گر ہے۔ نفی، اضداد اور فاعلی (مرخم اور مختصر صورت میں) علامات کے حامل "وندہ" اس زبان کی تزئین کا باعث ہیں۔[۵] اُردو نے فارسی سے بہت کچھ لیا، مگر وہ صوتیات اور نحو سے زیادہ الفاظ کے ضمن میں اس زبان کی ممنون و مشکور رہی ہے۔ الفاظ میں اسما اور صفات اُردو نے فارسی سے زیادہ لیے ہیں اور اس سلسلے میں "تراکیب" نے زیادہ کام کیا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عربی وغیرہ کے سابقے اور لاحقے بھی بعض تعرفات کے ساتھ فارسی کے ذریعے اُردو میں وارد ہوئے ہیں۔ اقبال نے ان سابقوں اور لاحقوں کے ذریعے اُردو اور فارسی ترکیب سازی کا کمال دکھایا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں: ہنگامہ آفریں، یاس انگیز، آسماں گیر، رہ نورد، خواجہ پرستی، نے نواز، نواگر، نسب گیر، جگر دار، جگر تاب، خروش آموز، نو خیز، آبِ نشاط انگیز، دیر یاب، دیر پیوندی، شکر خا، نیشتر گر، بے بصر، خاک باز، خارا شگاف، سحر خیز، کم آمیز، انجم شناس، تنگ بخشی، افرنگ زدہ، کم نگاہ، عقدہ کشا، تن آساں، گراں بیر، تاب دار، ناخوب، التفات آمیز، بے نیشی، آدم کشی، آب یاری، بے نوری، بے لذتِ نیاز، بے شرف، باشرف، بیرنگی، کم اوراقی، بے حضوری، بے ذوق، بے نظیر،

---

[۵] جیسے خوب سے ناخوب۔ نواگر، کارساز اور دل دار قسم کے اقسام کے آخر میں "ندہ" مرخم و محذوف ہوتا ہے۔

بے زری، بے ساز و براق، بے محنتِ پیہم، تاب ناکی، بے مہریٔ صیاد، بلند نامی، پاک باز، پایاب، پردہ شگاف، خود آگاہی، تقدیر شکن، تیر نیم کش، پُرکار، تیز جولاں، تازہ صفیری، کہنہ صفیر، تر دماغ، تیز بیں، جرأت آموز، جہاں بینی، جگر تشنہ، جگر سوز، چشمِ غلط بیں، حقیقتِ دل خراش، حق اندیش، حسنِ بے پروا، گلگونہ فروش، غلط بینی، خود بینی، خوش اندیش، خارا تراشی، ناخوش اندامی، خوش آہنگ، خوش اندیشہ، خوش دل، خیبر شکن، نور افگن، خرد سوز، خود گیر، خوں گرفتہ، خود فریبی، خدا فریبی، خود گزینی، دیدہ ور، دیوِ بے زنجیر، دستِ دولت آفریں، دہر آشوبی، درویشِ بے گلیم، درد آشنا، دیر گیر، کم نظری، دونی پسند، ذوقِ آتش آشامی، روشِ بندہ پروری، راہ رو، نکتہ داں، زباں کار، زخمہ ور، زحمت کشِ پیکار، زمیں گیر، زود رس، زن شناس، زجاج گر، زہر آلود، سود فراموش، سیل ہمہ گیر، سادہ اوراقی، سخن رس، سرخوش، سینہ سوز، سربلندی، سر بزیری، سکوں پسندی، سیاہ روز، سینۂ بے سوز، گردوں نورد، شانِ دلآویزی، شعلۂ نم خوردہ، طلسمِ بے خبری، عشقِ گرہ کشا، عقدہ کشا، عالم آشوب، غارت گر، غم خواری و کم آزاری، فغانِ بے شرر، فلسفہ زدہ، قبا پوش، قافلۂ سخت جاں، کہنہ ادا، کوچہ گرد، کور نگاہ، کرمکِ شب کور، کم یاب، کتاب خواں، کردارِ بے سوز، دل سوز، مومنِ جانباز، معرکہ آزما، نازن، نامحکمیٔ دل، نسبتِ خویشی، نالۂ بے باک، نقش گر، نخیلِ بے رطب، نامرادی، نابصیری، نکو فرجام، نگونسار، نفس گزاری، ہم جوار، ہم نبرد، ہم عناں۔ یہ تمام مثالیں اقبال کے اُردو کلام سے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ علامہ مرحوم نے سابقوں اور لاحقوں کے استعمال سے کیسے چست الفاظ وضع کیے۔ یہ الفاظ فاعلی یا مفعولی صفات کے نمونے ہیں۔

پسندیدہ الفاظ اور تراکیب۔

ہر ادیب اور شاعر کے کچھ پسندیدہ الفاظ ہوتے ہیں جنہیں وہ اکثر استعمال کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی یہ امر مشہود ہے۔ ان کے پسندیدہ الفاظ اور تراکیب اُردو اور فارسی کلام میں مشترک ہیں۔ ان کی لفظیات سے حسن، حرکت و عمل اور جرأت و ہمت مترشح ہے۔ شاعری کے علاوہ، اقبال کے مضامین، مکاتیب، نگارشات، بیانات اور ملفوظات کے مجموعوں میں بھی باشکوہ الفاظ کی فراوانی ہے اور ان الفاظ نے

اُردو کے دامنِ لغت کو وسیع تر کر دیا ہے۔ اقبال نے اسمِ معرفہ کو مصدری صورت میں استعمال کر کے نئے معانی پیدا کیے ہیں۔ اسمِ نکرہ (روباہ، زاغ، چرغ، شاہین اور شبیر وغیرہ) کا مصدری استعمال بھی ان کے ہاں بے حد معنی خیز ہے۔ دراصل اقبال کی فکرِ ہمہ گیر پر تحقیقات اور تتبعات کے سلسلے نے اقبال کی شاعرانہ اور ادیبانہ شان کو کسی قدر بے توجہ بنائے رکھا ہے، مگر اس پہلو پر بہر حال توجہ ناگزیر ہے۔ علامہ مرحوم کے ستارہ، لالہ، جگر اور دل وغیرہ سے مربوط استعارات اور تلازمات بھی ایک مفصل گفتگو کے متقاضی ہیں مگر سرِ دست ذیل کے چند الفاظ اور تراکیب پر غور فرمائیں:

آرزو، بے خودی، خودی، اُمتِ مرحوم، ملتِ بیضا، موجِ مضطر، چراغِ لالہ، عروسِ لالہ، لالہ خونین کفن، لالہ صحرائی (= اسلامی تہذیب) لالۂ نعمانی، لالۂ پیکانی، خودنگر، خود افروز، خودکشش (= خودی شکن)، شورشِ محشر، شورشِ رستاخیز، شورشِ ناقوس، شورشِ محفل، شورشِ پنہاں، ابولہبی، عنتری، مرحبی، خیبری، کراری، مصطفوی، غزنوی یا محمودی، ایازی، پرویزی، کوہ کنی، شبیر بینی (= شبیر بن سے منسوب)، کوفی، شامی، شبیری، تیموری، چنگیزی، سمرقندی، عربی، عجمی، اور افرنگی، روباہی، شاہینی (= جرہ شاہینی، عقابی اور شیوۂ باز) اور شبیری (نیز دیگر کم زور اور قوی پرندوں اور حیوانات کے استعارے)۔

مندرجہ بالا چند الفاظ حسن، قوت و شکوہ، حرکت و عمل اور مقابلہ و مسابقہ کے مظہر ہیں۔ اقبال کے پیغام کے اہم تر عناصر ان الفاظ سے اُجاگر ہو رہے ہیں۔ گلِ لالہ ان کے لیے سوز و ساز اور درد و داغ کا نمائندہ ہے۔ قیامت خیز شور و ہنگامہ ان کے پیغام انقلاب کے لیے سازگار ہے۔ مردانِ حق کی داستان ہائے مجاہدت کو وہ مسلمانوں کا نشانِ راہ بناتے رہے ہیں۔ قرآن مجید میں انفس، آفاق اور جملہ مخلوقات پر عبرت آموز اور درس گیر توجہ کرنے کی متعدد بار تلقین آئی ہے۔ اقبال نے اس تلقین کو نئے اسالیب بیان سے حرزِ جاں بنایا، اور اپنے مشاہدات سے اہلِ عالم کو روشناس کروایا۔ حیوانات اور پرندوں کی مثال سے سامانِ عبرت بہم

پہنچانا اسی قبیل کا ایک کام ہے ۔ مختصر یہ کہ اقبال کے الفاظ اور تراکیب ان کے فکر و پیغام کے زوردار نمائندے ہیں ۔ چند ابیات یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

"بالِ جبریل" (غزلیات)

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی!

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

اے حلقۂ درویشاں، وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز!

نگاہِ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں
نہ آہِ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی !

بہت مدت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا!

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے!
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

جینے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیِ دانش و فرہنگ!

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ!

"ضربِ کلیم" (قطعہ "اسرارِ پیدا")

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد!

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے، تو عالمِ آزاد!

موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے، وہ دولت ہے خداداد!

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

فارسی طریقوں کی جمع اور مسلسل اضافتیں۔

فارسی طریقے کی دونوں جمعیں ("ہا" یا "ان" کے مفرد پر اضافے سے) اردو شعرا کے ہاں موجود ہیں، مگر بہت کم ۔ مسلسل اضافتوں کی مثالیں بھی غالب اور چند دیگر شعرا

کے ہاں دیکھی جا سکتی ہیں مگر اقبال کے اُردو کلام میں یہ دونوں موارد ہزاروں کی تعداد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ بات قابلِ تعریف و توصیف نہیں کہ اُردو میں فارسی جمع اور اضافتوں کے تسلسل کو لایا جائے مگر ہنرمند اور قادر کلام شعرا و ادبا ان امور کو لائقِ تحسین بنا دیتے ہیں۔ اقبال کے ہاں فارسی جمعیں اور تسلسلِ اضافات ایسے ہی ہیں۔ شاعر کا ذوقِ انتخاب، موسیقیت کے ساتھ رغبت اور ادب دانی ان نمونوں سے الم نشرح ہے۔ اقبال کا یہ کام فارسی کے اساتذہ شعرا (جیسے سعدی اور حافظ) کے کاموں کی شبیہ ہے جنہوں نے عربی کے مطنطن کلمات کو ایسے استعمال کیا ہے کہ نگینے میں جڑاؤ کیے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے حسنِ استعمال کو ملاحظہ کرنے کے لیے وہ اشعار پیشِ نظر رہیں جن میں مندرجہ ذیل فارسی جمعیں اور پیہم اضافتیں وارد ہوئی ہیں۔

"باقیاتِ اقبال"[1] : تہِ چرخِ کہن، غیرِ آبِ زرِ سبوئے مئے شفق، مسافِ نظمِ ہستی شریکِ بزمِ میخانہ، غیرتِ نوکِ سناں، زینتِ بازارِ جاں، شرمندۂ ضبطِ فغاں، ظلِ دامانِ پدر، محیطِ دیدۂ پُرنم، فراقِ رفتگاں، مایۂ بے مائیگاں، تشنہ کامانِ محبت، مثالِ خندۂ مادر، پناہِ دینِ حق، علتِ حرماں نصیبی، دردِ آزارِ مصیبت، صیدِ شاہینِ یتیمی، رہینِ غمِ پنہاں، عاشقانِ شافعِ محشر، لطفِ آبِ چشمۂ حیواں (مشتے از خروارے کے بموجب مثالیں نظم "نالۂ یتیم" سے ہیں)۔

"بانگِ درا" : مرشدانِ خود بیں، آزردگیٔ غیر سبب، ذوقِ خود افروزیٔ دانائے رموزِ کم، نازشِ موسمِ گل، مستِ مئے ذوقِ تن آسانی، زحمت کشِ تنہائیٔ صحرا، صیقلِ فرشِ اعدا، سرِ نہاں خانۂ ضمیرِ مرِدش، نازنینانِ چمن برحنا بندِ عروسِ لالہ، غبار آلودۂ رنگ و نسب، زناریٔ بت خانۂ ایام، بندۂ حق بین و حق اندیش، بال و پرِ روح الامین، پروازِ شاہینِ قہستانی، مئے فروشانِ کہن، رہ رو دشتِ بے آب، سیلی زدۂ موجِ سراب، گرفتارِ طلسمِ ماہتاب، قافلہ ہائے کہن، حدیثِ ماتمِ دلبری، میانِ شاخساراں،

---

[1] طبعِ ثانی (لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۶۶) مرتبہ سید عبدالواحد معینی اور عبداللہ قریشی۔

صحبتِ مرغ چمن، بلسوہ، دارِ بے زحمت۔

"بالِ جبریل": نکتہ ہائے دقیق، بتانِ عہدِ عتیق، شیوہ ہائے خانقہی، سوز و سرورِ عہدِ شباب، بانگِ صورِ سرافیل، جلوہ ہائے پا بہ رکاب، لشکریاں شکستہ صف، لطفِ خلشِ پیکاں، حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ، نغمۂ جبریل آشوب، محرمِ رازِ درونِ میخانہ، آئینِ جواں مرداں، خدایانِ بحر و بر، غلامِ گردشِ دوراں، فروغِ دیدۂ افلاک، کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں، قافلہ ہائے رنگ و بو، دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ، غزالانِ افکار، امامِ عاشقانِ دردمند، شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر، اندیشہ ہائے افلاکی، سرِ سرا پردۂ جاں، صفتِ تیغِ دو پیکر، سیلِ سبک سیر، زمیں گیر، شارحِ اسرارِ حیات، زندانیٔ نزدیک و دُور و دیر و زود، بے قافلہ و راحلہ و زاد، ستارگاں فضا ہائے نیلگوں، نفسِ سوختۂ شام و سحر، قافلہ لالہ ہائے صحرائی، ہنگامۂ دیر پا، نمد نایافت بینۂ گردوں۔

"ضربِ کلیم": عشقِ بتاں، بے دوستی و رنجوری، جذبہ ہائے بلند، نغمہ ہائے بے صوت صاحب نظراں، شریکِ شورشِ پنہاں، حلقۂ اربابِ جنوں، بتانِ وہم و گماں، گرمیٔ یوم النشور، ضمیرِ خاکِ نیلی فام، وجودِ حضرتِ انساں، ساقیانِ سامری فن، مواقفِ تند رواں، فروغِ مغربیاں، سحر، غم خواری و کم آزاری، نظرورانِ فرنگی، معصومانِ یورپ، ہجومِ زنانِ بازاری، بے مہریٔ صیاد، منتظرِ بانگِ رحیل، شیرانِ غاب۔

"ارمغانِ حجاز": شعلۂ نم خوردہ، خانہ زادگانِ کبیر، ساکنانِ عرشِ اعظم، سیاکانِ کہن، آدم یزداں صفات، نوا ہائے آرزو جگر سوز، ہنگامہ ہائے نو بنو، خدایانِ ہمالہ، خود شناس و خودنگر، ہمسرِ شاہین و چرغ، پیرانِ حرم، صفاتِ ذاتِ حق، سزاوارِ حدیثِ لن ترانی، حدیثِ بندۂ مومن، غم خانۂ دہقانِ پیر، تبسمہائے پنہانی۔

حاصلِ مبحث۔ اقبال نے اردو اور فارسی میں صد ہا نئی تراکیب وضع کیں اور ان کے ذریعے نئے مفاہیم و معانی کو ادا کیا ہے۔ اُردو میں ان کی نئی تراکیب

لہ بلسوہ یعنی بیستم۔ بیسواں حصہ مراد ہے۔

اب تک جذب ہو چکی ہیں، اور فارسی کی تراکیب بھی مانوس ہوتی جا رہی ہیں۔ افغانستان اور ایران کے ناقد حالتِ استعجاب میں ہیں کہ اقبال نے ایک اکتسابی زبان میں وضعِ تراکیب کا کام کیسے انجام دیا۔ علامہ مرحوم اساتذہ شعرا اور ادبا سے استناد کرنے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ ان کی ادبی بحثوں کے دل کش نمونے ان کے مکتوبات اور مقالات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ "بہارِ عجم" نام کی لغت[1] سے بیشتر ارجاع کرتے رہے، مگر نئے افکار کو پیش کرنے کی خاطر انہیں نئے الفاظ اور تراکیب بھی ڈھالنی پڑیں۔ فارسی کی اصطلاح میں "سبکِ اقبال" اور اردو میں "اسلوبِ اقبال" سے جب بحث کی جائے، تو اقبال کے "افکارِ نو" کے ساتھ ساتھ ان کی تراکیبِ نو پر بھی توجہ رکھنا چاہیے۔ اقبال کی نئی لفظیات میں اسم ہائے معرفہ و نکرہ کا مصدری استعمال اور فارسی سابقوں و لاحقوں کی مدد سے نئی ترکیب سازی (فاعلی اور مفعولی صفات نیز مرکبِ توصیفی) قابلِ ذکر ہے۔ اقبال نے فارسی شاعری بڑے انکسار سے شروع کی[2] مگر معانی کے ساتھ ساتھ لفظی تحول اور دیگر گوئی پر بھی گویا ان کی توجہ مبذول تھی۔

نغمہ ام ز اندازۂ تار است بیش ‌‌ ‌ من نترسم از شکستِ عود خویش
قطرہ از سیلابِ من بیگانہ بہ ‌ ‌ ‌ قلزم از آشوبِ او دیوانہ بہ
در نمی گنجد بہ جو عمانِ من ‌ ‌ ‌ بحرہا باید پئے طوفانِ من
خوگر من نیست چشمِ ہست و بود ‌ ‌ ‌ لرزہ بر تن خیزدم از بیمِ نمود

اقبال نے اپنی وضع کردہ فارسی تراکیب میں سے اکثر کو اپنے اردو کلام میں بھی

---

[1] مولفہ لالہ ٹیک چند بہار، دو جلد (تصنیف بارہویں صدی ہجری کی ہے)، یہ ضخیم لغت ۱۹۱۶ میں مطبع نول کشور لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔

[2] مثنوی "اسرارِ خودی" تمہید:

ہندیم از پارسی بیگانہ ام ‌ ‌ ‌ ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسنِ اندازِ بیاں از من مجو ‌ ‌ ‌ خوانسار و اصفہاں از من مجو

نہایت چابک دستی کے ساتھ استعمال کر دیا ہے۔ ان کے اُردو کلام میں "فارسیت" میرزا غالب کے دیوانِ اُردو کی "فارسیت" سے بھی زیادہ ہے، مگر اس کے ثقل وگرانی کی ناقدانہ شکایت کرنا ناانصافی ہوگی۔ "ارتقا" کے عنوان سے "بانگِ درا" کا ایک قطعہ دیکھیں۔ شاعر نے ترشیزی (گیارہویں صدی ہجری کا ایک ایرانی شاعر، مقیم حیدر آباد دکن) کے ایک بیت کو تضمین کیا، اور دو ابیات کو فارسی نما رکھا۔ پھر بھی ابلاغِ معانی میں مشکل نظر آتی ہے نہ ابہام۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی!
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش — زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی!
مقامِ بست و کشاد و فشار و سوز و کشید — میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی!

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی
"مغان کہ دانۂ انگور آب می سازند — ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند"

اقبالؒ اور جوہرؒ کے روابط

ابتدائی ربط۔ جوہر اور اقبال کے ربط و تعلق کی ابتدا کا ہمیں علم نہیں۔ اقبال اپنی اُردو شاعری کے ذریعے بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک کافی معروف ہو چکے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کے نام سے اقبال ۱۹۰۶ء تک ضرور واقف ہوئے ہوں گے کیونکہ اس سال انہوں نے مسلم لیگ کے افتتاحی جلسے میں شرکت ہی نہ کی بلکہ اس جلسے کی فکر انگیز کارروائی بھی سپردِ قلم کی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا تاسیسی اجلاس ڈھاکہ کے نواب بہادر سر سلیم اللہ کے گھر میں منعقد ہوا تھا۔ اقبال اس وقت یورپ میں تھے۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۰۸ء میں جسٹس سید امیر علی مرحوم نے لندن میں مسلم لیگ کی ایک شاخ کھولی اور اقبال نے وہیں اس جماعت کی رکنیت کا فارم پُر کیا۔ اس امر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؒ اور جوہر آل انڈیا مسلم لیگ کے ابتدائی ارکان میں سے تھے اور دونوں عنفوانِ شباب سے قومی کاموں میں شریک رہے۔ جوہر کے شاعرانہ جوہر ابتدا سے عیاں تھے مگر اقبال کی طرح انہوں نے بھی بیسویں صدی

مولانا محمد علی جوہر ولادت صدی کی قومی کانفرنس منعقدہ کراچی (۱۶ تا ۱۹ دسمبر ۱۹۷۸ء) میں پڑھا گیا۔

عیسوی کے اوائل میں اُردو اور انگریزی میں مقالے لکھنے شروع کیے تھے[۱]۔ ۱۹۱۱ء میں جوہر نے کلکتہ سے Comrade نکالا جو ۱۹۱۲ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ اس سے اگلے سال انہوں نے دہلی سے روزنامہ "ہمدرد" نکالا۔ اقبال اور جوہر کے تعلقات کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ روزنامہ "ہمدرد" کے افتتاحی شمارے میں چھپنے کی خاطر جوہر نے اقبال سے ایک پیغام طلب کیا تھا۔ اقبال نے پیغام بھیجا مگر وہ بتاخیر پہنچا، اس لیے ۲۴ فروری ۱۹۱۳ء والے شمارے میں شائع ہو سکا مگر اگلے روز نمایاں طور پر شائع ہوا۔ "بانگِ درا" (حصہ سوم) میں ان اشعار کا عنوان "پھول" ہے:

تجھے کیوں فکر ہے اے گل! دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے!
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے!
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پا بگل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے!
تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم، نگوں جام و سبو کر لے!
نہیں یہ شانِ خودداری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے!
چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو، تو پیدا رنگ و بو کر لے!

۱۔ ۱۹۰۷ء میں جوہر نے "Thoughts on the Present Discontent" کے عنوان سے Times of India میں کئی مقالے لکھے تھے۔ یہ (ڈاکٹر) افضل کی مرتبہ کتاب Select Writings and Speeches of Moulana Muhammad Ali (لاہور: شیخ محمد اشرف، طبع سوم، ۱۹۶۹ء)، ۱/۱-۲۹ میں شامل ہیں۔

اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے!
اسی میں دیکھ! مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے!

یہ اشعار منتخب صورت میں "ہمدرد" میں چھپے تھے۔ شاید اقبال نے خود ہی انہیں منتخب صورت میں بھیجا تھا۔ ان کے اشارات توجیہ طلب ہو سکتے ہیں۔ جوہر صنوبر کی سی نیم آزادی اور نیم پابندی کے قائل نہ ہو سکتے تھے۔ لہٰذا انہیں اور انکے انگریزی اور اردو روزناموں کو کئی حوادث سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ اشارے آگے روشن ہوں گے۔

اقبال اور جوہر عالمی نقطۂ نگاہ رکھنے والے مسلمان تھے۔ دونوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی اور دل سوزی دکھائی مگر ۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۴ء کی ان کی بیشتر تحریریں سلطنتِ عثمانی اور ترکوں سے مربوط ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے دولتِ عثمانیہ کے ایک حصے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ طرابلس کی بارہ سالہ لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ یہیں غازیوں کی سقائی کرتی ہوئی شہید ہوئی۔ اقبال نے اپنی ایک نظم کے ذریعے اسے خراجِ تحسین پیش کیا ہے[1]۔ اس کے اگلے سال ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے سلطنتِ عثمانیہ سے جنگ شروع کر دی اور ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کے آغاز تک یہ جنگ تقریباً جاری رہی۔ جنگ میں ترک اتحادیوں کے خلاف لڑے اور اسی دوران میں کئی عرب ممالک یکے بعد دیگرے ان کی سلطنت سے علیحدہ ہونے لگے۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کا خاتمہ اتحادیوں کے حق میں ہوا اور انہوں نے سلطنتِ عثمانی سے جی بھر کے انتقام لیا۔ اس دوران میں برِ صغیر کے مسلمانوں نے اپنے ترک بھائیوں کے ساتھ مکمل یگانگت اور اخوت کا ثبوت دیا۔ اقبال اور جوہر نے ترکوں کی حمایت میں بہت کچھ لکھا اور جوہر کو کوئی پانچ برس (1915ء۔ 1919ء) تک جیل بھی جانا پڑا۔ اس دوران میں برِ صغیر میں ترکوں کی حمایت میں تحریکِ خلافت برپا تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے جیل سے رہا ہو کر اس تحریک میں اس سرگرمی سے حصہ لیا کہ گویا اس کی روح و رواں بن گئے۔ تحریکِ

---

[1] اقبال کی نظم اس بیت سے آغاز پذیر ہے:

فاطمہ تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے ۔۔۔ ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

خلافت میں بے باکانہ حصّہ لینے اور حکومت کے خلاف سب کچھ کر گزرنے کی پاداش میں جوہر کو ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء ایک بار پھر جیل جانا پڑا تھا۔ علامہ اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح جیسے میانہ رو راہبروں کو ترکوں کے ساتھ پوری ہمدردی تھی، مگر مسئلہ خلافت پر ان کا نقطۂ نظر علی برادران سے مختلف تھا۔ وضاحت اپنے مقام پر آئے گی۔

بنگال کی تقسیم (۱۹۰۵ء) اور اس تقسیم کی تنسیخ ۱۹۱۱ء کے معاملے میں اقبال اور جوہر کے تاثرات یکساں نوعیت کے تھے۔ تقسیم دونوں کو خوش آیند تھی مگر تنسیخِ تقسیم ناگوار۔ مگر دارالحکومت کے کلکتے سے دہلی منتقل ہونے پر دونوں خرسند نظر آتے ہیں۔ جوہر نے اپنے تاثرات بہ زبانِ نثر بیان فرمائے ہیں[۲] مگر اقبال کے مندرجہ ذیل دو طنزیہ شعر ہی حقیقتِ حال کے ترجمان ہیں:

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن گئی

تاجِ شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو دھوتی اور پگڑی چھن گئی[۲]

۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کان پور کی ایک مسجد کے متوضا کے انہدام کا واقعہ پیش آیا علامہ شبلی، جوہر، قائدِ اعظم محمد علی جناح اور اقبال وغیرہم سب ہی اس واقعہ سے متاثر اور رنجیدہ ہوئے تھے۔ شبلی کا یہ قطعہ بہت معروف ہے[۳]

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفلِ خُرد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخِ صُور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

اُٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں

---

[۲] سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی "باقیاتِ اقبال" (لاہور: آئینۂ ادب، طبع دوم ۱۹۷۸ء)، ص ۴۶۳۔

[۳] "کلیاتِ شبلی اردو" (اعظم گڑھ: طبع سوم ۱۹۵۴ء)، ص ۸۰ - ۸۱۔

سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
ازبسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
"ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں"

اقبال اس قضیے میں مسلمانوں کی مدد اور رہبری کرنے کانپور تشریف لے گئے تھے[1] اور جوہر نے تقریر اور تحریر کے ذریعے اس جانکاہ حادثے کے خلاف اربابِ اقتدار کی خوب خبر لی تھی۔ انہوں نے لندن میں بھی ایک تقریر کی اور انگریزوں کی سفاکی کے خلاف بولے[2]۔

اس واقعہ سے قبل ۱۹۱۱ء میں جوہر نے اقبال کی قدر دانی کی۔ ایک تجویز کی بھرپور طور پر حمایت کی تھی۔ ہوا یہ کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے موقع پر مسلمان علامہ اقبال کی قدر دانی کرنے کے طالب تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا اور انہیں "ترجمانِ حقیقت" کا لقب دیا[3]۔ جوہر نے اس تجویز کی بھرپور انداز میں حمایت کی تھی۔

علی برادران اقبال کے اُردو کلام کے بے حد مداح تھے۔ محمد علی سے بھی زیادہ کلامِ اقبال شوکت علی کو ازبر تھا، مگر اقبال کی فارسی شاعری پر دونوں بھائیوں کو اچنبھا ہوا اور انہوں نے اس پر ایک طرح کا احتجاج کیا۔ بعد میں دونوں ان کی شاعری کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہو گئے۔ جوہر نے اقبال کی پہلی دو فارسی مثنویوں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" پر ایک تبصرے میں انہیں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی

---

[1] ایم۔ ایس۔ ناز، "حیاتِ اقبال"۔

[2] افضل اقبال، مرتب، Select Writings and Speches of Moulana Mohammad Ali

[3] مقالہ از محمد حنیف شاہد، مجلہ "راوی"، گورنمنٹ کالج، لاہور، "اقبال نمبر" ۱۹۷۳ء۔

بے مثال کتابیں قرار دیا ہے۔ یہ دونوں مثنویاں اقبال نے انہیں ہدیۃً بھیجی تھیں پہلی مثنوی انہیں غالباً جیل میں موصول ہوئی تھی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم (م ۱۹۷۷ء) کے نام انہوں نے ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کو چھندواڑہ جیل سے جو خط لکھا[۱] اس میں اس مثنوی کا ایک طویل اقتباس درج ہے۔ بحث یہ ہے کہ حقائق کے ادراک کا منبع دماغ و عقل نہیں بلکہ دل ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان کے اور ان کے مخاطب (مولانا عبدالماجد دریا آدی) کے اُستاد مولانا شبلی کی بھی یہی رائے تھی کہ حقائق و افکار کا منبع عشق ہے، نہ عقل، اور مولانائے روم کا درج ذیل شعر اسی بات کا موئد ہے:

پائے استدلالیاں چوبیں بود　　　پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

بعد کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ اقبال کی پہلی مثنوی جوہر کی نظر میں کس قدر عزیز ترین متاع تھی:

"خواہ کسی طرح تفسیر کیجیے مگر قرآن خود صاف صاف کہہ چکا ہے کہ علمِ انسانی بہت ہی کم ہے۔ میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ خواہ کسی قدر کم کیوں نہ ہو وہ خدا کی دین ہے اور ایمان کے بعد اس کی بہترین دین بلکہ اس کے بغیر ایمان کم زور اور ضعیف رہتا ہے۔ اس لیے اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہیے اور ایمان کے لیے علم کا پشتہ ایمان کو مستحکم کرنے والا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے ذریعے سے ایمان کا استحکام کرنا چاہیے۔ خدا کی رحمت ہو اقبال پر! خوب تعلیم مولانا روم کا اہتمام کر رہا ہے۔

"لکھنے بیٹھا تھا خط مگر لکھ گیا اقبال کی مثنوی شریف۔ مگر چونکہ بحیثیت ادب کے اس کا پایہ میری نثر سے اتنا ہی اُونچا ہے جتنا کہ زمین سے آسمان کا اور آپ باوجود فلسفی ہونے کے ادب کو استدلال پر مرجح سمجھتے ہیں اس لیے 'اسرارِ خودی' کا یہ حصہ نقل کر دیا گیا[۲] اُمید ہے کہ تشفی ہو گئی ہو گی۔۔۔۔"

---

[۱] محمد علی، "ذاتی ڈائری کے چند اوراق" (اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء)، ۱/۹۵ - ۹۸۔

[۲] (اس پیرے کے بعد مثنوی "اسرارِ خودی" کے اشعار "پر زنن واز جذبِ خاکِ آزاد باش" تا "شورِ یارب، قسمت شبہاش نیست" ("کلیات"، ص ۶۶ - ۶۹) درج ہیں جو بوجہ طوالت حذف کر دیے گئے ہیں ـــ مدیر "اقبال"۔)

آپ نے دیکھا کہ جوہر نے مثنوی "اسرارِ خودی" کا ایک طویل اقتباس کس ذوق و شوق کے ساتھ نقل کیا۔ جوہر کا احترامِ اقبال ایک مزید اقتباس سے واضح ہوگا مگر کبھی کبھی انہیں یہ احساس بھی ہوتا ہوگا کہ اقبال ایک عملی آدمی نہیں ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ سے یہ شکوہ کر ہی دیا۔ فرمایا: آپ کے اشعار پڑھ پڑھ کر برصغیر کے لوگوں کے جسموں میں زندگی کا حقیقی خون دوڑنے لگا ہے مگر آپ کی ذاتی زندگی آپ کے پیغام کے مقابلے میں خاصی بے عمل ہے اور سکون آموز ہے۔" میں برصغیر اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کا ایک طرح کا قوال ہوں۔ میں اپنے نغمہ و سرود سے انہیں حرکت میں لا رہا ہوں اور خود متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ قوال اگر خود پاکوبی کرنے لگے تو اس کا استہزا ہوگا۔ یہ کام انبیائے کرام نے کیا ہے کہ جو کہا کر دکھایا اور اس کی کامل مثال ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ملتی ہے۔ میں اگر دوسروں کو بھی بیدار اور فعال کر سکوں تو یہ بھی ایک غیر معمولی کام ہوگا۔" سید نظر برنی کی مرتبہ کتاب[1] میں جوہر کا اقبال کے بارے میں ایک تاثر موجود ہے جس کا انگریزی اقتباس یا اردو ترجمہ کئی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر چونکہ انگریزی کے اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز بھی تھے اس لیے ہم تبرکاً ان کی انگریزی تحریر نقل کرتے ہیں:

"... Others had come to recognise Iqbal's genius years before I had read a single verse of his, but I may claim this much that when once I had come under his spell, I had made some amends for the time I had lost by reading over and over again everything of his fugitive verse that I could secure in the Urdu periodicals, newspapers and by sharing my intense pleasure with the readers of my own newspapers. . . . He was the poet of Islam's reawakening in India in the twentieth century and to no man does Muslim India owe more than to the modest, shy and retiring barrister of Lahore. His name was a household word throughout the Urdu-speaking Muslim world and, of course, I was an ardent admirer and devotee. . . . It was may brother whose

---

[1] "مولانا محمد علی، شخصیت اور خدمات" (مئی دہلی، ۱۹۷۹ء) ص ۲۰۱ - ۲۰۲-

speeches during his propaganda were so full of Iqbal's poetr, which he would chant in his ardent love of it that my ill-suppressed jealousy found a good opportunity of chaffing him, for, I would say that he would whip up the enthusiasm of his audience with his copious quotations from Iqbal whom his own laboured and drowsy mode could do little more than rouse it to a jog-trot. But when he founo that this time Iqbal had written verse in Persian which needed a little brushing up of all he and I ha

Learnt of that Lauguage in the maktah of our red bearned pedagogne at Rampur ages ago, he swore with full throated case at his Farourit"

تحریکِ خلافت پر اختلافِ عمل۔

پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ اتحادیوں کے حق میں نکلا اور انہوں نے شکست خوردہ ممالک سے سخت انتقام لینا شروع کیا۔ سلطنتِ عثمانیہ سے پہلے ہی بلقان ریاستیں اور کئی عرب ممالک الگ ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ اب اتحادی اس سلطنت کے مزید حصے بخرے کرنے کا سوچ رہے تھے۔ ان حالات میں برصغیر میں ایک بے نظیر تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا مدعا ترکوں کی حمایت تھی اور خلافتِ عثمانی کا احیاء ترکوں کی حمایت کا سلسلہ برصغیر میں ۱۹۱۱ء سے جاری رہا اور اس میں اقبال اور جوہر کے علاوہ لاکھوں کروڑوں دوسرے مسلمان بھی شامل تھے۔ لاہور میں ترک حمایت کا بڑا مرکز انجمن حمایت اسلام تھی جہاں کے سالانہ اجلاس میں اقبال ایک خاص نظم پڑھا کرتے تھے۔ اس دوران میں انجمن والے یا بعض دوسرے مخیر حضرات اقبال کی پڑھی جانے والی نظم کو پہلے چھپوا لیتے اور اجلاس والے دن اسے گراں قیمت پر بیچتے تھے۔ یہ آمدنی اور دیگر چندے ترکوں کو بھجوائے جاتے۔ علی برادران نے تو لاکھوں روپے کے چندے اکٹھے کیے، طبی وفد ترکیہ بھجوائے اور خلافت وفد نے انگلستان کا سفر کیا تھا، مگر تحریکِ خلافت چلائے جانے کے سلسلے میں اقبال اور دیگر مسلم زعما کو علی برادران اور ان کے حامیوں سے اختلاف تھا۔ اس اختلاف کے دو محرک نظر آتے ہیں۔ ایک مسئلہ خلافت کا نظری اور عملی پہلو اور دوسرے مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ

ہندوؤں کی شرکت۔

۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے تک ممالکِ اسلامی میں کئی سلسلوں کی خلافتیں اگرچہ باقی رہی تھیں مگر روشن خیال اور بالبصیرت علما کی نظر میں ان خلافتوں کو خلافتِ راشدہ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہ ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کی اقسام رہی ہیں چنانچہ برصغیر میں تیموری (مغل) بادشاہ خلفائے عثمانی کی اطاعت ضروری سمجھتے تھے۔ سید احمد خان کے بھی خلافت کے بارے میں ایسے ہی خیالات تھے کہ وہ ملوکیت ہی کی ایک صورت رہ گئی ہے۔ اقبال نے ۱۹۰۸ء میں خلافتِ اسلامیہ کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا اور اس کے تیور بھی بتاتے ہیں کہ ان کے نزدیک خلافت ایک روایاتی چیز رہ گئی تھی۔ اقبال نے اپنی ابتدائی فارسی مثنویوں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اصول خاصے مفصل طور پر بیان کیے ہیں، مگر ان میں خلافت کے لزوم کے بارے میں ایک ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں۔ اسکے برعکس وہ انسانی خلافت یعنی اعلیٰ کردار اور تقویٰ کے حامل افرادِ انسانی کے خلافت اور نیابتِ الٰہی کے مقام پر عملاً فائز ہونے کے بارے میں لکھتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک نیابتِ الٰہی کا مرتبہ صاحبانِ خودی کا استحقاق ہے اور یہ کوئی متاع موروثی نہیں ہے۔ مسلمان ممالک میں قائم ہونے والی خلافتوں کو انھوں نے کئی مواقف میں ملوکیت قرار دیا اور ملوکیت کے ایک خلافِ اسلام صورتِ حکومت ہونے کے بارے میں بھی

ؔ اقبال اور جوہر دونوں ہی ملوکیت اور استبداد کے سخت دشمن تھے مگر جوہر کا اقبال پر انتقاد کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ اقبال کی نظم "گورستانِ شاہی" میں ایک شعر یوں ہے۔

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جوہر نے لکھا: "افسوس ہے کہ اقبال نے بھی نفس پرست انسان بادشاہوں کے زمانے کو عہدِ رفتہ سمجھا" دیکھیں ایضاً، ص ۱۸۹۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس جوہر کو مدتوں والئ ریاست رام پور کے ولی عہد کا اتالیق بننا پڑا تھا۔

اقبال کے ہاں شواہد کی کمی نہیں۔

اقبال دیکھ رہے تھے کہ روشن خیال ترک خلافت کو باقی رکھنے کے خلاف ہیں اور وہ خود بھی ملوکیت نما خلافت کے حامی نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے تحریکِ خلافت میں کوئی خاص حصہ نہ لیا۔ اس ضمن میں ان کا طرزِ عمل قائدِ اعظم محمد علی جناح اور کئی مسلمان زعما کا سا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں اقبال اس تحریک کے رکن بنے مگر جلد ہی مستعفی ہو گئے۔

تحریکِ خلافت کے حامیوں نے اسلامیہ کالج لاہور کو بند کروا کے اسے اپنی مساعی کا مرکز بنانا چاہا مگر اقبال نے اس امر کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ مسلمان طلبا کی تعلیم جاری رکھنا ہر تحریک سے مقدم ہے[1]۔ اپنے انگریزی خطبات میں[2] اقبال نے ترکوں کے اس اجتہاد[3] کو سراہا ہے کہ انہوں نے خلافت کی احادیث کے خلاف فیصلہ دے دیا ہے اور نئے ترقی پذیر جمہوری آداب اپنا لیے۔ مسئلۂ خلافت کے نظری اور عملی پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے اقبال نے حامیانِ خلافت کی ہندوؤں سے استمداد کرنے کے خلاف بھی لکھا ہے۔ وہ تحریکِ خلافت کے بہانے گاندھی جی اور دیگر ہندو رہنماؤں کی سیاست کو چمکتے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ہندوؤں کی اس سیاست بازی کا مسلمانوں کے مفاد سے کوئی دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (م ۱۹۴۳ء)

---

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب "اقبال اور برصغیر کی تحریکِ آزادی" (لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۷۸ء) ص ۲۸ و ۲۹۔

[2] خطبہ ششم: "The Princeple of Movement in Islam"

[3] جو ہر اجتہاد کے حامی تھے مگر مسئلۂ خلافت کو وہ ما فوق الاجتہاد قرار دیتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے ان ائمہ مساجد کی خوب خبر لی تھی جو لاؤڈ اسپیکر کے خلاف تھے اور ہر نئی چیز کو خلافِ اسلام قرار دیتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اقبال کی مثنوی "رموزِ بے خودی" کے ان ابیات سے استناد بھی کیا جن کا عنوان یوں ہے: "..... در معنیٔ این کہ در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است۔" ملاحظہ ہو سید نظر برنی، کتاب مذکور، ص ۱۸۸۔

کی طرح[۱] اقبال نے بھی اس مصنوعی ہندو اور مسلم اتحاد اور ایک مخلوط و متحدہ نئی قومیت پیدا کرنے کی کوشش کے خلاف کھل کر لکھا، مگر انہوں نے مولانا جوہر یا ان کے ہم نوا مسلمان رہبروں کے خلاف صریحاً الزام تراشی نہ کی۔ چنانچہ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو جب مولانا جوہر اور ان کے بھائی بیتول کی جیل سے رہا ہو کر چند دن بعد امرتسر آئے تو ان کے خیر مقدم کرنے والوں میں اقبال بھی شامل تھے۔ اس وقت امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ اور تحریکِ خلافت کے جداگانہ اجلاس منعقد ہو رہے تھے۔ اقبال علی برادران کی تکریم کی خاطر بطورِ خاص لاہور سے امرتسر آئے اور اپنی وہ نظم پڑھی جو "بانگِ درا" میں "اسیری" کے عنوان سے موجود ہے۔ آخری فارسی شعر حافظ شیرازی کا ہے اور اس کی تضمین کے ذریعے اقبال نے علی برادران کی عالی ہمتی اور بے نظیر بے باکی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا جوہر اور بعض دیگر رہنما ایک خلافت وفد لیکر انگلستان گئے تھے۔ اقبال نے اس وقت کے ایک رکن مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریکِ خلافت میں ہندوؤں کی دخل اندازی کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

"۔۔۔ اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا ناگوارا نہیں ہو سکتا۔ افسوس اہلِ خلافت اپنی راہ سے بہت دور جا پڑے۔۔۔۔۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا"[۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو پروفیسر احمد سعید "مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریکِ آزادی"، کراچی / راولپنڈی، ۱۹۷۲ء

[۲] شیخ عطاء اللہ، مرتب، "اقبال نامہ" (لاہور: ۱۹۴۵ء)

ا/؟ [علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام کسی بھی مکتوب میں اقبال کی یہ احتجاجی تحریر نہ مل سکی ۔۔ مدیر "اقبال"۔]

خلافت وفد کا انگلستان جانا بھی اقبال پر شاق گزرا۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو مسلمانوں کے خلافت کے بارے میں جذبات سے آگاہ کیا جائے اور اس طرح ان کی حمایت حاصل کی جائے۔ اقبال کے نزدیک جس طرح تحریکِ خلافت میں ہندوؤں کی شرکت ایک مضحکہ خیز بات تھی اسی طرح انگریزوں سے حمایت کی طلب بھی ایک غیر منطقی حرکت تھی۔ خلافت کا باقی رکھنا مسلمانوں سے مربوط تھا اور انہیں دوسروں سے خلافت کی گدائی اور دریوزہ گری کی ضرورت نہ تھی۔ "دریوزۂ خلافت" کے عنوان سے اقبال نے جو طنزیہ قطعہ لکھا اس کا آخری تضمین شدہ شعر شیخ سعدی کا ہے اور یہ قطعہ اقبال نے خلافت وفد کے انگلستان جانے سے قبل لکھا تھا۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی!
"مرا از شکستن چناں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی"[۱]

اقبال کی یہ طنز خاصی ملائم ہے مگر مولانا جوہر کے "کامریڈ" اور "ہمدرد" سبب تحریکِ خلافت سے تعاون نہ کرنے پر کئی بار اقبال کے خلاف خاصی سخت نیش دار طنزیہ شائع ہوتی رہیں[۲]۔ مگر علامہ مرحوم نے ان اعتراضات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ انہیں جوہر کے خلوص کا علم تھا اور مولانائے موصوف کی شدتِ جذبات سے بھی وہ آگاہ تھے۔ اقبال کی روشِ مزاج پر خاطر خواہ طور پہ لکھا جا چکا، جوہر کے بارے میں بھی کافی لکھا جا چکا اور معاصرین جیسے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم[۳] نے ان کی شدتِ جذبات کو خوب اجاگر کیا۔ بابائے اردو مرحوم لکھتے ہیں:

"... مولانا محمد علی مرحوم عجیب و غریب شخص واقع ہوئے ہیں۔ وہ مختلف

---

۱ "بانگِ درا" ("کلیات")، ص ۲۵۴۔

۲ مثلاً یہ کہ اقبال کو مرحوم لکھا جاتا رہا ہے یا بے عمل۔

۳ "گنجہائے گراں مایہ" میں ان کا مضمون ملاحظہ ہو جو کئی دیگر کتب و مقالات میں بھی نقل ہوتا رہا ہے۔

متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیئر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے ۔۔۔۔[1]

لہذا یہ بات باعثِ تعجب نہیں کہ جوہر نے اختلافی مسائل کا اظہار زیادہ کھل کر کیا اور تحریکِ خلافت یا تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں تعاون نہ کرنے والے جملہ اصحاب و احباب پر انتقادات کا سلسلہ بڑی شدو مد کے ساتھ جاری رکھا، مگر اقبال زیادہ تر خاموشی اختیار کیے رہے۔

سائمن دستوری کمیشن پر اختلاف۔

برصغیر میں وقتاً فوقتاً جو مختلف دستوری اصلاحات یا سفارشات مرتب ہوتی رہیں، ان میں سائمن دستوری کمیشن کی سفارشات بڑی معروف ہیں۔ اس کمیشن کے جملہ ارکان چونکہ انگریز تھے اور برصغیر کے باشندوں کو ان میں نمائندگی نہ ملی تھی، اس لیے کانگرس اور مسلم لیگ کے کئی راہ نماؤں نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا اور اس کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کیا۔ ایسے راہ نماؤں میں مولانا محمد علی جوہر اور قائدِ اعظم جناح بھی تھے، مگر یہ حضرات ان دنوں مشروط قسم[2] کے مخلوط انتخابات کے حامی تھے۔ اس لیے اقبال ان کے ہم نوا نہ ہو سکے۔ اقبال نے سائمن کمیشن کی ہیئتِ تشکیل کو افسوس ناک[3] قرار دیا تھا مگر ان کے خیال میں اس کمیشن کے ساتھ تعاون مسلمانوں کے لیے بہتر تھا۔ مسلم لیگ ان دنوں دو حصوں میں منقسم تھی، یعنی وہ جناح لیگ .... اور شفیع لیگ تھی۔ شفیع لیگ نے علامہ اقبال کو اپنا سیکریٹری جنرل منتخب کیا تھا۔ اقبال بغرضِ علاج دہلی گئے ہوئے تھے کہ شفیع لیگ نے سائمن کمیشن کو بعض ایسی تجاویز پیش کر دیں جن سے علامہ کو اختلاف تھا۔ اس لیے انہوں نے ۲۴ جون ۱۹۲۸ء کے

---

[1] "چند ہم عصر" (کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۴ء)، ص ۱۳۸ (تبصرہ بر سیرت محمد علی مرتبہ رئیس احمد جعفری، ۱۹۳۲ء)۔

[2] "اقبال اور برِ صغیر کی تحریکِ آزادی"، ص ۷۴۔

[3] روزنامہ "انقلاب" لاہور، مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۲۷ء۔

اخبارات میں شفیع لیگ کی معتمدی سے اپنا استعفیٰ شائع کرا دیا۔ بعد میں انہوں نے ۲۹ جون ۱۹۳۰ء کے روزنامہ "انقلاب" میں سائمن دستوری کمیشن کی سفارشات پر ایک ناقدانہ تبصرہ بھی چھپوایا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے البتہ کئی کھلے عام جلسوں میں سائمن کمیشن سے تعاون کرنے کی بنا پر اقبال اور ان کے ہم صفیروں کی ملامت کی تھی[۱]۔

شاعری اور بعض دل چسپ مشترکات:

اقبال اور جوہر کی سیرت میں کئی مشترکات نظر آتے ہیں، مثلاً عقیدۂ توحید سے تمسک عشقِ رسول، مغربی تہذیب کی مخالفت، ترقی پذیر نظریاتِ تعلیم اور مسلمانانِ عالم کی بہتری اور بہبودی پر توجہ رکھنا۔ جوہر نے اپنی اُردو شاعری کے جو مختصر مگر زوردار نمونے چھوڑے[۲] اور جنہیں دست افشانی اور پاکوبی[۳] کا ایک بہانہ قرار دیتے رہے وہ بعض موارد میں اقبال کی اُردو شاعری سے اقرب اور ہم آہنگ ہیں، مثلاً جوہر کے ذیل کے اشعار کو اکثر لوگ اقبال سے منسوب کرتے رہے ہیں:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ۔۔۔ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ۔۔۔ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے ۔۔۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یہی نہیں جوہر کے کئی دیگر اشعار کا رنگ بھی اندازِ اقبال کا غماز ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوہر اقبال کی اُردو شاعری کے غیر معمولی قدر دان اور مداح تھے۔

جہاں ایمان ہو واں کیسے گزر ہو یاس و حرماں کا
کسی مومن کو بھی اے دل خدا سے بدگماں پایا
عشق ہی باعثِ تکوینِ جہاں ہے غافل
تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہے بے کاری کا

---

[۱] ملاحظہ ہو ڈاکٹر افضل اقبال کی Life and Times of Mohammad Ali ص ۳۲۵ و ۳۴۵۔ نیز دیکھیں "علی برادران" مؤلفہ رئیس احمد جعفری، لاہور، ۱۹۶۳ء

[۲] نور الرحمٰن، مرتب، "دیوانِ جوہر"، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۲ء

[۳] محمد مونس، "جوہر: شخصیت و شاعری" (الٰہ آباد: ادارۂ انیسِ اُردو بھارت، س ن)، ص ۳۴۔

• اقبال اور جوہر دونوں دینی شاعر تھے، اور انہوں نے دین و سیاست کے کئی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جوہر نے "لا غالب الا اللہ" کے کلمات کو اپنا نشانِ راہ اور MOTTO بنا رکھا تھا۔ اقبال ان کے اس نشانِ راہ سے پوری طرح متفق تھے کہ:

لادینی و لاطینی! کس پیچ میں الجھا تو ! دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الا ہُو[۱]

اقبال سرفروش اور جہاد کے مؤید اور عاشق تھے، مگر جوہر اس معاملے میں اقبال سے بھی آگے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی سال قید میں گزارے اور شوقِ شہادت ان پر سخت غالب رہا ہے۔ "لا غالب الا ہو" کے زیرِ عنوان ان کی ایک مسلسل غزل کا مطلع یوں ہے:

بے تاب کر رہی ہے تمنائے کربلا یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا

اقبال اور جوہر کے ہاں حضرت امام حسینؓ اور کربلا کا ذکر بڑی فراوانی سے موجود ہے اور اس کی وجہ محض اظہارِ ارادت نہیں بلکہ اس کے آئینے میں دونوں کی حریت خواہ، دشمنِ استبداد اور مخالفِ ملوکیت شخصیت دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال نے مثنوی "رموزِ بے خودی" میں واقعۂ کربلا پر مفصل لکھا اور حضرت امام حسینؓ کو ایک بے مثال ترانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی دیگر کتابوں میں بھی تاریخِ اسلام کی اس عظیم قربانی کے بارے میں ایمان پرور بیانات ملتے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کے ذیل کے اشعار اقبال کے اشعار کے پایے کے تو نہیں مگر مسلکِ شبیری سے قائل اور وابستہ ہونے کے مظہرِ کامل ہیں۔ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جوہر نے واقعۂ کربلا کے بارے میں ایک کتابچہ بھی لکھا ہے:

خود خضر کو شبیر کی اِس تشنہ لبی سے معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے

جو دشت کہ آرام گہِ سبطِ نبی ہے اس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

ہم عیشِ دو روزہ کے بھی منکر نہیں لیکن ایمائے شہِ کرب و بلا اور ہی کچھ ہے

---

[۱] مطبوعہ ۱۹۶۳ء۔

سینچا تھا اس کو اپنے لہو سے حسین نے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اب چاہیے اس چمن کو خزاں دے بہار دے

جوہر نے تصوف اور صوفیائے حق کی توصیف میں بھی لکھا ہے۔ مگر ان کی خاطر نمونے کا صوفی انا الحق گو حسین ابن منصور حلاج (م ۳۰۹ ھ) تھا۔ جوہر نے اقبال کی طرح انا الحق کی کوئی توجیہہ پیش کی نہ ابن حلاج کی معروف تصنیف "کتاب الطواسین" کا کوئی تاثر لیا۔ اقبال کے تاثرات کو آپ ڈاکٹر اینماری شیمل Annamaire Schimmel کی انگریزی تالیف Gobriel's Wing میں ملاحظہ کر سکتے ہیں، مگر جوہر کے بارے میں یاد رہے کہ انہیں حسین ابن منصور حلاج کا زندانی اور مصلوب ہو جانا پسند تھا۔ پہلی منزل کو جوہر نے خود بھی کئی بار پایا مگر دوسری منزل ان کے لیے قابلِ رشک ہی رہ گئی۔ اس ضمن میں موصوف کے چند ابیات ملاحظہ ہوں:

سن لیجیے خلوتوں میں انا الحق کا ادعا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سولی پر چڑھ سنائے وہ اب نعرہ زن کہاں

یہ بھی کیا پیرویِ حق ہے کہ خاموش ہیں سب ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہاں انا الحق بھی منصور بھی دار بھی ہو

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھ کر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

پاداشِ جرمِ عشق سے کب تک مفر بھلا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مانا کہ تم رہا کیے دار و رسن سے دور

طوافِ کعبہ بھی کر آئے شوقِ حور و غلماں میں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جب آخر دار کو دیکھا درِ باغ جناں پایا

ملتی نہیں کسی کو سند امتحان کی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دار و رسن کے حکم کو سمجھو صلائے دوست

تعلیمی نظریات ۔ اقبال کے حرکی اور منظم تعلیمی نظریات کے بارے میں کئی مقالات اور کتب موجود ہیں۔ علامہ مرحوم کے تعلیمی نظریات علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) اور مولانا جوہر کے خیالات سے اقرب ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان بالخصوص اپنی اسلامی تعلیمات سے متمسک رہیں اور مغربی آدابِ معاشرت کی تقلید کیے بغیر وہاں کے ترقی یافتہ علوم و فنون اپنا لیں۔ جوہر نے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اپنے افکار کی تجربہ گاہ بنانا چاہا تھا مگر بعد میں انہوں نے ان ہی مقاصد کی خاطر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بنیاد رکھی۔ جامعہ کے لیے مولانا محمد علی جوہر نے جو مفصل نصاب مرتب کیا[1] وہ ان کے اعلیٰ مقاصد کا آئینہ دار ہے۔ اس نصاب کو دیکھ کر شبلی

---

[1] مولانا محمد علی جوہر، "قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام"، (علی گڑھ: جامعہ ملیہ، ۱۹۲۳ء) ص ۳۴۔

کے ندوۃ العلماء کے مقاصد سامنے آتے ہیں۔

آخری سالوں کی ہم خیالی: ۱۹۲۸ء میں بدنام زمانہ "نہرو رپورٹ" معرضِ بحث میں آئی اور اقبال اور جوہر دونوں اس کے سخت ناقد بنے۔ جوہر البتہ ان دنوں انگلستان گئے ہوئے تھے۔ ان کے برادرِ بزرگ مولانا شوکت علی نمائندگی کر رہے تھے۔ ۱۹۲۸ء کے اواخر اور ۱۹۲۹ء کے اوائل میں دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے فیڈرل (وفاقی) انداز کی حکومت اور مسلمانوں کیلئے جداگانہ حق انتخابات کے مطالبات پیش کیے۔ اس کانفرنس میں اقبال اور جوہر دونوں شریک تھے اور کاملاً متفق الخیال بھی تھے۔ سال ۱۹۲۷ء کے روزنامہ "ہمدرد" میں (کئی اشاعتیں دیکھی جا سکتی ہیں) افکارِ اقبال خاص طور پر موردِ بحث دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں نظم "شمع و شاعر" پر مولانا محمد علی جوہر کا تبصرہ نما بیان بے حد دلچسپی کا حامل ہے، مثلاً اقبال نے بزبانِ "شمع" فرمایا ہے:

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا! — بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

پھول بے پروا ہیں، تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو — کارواں بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جوہر بزبانِ "شاعر" جواب دیتے ہیں (یہ جوابات خود اقبال نے بھی دیے ہیں) کہ گلشن برہم ہے اور نہ نغمہ و ترنم بے محل ہے۔ پھول گرم نوائی پر بے پروا نہیں ہیں اور کارواں آوازِ درا پر بے حس نہیں۔ اسی طرح اہلِ کارواں کو اپنی متاع کا احساسِ زیاں بھی ہے۔ جوہر خطاب بہ اقبال، فرماتے ہیں کہ قومی شاعر کو بغیر مایوسی کے اپنا کام جاری رکھنا چاہیے اور قوم کے بیدار ہونے پر اسے یقین رکھنا چاہیے۔ ایک سلسلۂ مقالات میں جوہر اقبال کو اپنا استاد قرار دیتے ہیں، مگر دبی زبان میں اقبال کی بے عملی اور قید و بند سے آزادی پر انتقاد بھی کرتے ہیں۔

مولانا جوہر اور ان کے برادرِ بزرگ مولانا شوکت علی نے ۱۹۲۸ء میں کانگرس سے قطع تعلق کر لیا اور دونوں قائدِ اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے کاملاً ہم نوا ہو گئے۔

قائدِ اعظم کو جو لوگ انگلستان سے برصغیر واپس لائے ان میں جوہر بھی شامل تھے۔ جوہر اور ان کے بعد ان کے برادرِ بزرگ آخر تک قائدِ اعظم کی قیادت میں کام کرتے رہے۔ ۱۲۔ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلی گول میز کانفرنس شروع ہوئی جو کوئی تین ماہ تک جاری رہی۔ مولانا جوہر نے اس میں مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر شرکت کی۔ اور ۱۹ نومبر کو اپنی تاریخی تقریر کی اور برصغیر کی مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ جوہر ابھی انگلستان میں ہی تھے کہ اقبال نے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنا وہ معروف خطبہ الٰہ آباد میں پیش کیا جسے مطالبۂ پاکستان اور دو قومی نظریے کا صریح اور برملا اظہار کہا جا رہا ہے۔ جوہر کی صحت یوں تو کئی سال سے خراب تھی مگر اس سال گزشتہ چند ماہ سے وہ زیادہ مریض تھے۔ چنانچہ اقبال کے خطبے کے چند روز بعد ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو وہ لندن میں انتقال کر گئے اور مفتیٔ اعظم فلسطین کے تقاضے پر ان کے جسدِ خاکی کو فلسطین میں لا کر مسجد الاقصیٰ کے حریم میں دفن کیا گیا۔ تدفین ۲۴ جنوری کو ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جوہر کو خطبۂ اقبال پر کسی تبصرے کا موقع ہی نہ ملا، ورنہ اس حقیقت انگیز خطبے کو غالباً وہ ضرور سراہتے اور برصغیر کے مسائل کا اسے بہترین حل قرار دیتے۔ یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو جوہر نے وزیرِ اعظم برطانیہ کے نام جو آخری خط لکھا، وہ خطبۂ اقبال سے خاصہ مماثل ہے۔ اقبال البتہ جوہر کی قابلِ رشک موت اور مسجد الاقصیٰ کے حریم میں ان کی تدفین سے بے حد متاثر ہوئے۔ بعد میں وہ موتمرِ عالمِ اسلامی کے اجلاس منعقدہ فلسطین میں شریک ہوئے اور آرام گاہِ جوہر پر فاتحہ خوانی کی، مگر ان کا مرثیہ .... مولانا محمد علی جوہر کی عظمت کو ایک ابدی خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان پانچ اشعار کی شرح کی جائے تو سیرتِ محمد علی جوہر تشکیل پا جائے۔ اقبال نے اپنے استاد داغ کا ایک زوردار مرثیہ لکھا تھا (داغ اتفاق سے جوہر کے بھی استاد تھے)۔ اپنی والدہ ماجدہ اور ڈاکٹر سید راس مسعود (م ۱۹۳۷ء) کے جو مرثیے انہوں نے لکھے وہ بھی اُردو ادب کے شاہ پارے ہیں۔ فارسی میں انہوں نے اکبر الٰہ آبادی کا بھی زوردار مرثیہ لکھا تھا[لہ]

لہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی (مرتب)، کتاب مذکور، ص ۲۵۴-۲۵۳۔ "پیامِ مشرق" کی اشاعتِ اول میں بھی شامل تھا۔

مگر "خیر الکلام ما قل و دل" کا مصداق مرثیہ جوہر ہی قرار پاتا ہے۔

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گذشت

اے خوشا مشت غبار او کہ در جذب حرم
از کنار اندلس از ساحل بربر گذشت[۱]

خاک قدس[۲] او را باغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت[۳] زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

می نگنجد جز باں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گذشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشم آسیاست
گرچہ آں نور نگاہے خاور از خاور گذشت

حاصل مبحث۔ اس مختصر مبحث سے واضح ہے کہ تحریک خلافت اور ہندوؤں سے تعاون کے معاملات کے ماسوا اقبال اور جوہر کے افکار کاملاً ہم آہنگ رہے ہیں۔ دوسرے امر سے جوہر آخر الامر دست کش ہو گئے تھے اگر خلافت ان کے لوازم عقائد کا جزو رہی اور وہ آخری وقت تک کسی نہ کسی اسلامی ملک میں نظام خلافت کے احیا اور احیا کی خاطر کوشش کرتے رہے۔ اقبال اور جوہر کی قربت فکر اور یگانگت عمل کے اس بیان کو بہتر ہوگا کہ مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم کی تحریر کے ایک

---

[۱] مولانا جوہر کے جسد خاکی کے انگلستان سے فلسطین منتقل کیے جانے کا اشارہ ہے۔

[۲] بیت المقدس۔

[۳] معراج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ نبی اکرم رات کو مکہ مکرمہ (حرم کعبہ) سے فلسطین (مسجد اقصیٰ) تشریف لائے (اسرا) اور یہاں سے معراج عوالم بالا کے لیے روانہ ہوئے۔

اقتباس پر ختم کر لیا جائے:

"اقبال اور جوہر کا رنگ عملی دنیا میں ایک دوسرے سے الگ رہا لیکن نظر اگر سطح سے گزر کر تہ تک پہنچے اور محض عملی نہیں محرکاتِ عملی سامنے ہوں تو ہر دیکھنے والا دیکھ لے گا کہ دونوں ایک ہی مٹی سے پیدا، سرشت ایک طینت ایک، قالب دو روح ایک، حب اسلام کے جنوں میں دونوں گرفتار عشقِ رسول واسلام کے نشے سے دونوں سرشار، ایک کو سیاست سے اور دوسرے کو شاعری سے، دونوں اسی ایک رنگ سے رنگین، فرق صرف اتنا کہ ایک کے کلام میں حکیمانہ ذوقِ عرفان، دوسرے کے قلم وزبان میں جوشِ طوفان، دونوں دنیا میں جیے تو اسلام کی توحید کا کلمہ پڑھتے ہوئے، دونوں دنیا سے اُٹھے تو آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است کا وظیفہ جپتے ہوئے، ایک کے چہرے پر سیاست کا نقاب، دوسرے کے نام کا سخن گویوں کی محفل سے انتساب، حقیقتاً نہ یہ شاعر نہ وہ سیاسی لیڈر رہے۔"[1]

---

[1] ایم۔ایس۔ناز، "حیاتِ اقبال" (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء) ص ۱۲۱، بحوالہ رسالہ "جوہر" (اقبال نمبر) دہلی۔

پروفیسر عزیز احمد (مرحوم) کی اقبال شناسی

اُردو میں علامہ اقبالؒ کے فکروفن پر خاص جامع کتابیں انگشت شمار ہیں۔ جیسے 'روحِ اقبال' (ڈاکٹر یوسف خان، ۱۹۴۲ء) 'اقبال نئی تشکیل' (۱۹۴۷ء، عزیز احمد) 'اقبالِ کامل' (عبد السلام ندوی ۱۹۴۸ء) اور 'فکرِ اقبال' (ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، ۱۹۵۹ء)

۱۹۴۷ء میں 'اقبال' نئی تشکیل' جب شائع ہوئی تو اس کے صفحات ۴۵۹ تھے اور اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے:

"میرے علم میں کوئی اور مثال ایسی نہیں ہے کہ کسی شاعر نے کسی قوم کے مستقبل پر ایسا گہرا ایسا دیرپا اثر ڈالا ہو۔ اور صرف یہی نہیں' اقبال کا پورا کلام پڑھنے کے بعد اقبال کے اطراف بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ رومی' نی تشے' برگساں' قشطلے الجیلی' یونانی فلسفے' اسلامی فلسفے' قدیم ہندو فلسفے' جدید یورپی فلسفے' جرمن' اطالوی' انگریزی شاعری' فارسی غزل' اردو غزل سب کچھ پڑھنے کے بعد پھر اقبال کو پڑھیے تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ابھی اور بہت کچھ پڑھنا ہے۔ اور ہمیشہ ہر مرتبہ اقبال کے حقائق خیالات تصورات اس کی ترکیب سے پیدا ہونے والے امکانات کی نت نئی شاہراہیں' راستے' گلیاں کوچے' نظر کے سامنے پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ ناظر پریشان ہو کر رہ جاتا ہے کہ ابھی تک وہ اقبال کے فکروشعر کے ساحل پر خزف چینی ہی کرتا رہا' سمندر کا پانی تو اور آگے سے شروع ہوتا ہے۔

"اقبال کے کلام میں دنیا بھر کے تفکر کا ایسا امتزاج ایسی ترکیب ہے جو شاید اس سے پہلے صرف دانتے نے قرونِ وسطیٰ میں' اور گوئٹے نے عصرِ حاضر میں حاصل کی' اور اس کے علاوہ اقبال کی شاعرانہ شخصیت میں اِس تفکر سے بھی ہٹ کر ایسی عظمت' رفعت' گہرائی' ایسا متحرک جمال' ایسا حسین جلال ہے کہ ناممکن ہے کوئی ان کا اور پھر دنیا بھر کے

ادب کا' نیک نیتی سے مقابلہ کرے اور پھر اقبال کو دنیا کے شاعروں کی اوّل ترین صف میں شمار نہ کرے۔ وہ صف جس میں صدیوں کے بعد کسی شاعر کو جگہ ملتی ہے' اور وہ صف 'جس میں ہومر' شیکسپیئر' دانتے اور کالیداس اور گوئٹے شامل ہیں۔

" اقبال کے تفکر کی ہمہ گیری اور اِس کتاب کے محدود موضوع کی وجہ سے بہت سے مسائل یا تو چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ پھر کبھی تفصیل سے اُن پر خامہ فرسائی کی جائے' یا تشنہ طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ بہت سے ایسے دلچسپ مضامین تھے جن پر میں اب بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ مثلاً اقبال کا نظریۂ فن' یا دانتے کی طربیۂ خداوندی' جرمن رومانی شاعری' اور فارسی غزل کا اقبال کی شاعری پر اثر یا خطوط کی روشنی میں اقبال کی نفسیات کا تجزیہ۔ لیکن اس کتاب میں جو اقبال کے اساسی تفکر' اور خود ان کے اپنے نقطۂ نظر سے اُن کے اہم ترین "فرض" سے متعلق ہے' اِن دوسرے مضامین کی گنجائش نہ نکل سکی' آئندہ کبھی اِن پر کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ خودی کا مسئلہ بھی میں نے صرف اسی حد تک چھیڑا ہے' جس حد تک اِس کا انسانِ کامل کے تصور سے براہِ راست تعلق ہے' زمان و مکان کے موضوع پر اور زیادہ تفصیل سے کچھ لکھنے اور اقبال کے خیالات پر تنقید کرنے میں میں نے اپنے آپ میں صلاحیت نہیں پائی۔ جہاں اقبال کے اور تمام ماخذوں کا بہت تفصیلی ذکر ہے' وہاں میں نے عمداً رومی کا ذکر کم کیا ہے۔ کیونکہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے' اور رومی کا نام چونکہ اقبال کے یہاں بہت آتا ہے اِس لئے ان کے اثر کو ذرا مبالغہ کے ساتھ بھی محسوس کیا گیا ہے۔ بہر حال اس کتاب میں جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ کئی سال کے مطالعے' محنت اور اعتقاد کا رس ہے۔ بڑی جرأت سے اِس کا نام "نئی تشکیل" تجویز کیا گیا' کیونکہ اقبال اگر مجدد نہیں تھے تو کچھ بھی نہیں تھے۔"

منقولہ بالا اقتباس ہمیں بڑا حقیقت آگیں نظر آیا[۱]۔ اقبال کا جہاں اس میں صحیح تجزیہ ملتا ہے وہاں خود اس کتاب اور مصنف کا بھی اس میں تعارف پنہاں ہے۔ جن موضوعات پر مصنف نے بعد میں لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا' ان میں سے اقبال کے 'نظریۂ فن' پر کم از کم وہ ایک

---

[۱] کتب خانہ تاج آفس' بمبئی اور ممتاز دولتانہ کے نام معنون ہے۔

مفصل مضمون لکھے گئے۔

۱۹۷۸ء میں 'اقبال نئی تشکیل' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا (گلوب پبلشرز لاہور) جس میں 'اقبال کا نظریۂ فن' شامل کیا گیا اور اوپر منقولہ اقتباس کو کتاب کے شروع میں لایا گیا۔

پروفیسر عزیز احمد اقبالیات کا ایک اہم حوالہ ہیں۔ مرحوم جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے اُستاد تھے۔ بعد میں وہ ٹورنٹو یونیورسٹی (کینیڈا) میں علوم اسلامیہ کے پروفیسر ہوئے۔ وہ ارسطو کی 'بوطیقا'، ڈانٹے کی 'طربیۂ الٰہی' اور کئی دوسری کتابوں کے مترجم تھے۔ اپنی عمر کی آخری ربع صدی میں وہ انگریزی میں لکھتے رہے۔ اس دوران میں ایک آدھ بار انہوں نے اقبال پر بھی لکھا[1]۔ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند اور ایک حد تک حامئی اشتراکیت ادیب اور نقاد تھے۔ اس مناظر میں اب ہم 'اقبال نئی تشکیل' اور ان کے سات مقالوں (مرتبہ پروفیسر طاہر تونسوی، مکتبۂ عالیہ لاہور ۱۹۷۶ء) کو اقبال شناسی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

'اقبال نئی تشکیل':- کتاب کے تین ابواب ہیں: وطن پرستی کا دور، اسلامی شاعری کا دور، انقلابی شاعری کا دور۔ ذیلی عناوین کو ملائیں تو ۲۱، ۲۲ سرخیاں بنتی ہیں اور ان کی فرعی سرخیاں متعدد ہیں۔ اقبال نے نظریۂ وطنیت (سیاسی تصور) کی کبھی حمایت نہیں کی۔ ان کی شاعری اسلامی تعلیمات سے کبھی عاری نہیں رہی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاسوں میں یورپ جانے (۱۹۰۵ء) سے قبل جو نظمیں وہ پڑھتے رہے، وہ 'باقیاتِ اقبال' وغیرہ نام کے مجموعوں میں دیکھی جا سکتی ہیں، اور ان میں عظیم اسلامی نظمیں شامل نظر آتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام سے بڑھ کر کوئی تصورِ حیات انقلاب آموز[2] نہیں۔ لہٰذا اس کتاب کے

---

[1] انہیں شیخ عزیز احمد اور ڈاکٹر محمد (ایم) عزیز احمد سے ممتاز رکھنا چاہیے۔ 'قولِ اقبال' بھی غالباً کسی دوسرے عزیز احمد نے مرتب کیا ہے۔

[2] مثلاً

گو صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب   دیں بندۂ مومن کیلئے موت ہے یا خواب

اے وادیٔ لولاب

اس سے بڑھ کے اور کیا فکر و عمل کا انقلاب   پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

(ارمغان حجاز)

عناوین مجھے کم از کم اپیل نہیں کرتے۔ مصنف گویا یوں سوچتے رہے کہ اقبالؔ ایک زمانے میں وطن پرست تھے، پھر اسلام پرست بنے اور اس کے بعد انقلاب پرست یعنی اشتراکیت وغیرہ کے ہم نوا حالانکہ یہ اقبالؔ کے ذہنی اور فکری ارتقا کی کیفیت ہے، گو وہ از اول تا آخر ایک مذہبی اور اسلامی شاعر و مفکر رہے ہیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے اقرب اور بعض امور کے مستحسن پہلوؤں کی انہوں نے تعریف کی مگر ان کی تعریف و توصیف کو اسلام کے نقطۂ نظر سے ہی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

کتاب کا مطالعہ کر لیا گیا۔ اب قارئین کو کسی قدر شریکِ مطالعہ کرتے ہیں۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن (۱۹۴۳ء) پیشِ نظر رہے۔ مگر یہاں صرف چند باتوں کی طرف حوالہ مشتے از خروارے کے مصداق ہے۔

مصنف کے نزدیک (صفحہ ۱۳۶) برِ صغیر کا معاشی مسئلہ تقسیم ملک کا متقاضی موثر تھا، حالانکہ اقبالؔ معاشی مسائل سے زیادہ فرقہ وارانہ اور ثقافتی مسائل کی خاطر تقسیم ملک چاہتے تھے[۱]۔ اشتراکیت کی انسانی تعلیم کی خوبیاں پروفیسر عزیز احمد کو اتنی عزیز ہیں (صفحہ ۳۷) کہ وہ بھرتری ہری کی تعلیمات سے ماخوذ ذیل کے شعرِ اقبال کو اس تعلیم کا خاصا قرار دیتے ہیں:

سجدہ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نرسد　　　زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت[۲]

علامہ اقبالؔ پر مولانا محمد علی جوہر نے ایک بار یہ الزام لگایا تھا کہ وہ مادحِ سلاطین ہیں[۳]۔ اسی قسم کا الزام عزیز احمد بھی لگاتے ہیں (صفحہ ۸۲، ۸۳)۔ وہ بانگِ درا کی نظموں "گورستان

---

۱ دیکھئے مثلاً قائد اعظم کے نام اقبالؔ کا مکتوب مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء۔

۲ جاوید نامہ　　　آہ سوئے افلاک۔

۳ دیکھیں سہ ماہی "اقبال" لاہور بابت اکتوبر ۱۹۸۱ء میں میرا مقالہ: اقبالؔ اور جوہرؔ کے روابط صفحہ ۸۲ بحوالہ مولانا محمد علی "شخصیت اور جذبات" از سید نظر برنی۔ جوہر نے جس شعر کو ہدفِ تنقید بنایا تھا عزیز احمد نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

دلِ ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں　　　اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

شاہی' اور 'قربِ سلطان' کے علاوہ 'پیامِ مشرق' 'جاوید نامے' اور 'مسافر' میں امان اللہ خاں' والیٔ بھوپال[1] نادر شاہ افشار' نادر شاہ افغان اور ظاہر شاہ وغیرہم کے ذکر کا حوالہ دیتے ہیں۔ انہیں اقبال کی نصیحتِ سلاطین بھی پسند نہیں کیونکہ نصیحت اور مواعظت کے لئے سعدی اور ان کا زمانہ موزوں تھے۔ نادر شاہ افشار کی تعریف میں اقبال نے کہا تھا:

نادر آں دانائے رمزِ اتحاد — با مسلماں داد پیغام و داد

مصنف کو اچنبھا ہے کہ اہلِ دہلی کے بے رحم قاتل کی یہ تعریف کیسے کی گئی ہے۔

"یا تو مجھے اقبال کا نقطۂ نظر سمجھنے میں یہاں غلط فہمی ہوئی ہے یا اس سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے۔" (صفحہ ۸۲)

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال ابتدا سے مخالف ملوک تھے۔ جاوید نامہ اور ارمغانِ حجاز میں انہوں نے نظامِ ملوکیت کے خلاف بہت لکھا۔ انگریزی میں 'Divine Right to Rule' کے عنوان سے ان کا نوٹ کتنا دلآویز تھا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں ضدِ ملوک شاعری کے نمونے دیکھنے ہوں تو "اسرارِ خودی" کے تعتیہ اشعار کی بین السطور دیکھ لی جائیں[2]۔ ملوک و سلاطین بہرحال ہماری تاریخ کا جزو رہے ہیں اور ان میں نیک نام لوگ بھی تھے اور ہیں۔ اقبال اپنی موعظتِ حکیمانہ سے انہیں کیوں خارج کرتے اور نادر شاہ افشار کی شیعہ سنی اتحاد کی کوششوں کو وہ شرحِ صدر کے ساتھ کیوں نہ سراہتے؟

جاوید نامے میں حضرت شاہ ہمدان کی کتاب 'ذخیرۃ الملوک' کی تعلیمات کے تحت اقبال نے ایک مقام پر قابلِ اطاعت حکمران کی یہ صفات بتائی ہیں کہ وہ یا تو لوگوں کا منتخب ہو یا دلبری و قاہری کا امتزاج رکھنے والا صالح جوانمرد ہو[3]۔ مگر ایک انتہا کبند دوست ادیب

---

[1] کارل انتظامیہ کے دوران 'کابل ٹائمز' نے بھی ایک بار اقبال کے پادشاہانِ افغانستان کے ساتھ روابط کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

[2] جیسے — در دعائے نصرت آمین تیغِ او — قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ او

[3] یا — اولی الامرے کہ منکم شانِ اوست — آیۂ حق حجت و برہانِ اوست

یا جوانمردے چو صرصر تند خیز — شہر گیر و خویش باز اندر ستیز

روزِ کیں کشور گشا از قاہری — روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری

اس جوانمرد کو "اشتمالی روس کے پرولتاری آمر" کا کنایہ جاننے پر مجبور ہے۔ (صفحہ ۱۰۷)

"اقبال، نئی تشکیل" دراصل تفکرِ اقبال سے مربوط ہے۔ اس میں دو باتیں نہ ہوتیں، تو یہ اقبالیات کی بہترین ترجمان کتابوں میں محسوب ہوتی۔ ایک مصنف کا افکارِ اقبال کو کھینچ تان کر اشتراکی رنگ دینے کا رجحان، اور دوسرے مغربی مفکرین سے اقبال کی اثر پذیری کا مبالغہ آمیز بیان۔ ایک غلط فہمی یہ رہی ہے کہ اقبال اسلامی سوشلزم کے ہمنوا تھے اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کو بھی خطوط وغیرہ میں وہ یہی مشورہ دیتے رہے ہیں کہ ان کی مجوزہ اسلامی ریاست (پاکستان) میں یہی نظام رائج کیا جائے (صفحہ ۵۸۸ تا ۵۹۰)۔ حقیقت میں اقبالیات کے سیاق میں اسلامی سوشلزم سے مراد اسلامی معاشرت اور معیشت وغیرہ کے اصول ہیں جو پورے اسلامی نظام کا ایک جزو ہیں۔ مصنف اقبال کے نظریۂ اجتہاد کو برگساں کے تصور سے ماخوذ بتاتے ہیں اور یہ کس قدر مہمل بات ہے۔ کہیں کہیں مصنف اقبال کے خلاف الزامات کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ مثلاً مسولینی کے حوالے سے اقبال کو فاشزم کا ہمنوا بتانا انہیں پسند نہیں۔ مشہور ترقی پسند ادیب اور شاعر ن۔ م۔ ارشد نے کہا تھا:

جہاں غریب کو نانِ جویں نہیں ملتی وہاں حکیم کے درسِ خودی کو کیا کیجئے

پروفیسر عزیز احمد لکھتے ہیں: "ن۔ م۔ ارشد سے اصلی چوک جو ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ حکیم کے درسِ خودی کے پیچھے نانِ جویں کا مسئلہ بھی ہے۔ دراصل اقبال کی شاعری کا ایک سہرا اگر درسِ خودی ہے تو دوسرا نانِ جویں ....." (صفحہ ۱۷۷)۔ لیکن دفاعِ اقبال کرتے کرتے وہ کارل مارکس اور اشتراکیت کو نہیں بھولتے۔

"مادی نقطۂ نظر سے ان پر یہ الزام عائد ہو سکتا ہے کہ انہوں نے طبقاتی کشمکش اور عمرانی حقائق کو بجائے مارکس کی طرح مادی جدلیت سے وابستہ کرنے کے اپنی اشتراکیت کو اسلامی وجدانیت اور مذہبی عینیت سے وابستہ کر دیا ہے۔" (صفحہ ۱۷۸)

یہ کتاب جہاں مطالعۂ اقبال کی ایک عمدہ کوشش ہے، وہاں کئی فکری مغالطے بھی پیش کرتی ہے۔ مثلاً صفحہ (۱۷۸) کی یہ عبارت دیکھیں جس کی غلط تعبیر پر پہلے اشارہ ہو چکا ہے:

"..... اقبال کی خالص اسلامی شاعری کا دور ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی زمانے سے شروع ہو کے 'خضرِ راہ' تک باقی رہتا ہے[1] اور 'خضرِ راہ' سے بنیادی انقلابی اور معاشی محرکات

---

[1] 'خضرِ راہ' ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی۔ مصنف بعد کی نظموں جیسے "طلوعِ اسلام" (۱۹۲۳ء)،

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان کے کلام میں اس قدر اساسی طور پر جاگزیں ہوجاتے ہیں کہ اس کے بعد سے لے کر 'ارمغان حجاز' تک ان کی ساری شاعری اور اکثر و بیشتر تحریریں خالص اسلامی سے زیادہ انقلابی رنگ رکھتی ہیں اور اس زمانے میں وہ اسلامی اشتراکیت کا تصور مکمل کرتے ہیں"۔

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اشتراکیت کی ترویج کے لئے اسلام اور اقبال کا نام لے رہے ہیں۔

سات مقالے: اقبال اور پاکستانی ادب: کتاب کا نام دراصل ایک مقالے کا عنوان ہے۔ باقی چھ مقالوں میں سے 'اقبال کا نظریۂ فن' 'اقبال نئی تشکیل' کے نقشِ ثانی کا جزو بنا دیا گیا۔ باقی پانچ مقالے، جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے، ذیل کے عنوانات سے مزین ہیں:

اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر، اقبال کا رد کردہ کلام، کلاسیکی نظریات پر اقبال کی تنقید، اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ، کلامِ اقبال میں خونِ جگر کی اصطلاح۔

پروفیسر عزیز احمد ایک وسیع علم اور مطالعے والے نقاد اور ادیب تھے، اس لئے ان کے مضامین میں بڑی معنی خیزی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے۔

'اقبال اور پاکستانی ادب' میں مصنف یہ تلقین کرتے ہیں کہ اقبال کے ارادتمند شاعر اور ادیب 'مکتبِ اقبال' وجود میں لائیں۔ 'حسن و عشق کے عنصر' والے مضمون میں یوں تو مصنف اقبال کی شاعری کے لئے رطب اللسان ہیں، مگر اقبال کی غزلیات انہیں اپیل نہیں کرتیں، خصوصاً ان میں تغزل کا فقدان ہے۔ اقبال کی اردو اور فارسی غزلوں نے روایتی غزل کے ظاہر و باطن کو بدل کے رکھ دیا، مگر تنقید کی ایک قسم ذوقی بھی ہے۔ اگر کوئی تغزلِ محض کا دلدادہ ہو، تو اسے اقبال کی اکثر غزلوں میں یہ نعمت واقعی نہ مل سکے گی۔

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو   نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

(بالِ جبریل)

کلاسیکیت سے مراد یونانیت ہے۔ جس کے خلاف اقبال نے اپنے انگریزی خطبات

(باقی پچھلے صفحہ کا) 'ذوق و شوق' (۱۹۳۲ء) 'مسجدِ قرطبہ' اور 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' (۱۹۳۶ء) کو انقلابی تو مانتے ہیں مگر اسلامی ہرگز نہیں، حالانکہ اقبالؒ نے اسلام کو ہمیشہ ایک انقلابی دین کے طور پر پیش کیا ہے۔

ہیں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ خونِ جگر کی اصطلاح، کو اقبالؔ نے جس طرح استعمال کیا، پروفیسر عزیز احمد نے اسے بالاختصار واضح کیا ہے۔ نظریۂ فن پر مضمون خوب ہے، گو اس میں زیادہ رطب کے ساتھ کچھ یابس نکتے بھی ہیں۔ پروفیسر مرحوم کی اقبال شناسی مُسَلَّم ہے مگر ترقی پسند اور اشتراکیت دوست مصنف کو اقبالیات کے منتخب موضوعات سے دلچسپی ہو سکتی ہے 'اقبال نئی تشکیل'، اور زیرِ بحث سات مقالے (راقم نے ان کے مزید اردو اور انگریزی مقالے بھی مطالعہ کیے تھے) ان کی اس دلچسپی کے مظہر ہیں۔ اور انہیں مطالعہ کرتے وقت مصنف کا فکری سیاق پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

اقبالؔ کا ایک ولولہ انگیز ترکیب بند

اجرام و شعائرِ فلکی سے علامہ اقبال کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ آفتاب، ماہتاب، اور ستارے (اپنے مختلف اردو، عربی یا فارسی ناموں کے ساتھ) کئی معنی خیزیوں کے ساتھ کلامِ اقبال میں مذکور ہیں۔ یوں تو ان تینوں شعائر کا ذکر خاصا متنوع ہے مگر مجموعی طور پر مختلف ستاروں کا بیان ان کے ہاں زیادہ توجہ طلب ہے۔ ستاروں کے بارے میں ان کی متعدد نظمیں ہیں جیسے:

بزمِ انجم، صبح کا ستارہ، چاند اور تارے، ستارہ، دو ستارے، شبنم اور ستارے (بانگِ درا)، افکارِ انجم اور سرودِ انجم (پیامِ مشرق)۔ زمزمۂ انجم بھی اسی قبیل کی ایک نظم ہے جو جاوید نامے میں "فلکِ قمر" والے حصے سے قبل ملتی ہے۔ ترکیب بند اقبال کی اردو اور فارسی شاعری میں کئی ہیں اور اس ہیئت میں ان کی لازوال طویل نظمیں بھی ملتی ہیں تصویر درد، بزمِ انجم، شمع اور شاعر، حضور رسالت مآبؐ میں، شفاخانہ حجاز، صدیقؓ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، بلالؓ (لکھا ہے ایک....)، پھولوں کی شہزادی، شکسپیئر، خضر راہ، طلوعِ اسلام مسجد قرطبہ، افکار پریشان، عبدالرحمٰن اول.... ، طارق کی دعا، ذوق و شوق اور تاتاری کا خواب وغیرہ اردو کے اور، گلِ نخستین، تسخیرِ فطرت، نوائے وقت، اگر خواہی حیات..... اور پیام وغیرہ علامہ مرحوم کے فارسی کے مشہور ترکیب بند ہیں۔ زمزمۂ انجم، اقبال کے مختصر ترکیب بندوں میں سے ہے مگر معانی خیزی کے لحاظ سے بے انتہا ولولہ انگیز اور توجہ طلب ہے۔ یہ ترکیب بند بڑی حد تک مسمط بھی ہے۔

جاوید نامے کا ابتدائیہ۔

جاوید نامہ، اقبالؔ کا افلاکی سفر نامہ ہے۔ انہوں نے ایک دلچسپ "مناجات" لکھی جس میں انسانوں کی طرح ستاروں کی بھی تنہائی کا ذکر ہے۔

گرچہ بر گردوں ہجومِ اختر است　　　　ہر یکے از دیگرے تنہا تر است

بر یکے مانند ما بیچارہ ایست　　　　در فضائے نیلگوں آوارہ ایست

بعد میں شاعر تخلیقِ کائنات کے وقت آسمان و زمین کے ایک مکالمے کو نقل کرتے ہیں۔ آسمان زمین کو پستی اور کم مائیگی کا طعنہ دیتا ہے۔ زمین دل گرفتہ اور غمگین ہوتی ہے مگر ندائے غیب اس کی ڈھارس بندھاتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ غوغائے حیات اور اولادِ آدمؑ کے عقل و عشق کی برکتوں کی بنا پر زمین بالفعل آسمان سے افضل و برتر ہے۔ اس موقع پر 'نغمۂ ملائک' سنائی دیتا ہے جو دراصل اقبالؔ کی زبورِ عجم سے ماخوذ ایک غزل ہے۔ آسمان کے بیانِ فضائل کو شاعر نے 'تمہید آسمانی' کا عنوان دیا تھا۔ اب 'تمہید زمینی' کے تحت وہ اپنے رہنما مولانائے روم کی روح سے کنارِ دریا ملاقات کا حال قلم بند کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے روحِ رومی سے سوال کیا تھا ؎

گفتمش موجود و ناموجود چیست؟　　　　معنیٔ محمود و نامحمود چیست؟

رومی اپنے جواب میں فلسفۂ معراج بیان کرتے ہیں اور حقیقتِ معراج یہ بتاتے ہیں کہ وہ شعور و وجدان میں انقلاب و دیگر گونی کا نام ہے۔ ؎

نو ازیں نُہ آسماں نرسی؟ مترس　　　　از فراخائے جہاں نرسی؟ مترس

چشم بکشا بر زمان و بر مکاں　　　　ایں دو یک حال است از احوالِ جاں

شاعر اور اس کے افلاکی راہبر کی اس گفتگو کے دوران 'زروان' آنکلتا ہے جو زرتشتی مذہب کی رُو سے زمان و مکان کی روح ہے۔ زروان انہیں سیارگانِ بالا کی طرف لے چلتا ہے اور اس دوران شاعر کو 'زمزمۂ انجم' سنائی دیتا ہے ؎

نغمۂ انجم بگوش من رسید　　　　بر روگیہا بے حجاب آمد پدید

تین بندوں کا ترکیب بند۔

زمزمۂ انجم کے تین بند ہیں۔ مترنم بحر ہے۔ اور ہر بند کے چار شعر۔ تین شعر اصل ہیں اور چوتھا ہر بند کا ٹیپ کا بیت ہے۔ اس بند کے مطالب اقبالؔ کے کئی دلپذیر موضوعات پر محیط ہیں۔ جیسے:

عقل و عشق کی اہمیت، عظمتِ انساں، تسلسلِ حیات اور فقر و درویشی کی شاہی و

ملوکیت برتری۔ راقم الحروف کو یہ ترکیب بند بے انتہا پسند ہے اور اکثر اسے سفر و حضر میں گنگناتا رہتا ہوں۔ آیئے ہر بند کا متن مع ترجمہ و توضیح دیکھیں۔

پہلا بند۔

عقلِ تو حاصلِ حیات، عشقِ تو سرِ کائنات — پیکرِ خاک، خوش بیا ایں سوئے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ و مشتری از تو رقیبِ یک دگر — از پئے یک نگاہِ تو کشمکشِ تجلیات
در رہِ دوست جلوہ ہاست تازہ بتازہ نو بنو — صاحبِ شوق و آرزو دل ندہد بہ کلیات
صدق و صفا است زندگی نشو و نماست زندگی — تا ابد از ازل بتاز، ملکِ خداست زندگی

ترجمہ: مٹی کے پتلے انسان! تیری عقل زندگی کا حاصل ہے اور تیرا عشق کائنات کا راز ہے۔ جہات کے جہان (دنیا) کے اس طرف آنا تجھے مبارک ہو۔ تیری خاطر زہرہ، چاند اور مریخ ستارے ایک دوسرے کے رقیب ہو رہے ہیں بلکہ تجھ پر ایک نظر ڈالنے کی خاطر تجلیاتِ باری تعالیٰ میں کشمکش اور رقابت ہو رہی ہے۔ دوست کی راہ میں تازہ بتازہ اور نو بنو جلوے ہیں مگر شوق و آرزو والا شخص کلیات (صفات) سے دل نہیں لگاتا۔ زندگی صدق و صفا اور نشو و نما کا نام ہے۔ ازل سے ابد تک بڑھتے جاؤ۔ زندگی خدا کا اختتام ناپذیر ملک ہے۔

عقل کو اقبال نے حاصلِ حیات کہا اور عشق کو رازِ کائنات۔ اس سے بہتر تجزیہ اور موازنہ اور کیا ہوگا۔ عظمتِ انسانی کا اس سے عمدہ بیان کیا ہوگا کہ انسانوں کو عالمِ بالا کی طرف خوش آمدید کہنے میں سیارگانِ فلک اور تجلیاتِ خدائی میں رقابت ہو رہی ہے کہ کون انہیں پہلے آدابِ احترام پیش کرے۔ اس شعر کو دیکھ کر بالِ جبریل کی غزل اول یاد آ رہی ہے ؎

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں — میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

لفظ کلیات کلی کی جمع ہے۔ یہاں غالباً اس سے مراد تجلیات و صفات ہیں۔ شاعر اس کتاب میں 'حضور' تک پہنچتا ہے اس لئے ستاروں کی زبانی اپنا یہ مطمحِ نظر بیان کرتا ہے کہ صاحبِ شوق و آرزو (مردِ مومن) ان کلیات اور جلوہ ہائے رنگین سے دل نہیں لگاتا، بلکہ ساری توجہ ذات کی کوئی جھلک اور تجلی دیکھنے پر مبذول رکھتا ہے۔ جاوید نامے میں 'تمہید زمینی' کے تحت یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ ؎

برمقامِ خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

مردِ مومن در نسازد با صفات | مصطفیٰؐ راضی نشد الا بذات

تسلسلِ حیات کے بارے میں اقبال کے خیالات ان کی تقریباً ہر کتاب میں آئے ہیں مثلاً 'پیامِ مشرق' میں 'نقشِ فرنگ' کے عنوان کے تحت نظم 'پیام' میں فرماتے ہیں ؎

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود | ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود
آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت | آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

اور 'خضرِ راہ' میں ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی | ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ | جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

مگر یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ اقبال ڈارونی ارتقائے حیات پر ہی اعتقاد نہ رکھتے تھے ان کے نزدیک حقیقی زندگی وہ ہے جس میں صدق و صفا یعنی راستی اور تقویٰ شعاری ہو۔

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ | گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل | حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

دوسرا بند۔

شوقِ غزل سرائے را رخصتِ ہائے و ہو بدہ | باز بہ رند و محتسب بادہ سبو سبو بدہ
شام و عراق و ہند و پارس خو بہ نبات کردہ اند | خو بہ نبات کردہ را تلخیٔ آرزو بدہ
تا بہ یمِ بلند موج معرکۂ بنا کند | لذتِ سیلِ تند رو بادلِ آبجو بدہ
مردِ فقیر آتش است میری و قیصری خس است | فال و فرِ ملوک را حرفِ برہنہ بس است

ترجمہ: غزل سرا (شاعر) کے شوق کو آہ و فغاں کی اجازت دو۔ رند اور محتسب کو دوبارہ گھڑے کے گھڑے شراب پلاؤ۔ عراق، شام، ہند اور ایران والوں نے قند و نبات کھانے کی عادت اختیار کر رکھی ہے۔ قند و نبات کھانے والوں کو آرزو کی تلخی دے دیں۔ ندی کے دل میں تند رو سیل کی لذت پیدا کرو۔ تاکہ وہ بلند و بالا امواج والے سمندر کے ساتھ نبرد آزمائی کر سکے۔ درویش و فقیر آگ ہے، ملوکیت خس و خاشاک کی طرح ہے۔ بادشاہوں کی شان و شکوہ سے مقابلے کے لئے ایک بے باک بات اکتفا کرتی ہے۔

پہلا شعر رندی و مستی کا آئینہ دار ہے۔ سارے رندوں کے علاوہ محتسبوں کو بھی بادۂ حق پلانے کے مؤید ہیں۔ غزل، تغزل کی خاطر نہیں بلکہ انقلاب پیدا کرنے کی خاطر ہو۔ اقبال کی شاعری میں غزل اور دوسرے اصنافِ سخن میں معنوی طور پر کوئی فرق نظر نہیں آتا ؎

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے آشنا میں　　　کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو کہ تازی

بعد کے دونوں شعر واضح ہیں۔ شاعرِ مشرق، تن آسان مسلمانوں کے کام و دہن کو تلخیٔ آرزو سے بھرنا چاہتے ہیں۔ اردو غزل میں بھی انہوں نے یہ مضمون کئی جگہ باندھا ہے جیسے ؎

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر　　　کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی　　　کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

جوئے آب یا ضعف و تُنکی کے دیگر مظاہر (جیسے کبوتر) ان کے ہاں اس طرح مذکور ہوئے ہیں کہ وہ مسلمانوں یا دیگر مظلوم و مفلوک انسانوں کا واضح کنایہ نظر آتے ہیں۔ اقبال کمزوروں کو طاقتوروں پر غالب دیکھنے کے بیحد آرزو مند تھے۔ ؎

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے　　　کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم　　　بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

جاوید نامے کی تالیف سے کچھ قبل وہ فقر و سلطنت یا فقیر و بادشاہ کا موازنہ کرنے لگے تھے جیسے:

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد　　　از شوکتِ دارا بہ، از فرِّ فریدوں بہ

فقر بخشی؟ با شکوہِ خسرو پرویز بخش　　　یا عطا فرما خردِ با فطرتِ روح الامیں

یا چناں کن یا چنیں!

(زبورِ عجم)

یہاں وہ مردِ فقیر کی آگ سے متاعِ میر و سلطان کو خاک کر دینے کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں تاکہ قاہری کے آثار مٹ جائیں اور دلبری کا دور دورہ ہو ؎

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود　　　زورور بر ناتواں قاہر شود

زیرِ گردوں آمری از قاہری است　　　آمری از ماسوا اللہ کافری است

تیسرا بند۔

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری — آں ہمہ جذبۂ کلیمؑ، ایں ہمہ سحر سامری

آں بنگاہ می کشد، ایں بہ سپاہ می کشد — آں ہمہ صلح و آشتی، ایں ہمہ جنگ و داوری

ہر دو جہاں کشا ستند، ہر دو دوام خواستند — ایں بہ دلیلِ قاہری، آں بہ دلیلِ دلبری

ضربِ قلندری بیار، سدِ سکندری شکن — رسمِ کلیمؑ تازہ کن، رونقِ سامری شکن

ترجمہ: قلندری و درویشی سراپا جذبۂ کلیم ہے جبکہ سکندری و ملوکیت کی شان و شکوہ سحرِ سامری کے سوا کچھ نہیں۔ قلندر و درویش نگاہ سے متاثر کرتا ہے اور سراپا صلح و آشتی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پادشاہ لشکر و سپاہ کے ذریعے لوگوں کو ہلاک کرواتے ہیں اور جنگ و جدال کی بنا ڈالتے ہیں۔ فقیر و بادشاہ دونوں جہاں کشا ہیں اور سلطنتِ دوام کے جویا۔ مگر فقیر دلبری سے کام لیتا ہے اور بادشاہ جبر و قاہری سے۔ ضربِ قلندری سے کام لو اور دیوارِ سکندری (ملوکیت) کو منہدم کر دو حضرت موسیٰ کلیمؑ اللہ کی رسم (مخالفتِ ملوک) کو تازہ کرو اور سامری کی ساحری کی رونق کے نقوش مٹا دو۔

حضرت موسیٰ کلیمؑ اللہ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کی فرعون، اس کے وزیر ہامان اور معاصر جادوگر سامری سے نبرد آزمائی کا ذکر قرآن مجید کی کئی سورتوں میں آیا ہے۔ سامری ان دونوں پیغمبروں کا رشتہ دار تھا اور اس نے بنی اسرائیل کو توحید کے بجائے گوسالہ پرستی کے راستے پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ سکندر یونانی کی جہاں کشائی معروف ہے۔ اقبال کے ہاں سکندر یا جمشید وغیرہ سے مراد بادشاہ یا نظام پادشاہی ہوتا ہے۔ قلندر، درا ویشں کا ایک ملامتی گروہ رہا ہے مگر اقبال کے ہاں اس سے مراد صاحب جذبہ فقیر کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی قلندر کہتے رہے۔

آخری بند در اصل دوسرے بند کے ٹیپ کے شعر کے ساتھ مربوط ہے۔ بقول شاعر ستارے اپنے نغمے میں ملوکیت کی مخالفت کر رہے ہیں، کیونکہ ان کا مشاہدہ مظہر ہے کہ یہ نظام سحرِ سامری کی طرح گمراہ کن ہے اور اس کی بنیاد جبر و قاہری پر

رکھی گئی ہے۔ وہ فقر و درویشی کی معنوی سلطنت کے حامی ہیں کیونکہ اس سلطنت کی عملداری انسانی قلوب پر رہی ہے۔

علامہ اقبال نے تاریخ اسلام کے گزشتہ یا معاصر نیک نام اور شریف النفس ملوک و امراء کی تعریف بھی کی ہے کہ ؎

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں — اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھولنے والی نہیں

(گورستانِ شاہی)

مگر اصولاً وہ ملوکیت کو جبر و استبداد کا مظہر جان کر اس کے مخالف تھے۔ جاوید نامے میں انہوں نے اسے اشتراکیت کا سا استعماری طریقہ بتایا ہے۔

ہم ملوکیت بدن را فربہی است — سینۂ بے نورِ او از دل تہی است
مثلِ زنبورے کہ بر گُل می چرد — برگ را بگذارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گُل ہماں — بر جمالش نالۂ بلبل ہماں
از طلسم رنگ و بوئے او گذر — ترکِ صورت گو ، بہ معنی نگر
مرگِ باطن گرچہ دیدن مشکل است — گُل مخواں او را کہ در معنی گِل است

اقبال فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام نے قیصریت و کسرویت کے خاتمے کی نوید دی تھی مگر بدقسمتی سے خود مسلمان ملوکیت کے حامی و مؤید بن گئے اور ملوکیت نے اسلام کے نقطۂ نظر کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ ؎

بندۂ مومن ز قرآں برخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

زمزمۂ انجم، کے آخری بند میں بادشاہوں کی جنگجویانہ سرشت کا ذکر ہے۔ یہ دراصل قرآن مجید کی سورۂ سبا کی طرف اشارہ ہے۔ (قصہ حضرت سلیمانؑ و بلقیس) اور 'خضرِ راہ' کے حصہ 'سلطنت' میں اقبالؒ نے اس کی طرف واضح تر صورت میں اشارہ

کیا ہے۔ بلکہ زمزمۂ انجم کا یہ بند لفظ و معنی کے اعتبار سے 'سلطنت' کے بعض اشعار کی تشبیہہ ہے:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الملوک، سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن تا تراشی خواجۂ، از برہمن کافر تری

یادشاہوں کی جنگجویانہ سرشت کی طرف جاوید نامہ کے درج ذیل شعر میں بھی اشارہ ہے:

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

(فلک عطارد)

انبیائے و رسلؑ ہوں کہ اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام ان کی لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ نہیں ہے۔ دینِ حق ان ہی کے ذریعے پھیلتا رہا اور علامہ اقبالؒ اپنی بعد کی کتابوں میں بھی فقیرانِ حقانی کو امراء و ملوک سے برتر بتاتے رہے ہیں، جیسے سے

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے؟ خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے؟
اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے؟

سے

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

سے

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا موجود، اور، فقر کا، موجود، اور اشہد ان لا الٰہ، اشہد ان لا الٰہ

علامہ اقبالؒ اور مسلم خواتین کی جداگانہ یونیورسٹیاں

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ پاکستان میں عنقریب خواتین کی دو مستقل یونیورسٹیاں کام کرنا شروع کر دیں گی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کو بھی تعلیم نسواں کے سلسلہ میں خصوصی ذمہ داریاں سپرد کی گئی ہیں۔ اب بالعموم طبقہ نسواں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی جا رہی ہے مگر کوئی ایک صدی یا پون صدی پہلے برصغیر میں جامع قسم کی تعلیم نسواں کی اہمیت کے بارے میں کسی نے شاذ ہی کوئی بات کی ہو گی۔

علامہ اقبال کو فیاضِ ازل نے ایسا دُر پاش اور معمورِ تفکر ذہن عطا کیا تھا کہ برصغیر میں مسلم خواتین کی آزاد یونیورسٹی کا تصور پیش کرنے کا شرف بھی ان ہی کو حاصل ہوا۔ یہ تصور مجمل طور پر ۱۹۳۴ء میں پیش کیا گیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ وہ اپنے مفصل خیالات کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے مگر مسلسل بیماری نے انہیں اس کا موقع نہ دیا۔ تاہم مسلم خواتین کی آزاد یونیورسٹی کے سلسلے میں نیز تعلیم نسواں کی اہمیت اور جامعیت کے بارے میں ان کے افکار واضح ہیں۔

مسلم خواتین کی آزاد یونیورسٹی کا تصور علامہ اقبال نے ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل کے اجلاس کی صدارت کے دوران پیش کیا تھا۔ اقبال کی یہ تحریر ہفت روزہ حمایتِ اسلام لاہور کی ۱۹ جولائی ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں شامل تھی اور کئی کتابوں جیسے روزگار فقیر (جلد اول) اشاعت ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۲) اقبال اور انجمن حمائت اسلام (۱۹۷۶ء لاہور صفحہ ۱۲۲) اور اقبال اور مسئلہ تعلیم (لاہور ۱۹۷۸ء صفحہ ۳۴۸) میں اس کے اقتباسات موجود ہیں۔

حضرت علامہ کی تحریر میں تین اہم تجاویز تھیں، دینیات کی تعلیم، خواتین کی تعلیم

اور اسلامیہ کالج کی تعلیمی فضا کو بہتر بنانا۔

"........ دوسرا امر جو آپ کی فوری توجہ کا محتاج ہے۔ وہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم ہے..... میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام فی الحال مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اپنا نصاب تجویز کرے اور مجوزہ نصاب کے مطابق ان کا سالانہ امتحان لے کر خود ہی سندات تقسیم کیا کرے۔ جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا تعلق ہے۔ فی الحال آپ صرف ایک امتحان لینے والے ادارے کے طور پر کام شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ اس ادارے کو مسلمان عورتوں کی ایک آزاد یونیورسٹی کی صورت میں منتقل کر دیں بلکہ آپ کا مجوزہ انڈسٹریل گرلز سکول بھی اس یونیورسٹی کی ایک شاخ قرار پائے۔"

حضرت علامہ کی تقریر کے مندرجہ بالا اقتباس میں لفظ آزاد غالباً مستقل اور جامع کے معنی میں استعمال ہوا ہے گو ایران نے اسے اوپن کے مترادف بنایا ہے۔
(دانشگاہِ آزاد)

پس منظر۔

سید احمد خان (۱۸۹۸ء) نے مسلمانوں کو تعلیم کی نئی جہتوں پر متوجہ کیا۔ تعلیم اس دور میں خصوصاً بے توجہی کا شکار تھی۔ پڑھی لکھی خواتین سے بس یہی توقع ہوتی تھی کہ وہ دینی تعلیم سے بہرہ مند ہوں گی اور ایسی خواتین کی تعداد زیادہ بھی نہ ہوتی تھی سید احمد خان بھی اس بات کے قائل تھے کہ مسلمان خواتین کے لئے دینی اور خانہ داری کی تعلیم کافی ہے (دیکھیں حیاتِ جاوید اشاعت ۱۹۰۲ء صفحہ ۴۰۔۲۶) علامہ اقبال کو سید احمد خان کے نقطہ نظر سے اتفاق تھا مگر وہ تعلیم نسواں کو جامع تر بنانا چاہتے تھے، انہوں نے کئی مواقع پر فرمایا کہ دینی اور خانہ داری کے علاوہ مسلم خواتین کو عصری علوم و فنون کے اس عنصر سے آگاہ ہونا ضروری ہے جس کی انہیں احتیاج ہو مگر یہ علوم و فنون ان کے اصلی فرائض امومت اور تشکیلِ معاشرہ میں حارج نہ ہوں۔ اقبال کا ایک مضمون "قومی زندگی" کے عنوان سے ۱۹۰۴ء کے مجلہ "مخزن" میں شائع ہوا تھا (ملاحظہ ہو مقالات اقبال۔ مرتبہ سید الواحد لاہور ۱۹۶۳ء صفحہ ۳۹ تا ۶۲) جس میں تعلیمِ

نسواں کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے خیالات مجمل انداز میں لکھے ہیں اور اس طرح ۱۹۱۰ء کے ان کے اس انگریزی خطبۂ علی گڑھ میں بھی جس کا معتد بہ حصہ مولانا ظفر علی خان نے "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" (ایضاً صفحہ ۱۱۵ تا ۱۴۲) کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ۲۶۔ اپریل ۱۹۱۰ء سے علامہ اقبال نے اپنے کچھ تاثرات انگریزی میں لکھنا شروع کئے تھے جن کے اردو ترجمے کا نام "شذراتِ فکرِ اقبال" (مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی مجلس ترقیٔ ادب لاہور ۱۹۷۳ء) رکھا گیا تھا۔ اس میں اقبال مقصدِ تعلیم کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں۔ "آئینِ حیات کیا ہے؟ جہدِ مسلسل، پھر تعلیم کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیئے؟ بداہتہً کشمکشِ حیات کی تیاری جو قوم محض ذہنی تفوق کے لئے کوشاں ہے۔ کتاب میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے بارے میں ایک اہم پیراگراف "وحدتِ ملی" کے عنوان سے ملتا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔ ہماری وحدتِ ملی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو۔ جوں ہی یہ گرفت ڈھیلی ہوئی ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔۔۔۔ اس گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے، ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کسی معاشرے میں مذہب کا سب سے بڑا امین و محافظ کون ہوتا ہے؟ عورت ہوتی ہے، مسلم خواتین کو صحیح مذہبی تعلیم حاصل ہونی چاہیئے، کیوں کہ وہی قوم کی حقیقی معمار ہیں، میں آزاد نظامِ تعلیم کا قائل نہیں تعلیم بھی دیگر امور کی طرح قومی ضروریات کے تابع ہوتی ہیں۔ ہمارے مقاصد کے پیشِ نظر، مسلم بچیوں کے لئے مذہبی تعلیم بالکل کافی ہے۔ ایسے تمام مضامین جن میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے۔ احتیاط کے ساتھ تعلیمِ نسواں کے نصاب سے خارج کر دیئے جائیں۔۔۔۔۔" (کتاب مذکورہ صفحہ ۸۵،۸۶)

نسوانیت سے اقبال امومت مراد لیتے ہیں۔ یعنی عورت کا بیوی اور ماں کے طور پر تدبیرِ منزل اور تشکیلِ معاشرہ کا اہم کردار۔ ان امور کو اقبال نے بزبانِ شعر بھی کئی مقامات پر لکھا ہے، مثلاً "ضربِ کلیم" کے حصہ عورت میں ہے۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ۔۔۔ ہے حضرتِ انساں کیلئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن   کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

اس کتاب کے حصہ "تعلیم و تربیت" کا قطعہ "دین و تعلیم" بھی توجہ طلب ہے گو اس میں مرد و زن دونوں کے مسائل آتے ہیں :-

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز   ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم   ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے   قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے   کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

حضرت علامہ کا مدعا ہے کہ مسلمان اپنی تعلیم میں دین کو ایک غالب عنصر کے طور پر رکھیں اور قومی ضروریات اور تقاضوں کی روشنی میں نظامِ تعلیم مرتب کریں۔

مسلم خواتین کی جامع تعلیم۔

مسلم خواتین کی آزاد یونیورسٹی کا تصور اقبال کے بدیع تصورات میں سے ہے، ویسے بھی اقبال نے مسلم کی جامع تعلیم کے بارے میں کئی مواقع پر اظہار خیال فرمایا ہے، بہتر ہے کہ ہم حضرت علامہ کی تحریروں کے اقتباسات نقل کر دیں۔

"قومی زندگی" کے عنوان سے اقبال کا ایک مضمون اکتوبر ۱۹۰۴ء کے مجلہ مخزن میں شائع ہوا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام نے عظمت انسانی کا جو تصور دیا، اس تصور کی برکات سے مردوں کی طرح عورتیں بھی بہرہ مند رہی ہیں۔ تعلیم نسواں کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا :-

"...... عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے۔ ماں اور بیوی دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مضمر ہیں۔ اگر ماں کی محبت میں حب وطن اور حب قوم پوشیدہ ہے جس میں سے تمام تمدنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں، تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشق الٰہی کہتے ہیں۔ پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔

مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہلِ مطلق رہ جائے ....."

"ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کا ذکر گزر چکا۔ ۱۹۱۰ء کے اس خطبے میں مسلم قومیت اور نظریہ وطنیت کے تصادم کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا۔

"چونکہ عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ لہذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر خانہ داری اور علم اصول حفظِ صحت پڑھایا جائے۔ اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشوونما پا جائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلہ خیال کر سکیں گی اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی جو میری رائے میں عورت کے فرائضِ اوّلیں ہیں۔ تمام وہ مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرتے یا اسلام کے حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرنے والے ہیں با احتیاط ان کے نصابِ تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔" (مقالات اقبال صفحہ ۱۳۸)

اس خطاب میں مرد اور عورت کے مختلف تقاضوں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:

"اپنی قوم کی خاص نوعیت، اسلام کی تعلیم اور عالم نسواں کے متعلق علم الاعضا اور علم الحیات کے انکشافات کو مدنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمان عورت کو اسلامی جماعت میں بدستور اس حد کے اندر رہنا چاہیئے جو اسلام نے ان کے لئے مقرر کر دی ہے اور جو حد کہ اس کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ (مقالات اقبال صہ ۱۳۷)

اقبال فرماتے ہیں کہ عورت کو زندگی آموز اور حیات افروز ہونا چاہیئے:

"عورت خود زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اگر عورت ہی زندگی سے بیزار ہو جائے، تو پھر

زندگی کے آگے بڑھنے کے کیا امکانات باقی رہ گئے"۔ (گفتار اقبال۔ مرتبہ۔۔۔ ڈاکٹر محمد رفیق افضل صفحہ ۲۲۹)

"ارمغانِ حجاز" میں "تعلیم" کے عنوان سے اقبال نے جو کچھ فرمایا وہ مرد و زن دونوں کے لئے توجہ طلب ہے۔

تب و تابے کہ باشد جاودانہ — سمندِ زندگی را تازیانہ
بہ فرزندان بیاموز ایں تب و تاب — کتاب و مکتب افسون و فسانہ
ز نومیدی از طفلاں روا نیست — چہ پروا گر دماغ برسا نیست
بگوائے شیخ مکتب گر بدانی — کہ دل در سینہ شاں ہست یا نیست
بہ پور خویش دیں و دانش آموز — کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدست او اگر داری ہنر را — یدِ بیضا است اندر آستینش
چو می بینی کہ رہزن کارواں کشت — چہ پرسی کاروانے راچساں کشت
مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی — کہ از وے روح قومے می تواں کشت

آزاد ترجمہ:

ہمیشہ کی تب و تاب زندگی کے گھوڑے کے لئے تازیانہ ہوتی ہے۔ اولاد کو یہ تب و تاب سکھاؤ۔ خالی کتاب اور درسگاہیں خام خیالی سے زیادہ نہیں۔

طلباء و طالبات کا ذہن رسا نہ ہو تو مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اساتذہ کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ دانش آموزوں کے پاس دل ہے یا نہیں؟

اولاد کی خوش بختی کی خاطر انہیں دین و دانش سکھاؤ لیکن اگر انہیں مناسب ہنر بھی سکھادو، تو ان کی آستیں میں یدِ بیضا آگیا۔

کوئی رہزن کارواں کو لوٹ لے تو اس لوٹ مار کی داستان دہرانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ علم و دانش حاصل کرنے سے مطمئن نہ ہوجاؤ۔ ایسے علم بھی ہیں جن سے روح ملی ملیا میٹ ہوکر رہ سکتی ہے۔

پس اقبال اس علم کے مدعی تھے جس سے مرد و زن فکر کی بلندی اور کردار کی

پختگی کے حامل ہوں۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی — ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے — وہ عالم مجبور ہے تو عالم آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے، فقط ذوقِ طلب ہے — پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — پردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

(قطعہ اسرار پیدا۔ ضرب کلیم)

حوالے :۔

۱۔ نیز دیکھیں یہ اقتباس سہ ماہی "فروزاں" بابت اپریل تا جون ۱۹۸۱ء میں۔ اقبال ایک ماہر تعلیم از محمد عبداللہ قریشی صفحہ ۴۵ تا ۴۷)

۲۔ املا انگریزی متن Muslim Community کے عنوان سے پنجاب یونیورسٹی کے مجلہ تعلیم و تحقیق بابت اکتوبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز دیکھیں اس مقالے پر تبصرہ زندہ رود، حیات اقبال کا وسطی دور (جلد ۲) مولفہ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال۔

کتابیات :

A Sociological Study

۱۔ افتخار احمد صدیقی۔ ڈاکٹر (مترجم) شذرات فکر اقبال۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۷۳ء۔

۲۔ جاوید اقبال۔ ڈاکٹر جسٹس۔ زندہ رود۔ حیات اقبال کا وسطی دور — (۱۹۰۸ء — ۱۹۲۵ء) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۸۱ء

۳۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ حیاتِ جاوید۔ لاہور ۱۹۰۲ء

۴۔ رفیع الدین ہاشمی پروفیسر مجلہ تحقیق، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۰ء

۵۔ سید عبدالواحد معینی۔ مقالات اقبال لاہور ۱۹۶۳ء

۶۔ فقیر سید وحید الدین۔ روزگار فقیر جلد اول لاہور ۱۹۶۵ء

۷۔ محمد احمد خان۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم لاہور۔ (اقبال اکادمی) ۱۹۷۸ء۔

۸۔ محمد حنیف شاہد ۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۹۷۶ء

۹۔ محمد رفیق افضل ۔ گفتار اقبال ۔ لاہور ۔ (ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان) ۱۹۶۹ء

۱۰۔ محمد عبداللہ قریشی ۔ سہ ماہی "فروزاں" پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور ۔۔۔۔
اپریل تا جون ۱۹۸۱ء ۔

۱۱۔ کلیاتِ اقبال اردو/فارسی (ضربِ کلیم ۔ ارمغانِ حجاز)

اقبالؔ اور نژادِ نو

اقبالؔ ایک عظیم شاعر اور مفکر تھے۔ قرآن مجید سے آپ نے یہ کمالِ ابلاغ سیکھا کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہر طبقۂ خیال اور ہر طبقۂ حیات کے افراد کے لیے ان کے کلام و پیغام میں یک گونہ کشش ہو اور اس معاملے میں ان کو خدائے تعالیٰ نے جو غیر معمولی کامیابی عطا فرمائی، وہ ان کی ہمہ گیر مقبولیت سے ظاہر ہے۔ انہوں نے اپنے پیغام سے ملکی اور عالمی برادری کے کسی گروہ کو محروم نہیں رکھا اور ان کی تصانیف کی یہ معاشرتی اہمیت لائقِ اعتنا ہے۔ فارسی میں شیخ سعدی نے اپنے معاشرے کے ساتھ بڑی جامع وابستگی دکھائی اور اس ضمن میں اردو کے قومی شعرا مثلاً: مولانا حالی، مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی، محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مگر اقبال کے منفرد مرتبے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت — سخنِ نازک تر از برگِ سمن گفت
ولی با من بگو آں دیدہ ور کیست — کہ خاری دید و احوالِ چمن گفت[1]

اس امر کی توضیح کی چنداں ضرورت نہیں کہ اقبالؔ کا پیغام بالخصوص مسلمانوں کی خاطر ہے اور بالعموم دوسروں کے لیے۔ البتہ جس نکتے کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے زمرہ میں اقبال کے بیشتر مخاطب 'نوجوان' ہیں، خصوصاً طلبا۔

حیاتِ انسانی کا سلسلہ ایک تسلسل اور متعین نظام کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ بچے، جوان ہوتے، کہولت کو پہنچتے اور رفتہ رفتہ راہیِ ملکِ عدم ہوتے جاتے

---

[1] ارمغانِ حجاز، حصہ یارانِ طریق، کلیاتِ اقبال، فارسی لاہور (۱۹۷۳ء اور بعد) صفحہ ۱۰۱۶

ہیں۔ اقبال کے مخاطب نوجوان، آج دنیا سے رخصت ہو چکے یا پیرانہ سالی میں زندگی گزار رہے ہیں مگر یہ سمجھنا غلطی ہو گی کہ علامہ مرحوم کے مخاطب کوئی خاص نوجوان تھے۔ انہوں نے نئی نسل، نژادِ نو یا اپنے عزیز فرزند جاوید اقبال کے تلازمات کے ذریعے دراصل ہر دَور کے مسلمان نوجوانوں کو خطاب کیا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی دَور کے نوجوان بھی اقبال کے پیغام سے بے نیاز ہو سکیں گے۔ ان کے پیغام سے وہی نژادِ نو منحرف ہو سکتی ہے جو اپنے ماضی سے انقطاع کرنے، حال سے تغافل برتنے اور مستقبل سے بے اعتنائی اختیار کرنے پر مُصر ہو، اور ظاہر ہے کہ دین و ثقافت سے ایسی بے رخی برتنا خودکشی کے مترادف ہے۔

اقبال نے اپنی زندگی کے آخری دس سالوں (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۸ء) میں نوجوانوں کو خاص طور پر مخاطب کیا اور انہیں شاعرانہ حکمت کی زبان میں پند و نصیحت کی ہے۔ اس وقت آپ کا سن و سال پچاس سے متجاوز ہو چکا تھا اور ظاہر ہے کہ نفسیاتی اور منطقی طور پر نوجوان، معمر بزرگوں کی باتوں کو قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں اور اس عمر کے ناصح بھی پند و نصیحت کرتے اچھے لگتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ سن ۱۹۲۹ سے قبل بھی اقبال نے نوجوانوں کو خطاب کیا ہے۔ مثلاً:

قیامِ یورپ کے دوران (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا کے لیے ایک نظم لکھی ہے[۱]۔ بانگِ درا حصہ سوم (۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۳ء) کے کلام میں اپنی شاملو، صائب تبریزی، فیضی اور بیدل کے اشعار کی تضمینات[۲] اور "تعلیم اور اس کے نتائج"[۳]، "فردوس میں ایک مکالمہ" اور "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام"[۴]

۱؎ بانگِ درا، ص ۱۱۹

۲؎ ایضاً صفحات: ۱۴۷، ۲۵۱، ۲۷۵، ۲۷۷

۳-۴؎ صفحات: ۲۳۳، ۲۷۶، ۱۹۸۔

کے عنوانات والی نظموں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر نئی نسل سے خطاب کیا ہے مگر باتیں تعریفی اور انتقادی نوعیت کی ہیں۔ آخری نظم میں فرماتے ہیں ؎

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

مثنوی 'اسرار و رموز' میں آپ[1] نے ایک نوجوان کی فرضی اور تمثیلی کہانی جو کہ مرو سے بھاگ کر حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخش ؒ کی خدمت میں آ پہنچا اور دشمنوں کی ایذا رسانیوں کی شکایت کی۔ حضرت موصوف نے اسے دشمنوں سے مقابلے کی خود شناسانہ خوبیوں سے مطلع کرتے ہوئے مطمئن فرمایا۔ 'پیامِ مشرق' میں آپ نے باز کی بچہ باز کو نصیحت کے کنائے میں نوجوانوں کے بعض اوصاف گنائے ہیں۔ مثلاً:

نگہ دار خود را و خورسند زی
دلیر و درشت و تنومند زی

نصیبِ جہاں آنچہ از خرمی است
ز سنگینی و محنت و پُردمی است

پیِ شاہبازان بساط است تنگ
بر سنگ رفتن، کند نیز چنگ

ز دستِ کسے طعمہ خود مگیر
نکو باش و پند نکویان پذیر

'زبورِ عجم' اور اس سے منسلک دونوں مثنویاں نوجوانوں کے تخاطب سے تقریباً خالی ہیں اور اس کے بعد علامہ مرحوم کی وہ تحریریں اور اشعار سامنے آتے ہیں جو ۱۹۲۹ء میں یا اس کے بعد لکھے گئے اور نژادِ نو کے لیے دلسوزانہ نصائح سے مملو ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کی غیر معمولی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی آرزو اقبال کی خاطرِ منور میں پہلے سے موجزن تھی، چنانچہ اکبر الہ آبادی مرحوم کے نام اپنے دوستانہ مکتوب مورخہ ۲۵ / اکتوبر ۱۹۱۵ء میں آپ نے لکھا تھا:

"صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان، جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے اور اس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں[2]۔" جیسا کہ ہم شواہد کے

---

[1] صفحہ: ۱۹۸

[2] اقبال نامہ ج ۲، ص ۹۴۔

مسائل بیان کر رہے ہیں کوئی ۱۹۲۹ء کے قریب علامہ کی یہ آرزو بھی مکاتیب سے گزر کر نوجوانوں سے نمایاں تخاطب کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے!

۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو اقبال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تشریف فرما تھے۔ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین نے آپ کو ایک بہت عمدہ سپاسنامہ پیش کیا۔ آپ کی خدمات کو سراہا اور مذکورہ یونین کا تاحیات رکن بننے کا اعزاز آپ کو پیش کیا۔ اس موقع پر اقبال نے نوجوان طلبہ کو گرانقدر مشورے دئے۔ مثلاً

۱۔ کسی کی مخالفت کرنا ہو تو بھی عقل و انصاف کا دامن نہ چھوڑا جائے۔ انگریزوں کی مخالفت میں انگریزی زبان و ادبیات، فکر تقلیل کی عادات اور مغربی طرز کی جمہوریت کی مخالفت کرنا دانشمندی نہ ہوگی۔

۲۔ نوجوان اپنے حال کو بہتر بنانے اور مستقبل کی بہتر تنظیمِ فکر کی خاطر ماضی سے آگاہ ہوں۔

ان مشوروں کے بعد فرمایا: "میں گزشتہ بیس برس سے قرآن مجید کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں۔ ہر روز تلاوت کرتا ہوں مگر میں ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ ...... میں امید کرتا ہوں کہ آپ میں سے کچھ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گزشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسدِ خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں، وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔"[1] اس اقتباس سے واضح ہے کہ اقبال کو نوجوان طلبا سے کس قدر دلسوزی تھی اور قرآن مجید پر غور و تدبر کو ایمان کی خاطر کس قدر ضروری جانتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال جملہ سائنسی اور فنی علوم کے سخت موید تھے۔ ارمغانِ حجاز میں والدین سے خطاب فرماتے ہیں۔

به پور خویش دین و دانش آموز | که تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدستِ او اگر داری ہنر را | یدِ بیضاست اندر آستینش

---

[1] گفتارِ اقبال: مرتبہ محمد رفیق افضل، ص ۱۰۴، ۱۰۵

قرآن مجید کی تعلیمات سے بے بہرہ افراد کو، خواہ وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ ہوں، اقبال بنظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فرماتے ہیں:

سینہ ہا از گرمیِ قرآن تہی		از چنیں مردان چہ امید بہی؟[1]

اقبال نے اپنی شاہ کار فارسی تالیف "جاوید نامہ" کو چوہدری محمد حسین مرحوم کے بقول[2] ۱۹۲۹ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ کتاب، جس کے مطالب مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم کی تجویز کے مطابق پورے عالمِ اسلام کے نصابِ تعلیم کا جزو بننے کے لائق ہیں[3]۔ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی اور اس کی نادر و بدیع "مناجات" کے آخر میں شاعرِ مشرق دست بدعا ہیں:

بحرم واز من کم آشوبی خطاست		آنکہ در قعرم فرود آید کجاست؟
یک جہان بر ساحلِ من آرمید		از کران غیر از رم موجے ندید
من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن		دارم از روزی کہ می آید، سخن
بر جوانان سہل کن حرفِ مرا		بہرِ شان پایاب کن، ژرفِ مرا

یہ چار دعائیہ اشعار اس بات کے مظہر ہیں کہ علامہ کو اس کتاب کے ادق مطالب کا احساس تھا، اور چونکہ یہ موضوعات نوجوانوں کی ترغیب و تحریک کی خاطر تھے، اس لیے وہ خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ نوجوان ان عمیق باتوں کو کما حقہٗ سمجھ جائیں۔ کتاب کے اختتام پر علامہ نے کوئی ڈیڑھ سو اشعار کا ایک خصوصی ضمیمہ "خطاب بہ جاوید۔ سخنی بہ نژادِ نو" میں نوجوانوں کی خاطر ان سے اپنا دردِ دل کہا ہے۔ اس حصے کے بعض اشعار امثالِ سائرہ بنتے جا رہے ہیں۔ مثلاً:

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ		فتنۂ او حُبِّ مال و ترسِ مرگ
صاحبِ قرآن و بی ذوقِ طلب		العجب، ثم العجب، ثم العجب

---

[1] جاوید نامہ، ص ۲۳۵،

[2] جاوید نامہ پر ایک نظر، نیرنگِ خیال، اقبال نمبر، ۱۹۳۳ء علی گڑھ۔

[3] نوادرات، ادارہ طلوعِ اسلام

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش | گردِ خود گرونده چون پرکار باش
حفظِ جانہا، ذکر و فکرِ بی حساب | حفظِ تنہا ضبطِ نفس اندر شباب
سِرِّ دنیا، صدقِ مقال، اکلِ حلال | خلوت و جلوت، تماشای جمال
آبروی گل ز رنگ و بوی اوست | بی ادب، بی رنگ و بوایِ آبروست

یہ حصہ نوجوانوں کی قوتوں کی بیداری، حمیتِ دین، تعلیم و تربیت، ادب و تہذیب اور روحانی بالیدگی کے لیے اقبال کا پند نامہ ہے۔ کاش وہ طالب علم جو اسے سمجھنے سے قاصر ہیں، اس کا انگریزی ترجمہ ہی دیکھ لیں[1]۔

بالِ جبریل میں نوجوانوں کے بارے میں علامہ کے کئی ارشادات قابلِ ملاحظہ ہیں۔ ایک دعائیہ دوبیتی ہے۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے | پھر ان شاہین بچوں کو بال و پَر دے
خدایا، آرزو میری یہی ہے | مرا نورِ بصیرت عام کر دے

شاہین، جرۂ شاہین، شاہینِ کافوری، باز، جرۂ باز اور عقاب وغیرہم تقریباً مترادف ہیں اور یہ الفاظ اقبال کے ہاں متعدد بار آئے ہیں۔ اقبال کی آرزو رہی کہ مسلمان نوجوانوں میں اس پرندے کی جرأت، شہامت، استغنا اور شانِ فقر آجائے۔ اقبال با استعداد نوجوانوں کو درسِ شاہینی دینا، اپنے مشن کا ایک جزو جانتے تھے۔ فرماتے ہیں:

قبای زندگانی چاک تا کے | چو موران آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز | تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے[2]

اگر یک قطرہ خون داری، اگر مشتِ پری داری | بیا من با تو آموزم، طریقِ شاہبازی را[3]

---

1. مترجم بشیر احمد ڈار ہیں
2. پیامِ مشرق، ص ۸۶
3. زبورِ عجم ص ۱۳۹

نوجوانوں پر اچھی یا بُری صحبت کے اثرات جلدی اور مُؤثر طور پر مرتّب ہو جاتے ہیں، اس لیے اقبال اخیار اور نیک سرشتوں کی صحبت اختیار کرنے اور اشرار و اوباش سے دُور رہنے کی تلقین فرماتے رہے ہیں:

صحبت از علم کتابی خوشتر است　　صحبتِ مردانِ حُر، آدم گر است[1]

سترِ زن یا زوج یا خاکِ لحد　　سترِ مردان، حفظِ خویش از یارِ بد[2]

'بالِ جبریل' میں جاوید اقبال کے پردے میں آپ ہر نوجوان سے یوں مخاطب ہیں:

خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبتِ زاغ　　ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی

خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ　　حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی

اقبال، نوجوانوں کو سخت کوش اور محنتی دیکھنا چاہتے تھے۔ کسی کی تن آسانی خصوصاً نوجوان کی اقبال پر شاق گزرتی تھی۔

لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی　　ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالین ہیں ایرانی[3]

نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی　　امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

یہ دوسرا شعر اس امر کا مظہر ہے کہ اقبال نوجوانوں میں حضرت حیدر کرارؓ کے زیرِ پرتو غیر معمولی للّہی جسارت و دلیری نمودار ہونے کے آرزومند تھے۔ اس کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ حاکمِ مدائن کا فقر و استغنا[4]، مومنِ جوان کی متاعِ حیات ہے۔ اس آرزو کا اقبال نے کئی مقامات پر اظہار فرمایا ہے۔ فارسی میں اور اردو میں بھی۔ مثلاً:

ای تو ما بیچارگان را ساز و برگ　　وارہان این قوم را از ترسِ مرگ

این مسلمان زادۂ روشن دماغ　　ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

---

[1] مثنوی: پس چہ باید کرد، مسافر ص ۳۴۔

[2] جاوید نامہ، ص ۲۴۱

[3] بالِ جبریل صفحہ ۱۶۲

[4] حضؓ حکمرانی بود و سامانی نداشت

در جوانی نرم و نازک چون حریر | آرزو در سینۂ او زود میر
فقر یا ذنی گوی و او را زندہ کن | در دلش اللہ ھُو، را زندہ کن[1]

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور | قلندری مری کچھ کم، سکندری سے نہیں

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی | ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا | پر دم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ اُفتاد[2]

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا | شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری

دربارِ رسالت مآبؐ میں آپ کی ایک دعائیہ دو بیتی ہے:

بدہ او را جوانِ پاک بازے | سرورش از شراب خانہ سازے
قوی بازوے او مانندِ حیدرؓ | دلِ او از دو گیتی بی نیازے[3]

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کلکتہ برانچ نے علامہ اقبال کو کلکتہ آنے اور مذکورہ فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے کی دعوت دی تھی۔ اقبال علالت کی بنا پر جا نہ سکے مگر اس موقع پر جو پیغام دیا، اس کے درج ذیل جملے، اپنے سیاق کے ماورا بھی جرأت افزا ہیں کہ "مخالف قوتوں سے ہرگز نہ ڈرو۔ اپنی جد و جہد جاری رکھو۔ کیونکہ جد و جہد میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے۔"[4]

اقبال کا اردو ساقی نامہ ایک بے نظیر نظم ہے جس میں انہوں نے اپنا غیر معمولی ایجاز و اعجاز دکھایا۔ اور حقائق و معارف بیان فرمائے ہیں۔ نظم کا تیسرا بند دعا و آرزو

---

[1] پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق
[2] ضربِ کلیم، ص ۱۲ اور ۷۰۔
[3] ارمغانِ حجاز، ص ۱۴۳، ۷۲
[4] گفتارِ اقبال، ص ۲۱۱

کا حامل اور نوجوانوں سے متعلق ہے۔ شاعر، ساقیِ ازل سے دعا فرماتا ہے کہ :

خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے میرا عشق میری نظر بخش دے

اس حصے میں شاعر نے اپنے درسِ آزادی و خودی، سوز و ساز، خلوت و جلوت کی متاع اور اپنے جملہ افکار و نظریات کو نوجوان نسل کے لیے وقف کرنے کا اعلان کیا اور خدا سے یہ دعا کی کہ اس کا یہ سدا بہار قافلہ، ان افکار کی صدائے حدی سے ہمیشہ متحرک اور فعال رہے :

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری امیدیں مری، جستجوئیں مری
مری فطرت، آئینۂ روزگار غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے[۱]

آخر میں اس امر کی طرف اشارہ کہ اقبال کو تعلیم و تربیت کے موضوع سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور ان کے تعلیمی افکار و نظریات کے بارے میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ آپ نے کئی سال تک عربی، فلسفے اور انگریزی کی تدریس کی، اور پنجاب یونیورسٹی، اسلامیہ کالج لاہور، اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے امور سے وہ مدت العمر وابستہ رہے ان عملی تجارب کی بنا پر وہ نوجوان طلبہ کے مسائل سے بخوبی آگاہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ والدین، اساتذہ اور معاشرے کی جن کوتاہیوں سے نوجوانوں پر برے اثرات پڑتے ہیں، ان پر اقبال نے مفصل انتقادات لکھے ہیں۔ مگر ان امور کی تفصیل میں جانا، اس

---

[۱] بالِ جبریل، ص ۱۶۹

وقت کی ہماری گفتگو سے غیر متعلق ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اقبال کو خراب ترین حالات میں بھی نوجوانوں سے اصلاحِ احوال کی توقعات تھیں اور ہمارے معاشرے کے اس اہم اور حساس طبقے کے لیے اب بھی پیغامِ اقبال یہی ہو سکتا ہے کہ:

سینے میں اگر نہ ہو، دلِ گرم — رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست — آتی نہیں کام، کہنہ دامی
ہے آبِ حیات اسی جہاں میں — شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی
اک صدق مقال ہے کہ جس سے — میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے جسے دے — میراث نہیں، بلند نامی[1]

---

[1] ضربِ کلیم ص ۸۷

علامہ اقبالؒ اور تصورِ ریاستِ اسلامی

اسلام ایک مذہب ہی نہیں ایک جامع دین یعنی مکمل نظامِ زندگی ہے۔ اس جامع تصورِ حیات میں سیاست بھی شامل ہے۔ اساسی بات یہ ہے کہ اسلام سیکولرزم یا لادین سیاست[۱] سے نباہ نہیں کرسکتا۔ مسلمانوں کے شایانِ شان مملکتی دستور وہ ہے جو... قرآن مجید، احادیثِ رسولؐ اور اجماع وقیاس (اجتہاد) کے اصولوں کے مطابق تشکیل پذیر ہوا ہو۔ قرآن مجید، غیر قرآنی دستور کے مطابق نظامِ سیاست چلانے والوں کو فاسق، ظالم اور کافر قرار دیتا ہے[۲]۔ علامہ محمد اقبالؒ نظریاتی اسلامی ریاست، پاکستان، کے بانیوں میں تو شامل ہیں ہی، مگر ان کا تصورِ ریاستِ اسلامی بھی عالمی پیمانے پر قابلِ توجہ ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا تصورِ ریاستِ اسلامی، عصری تقاضوں کے مطابق قرآنی تصورِ ریاست ہے جو نثری زبان کے علاوہ ان کی اردو اور فارسی شاعری میں پوری دلآویزی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

علمی مضامین اور خطبے۔

تصورِ ریاستِ اسلامی کے سلسلے میں ہمارے پاس علامہ اقبال کے کئی علمی مضامین اور خطبے موجود ہیں۔ ایک مضمون انہوں نے بظاہر تعلیم کے سلسلے میں قیامِ یورپ کے دوران لکھا تھا۔ اس موضوع پر ۱۹۰۸ء میں لندن میں اقبالؒ نے تقریر بھی کی تھی۔ "پولیٹیکل تھاٹ اِن اسلام" کے عنوان سے۔ انگلستان کے سہ ماہی مجلے "سوشیولوجیکل ریویو" کی جولائی ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں شامل تھا[۳] اور "خلافتِ اسلامیہ" کے عنوان سے اس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے[۴]۔ اس مضمون میں اقبالؒ نے معاصر خلافتِ عثمانیہ کے حوالے دئے۔ سسلی اور اندلس کے مسلمان حکمرانوں اور خلفائے عباسی کے بعض معمولات کا

بھی اس میں ذکر ہے۔ اقبال نے امام محمد غزالی، امام بیضاوی، طرطوسی اندلسی، ابن جماعہ مصری، امام شہرستانی اور ابن خلدون نیز شیعہ حضرات اور خوارج کے سیاسی تصورات کا بالاجمال ذکر کیا مگر ان کی زیادہ توجہ امام الماوردی بصری (وفات ۴۵۶ ھ) کی سیاسی بحث کی طرف مبذول رہی ہے۔ امام الماوردی شافعی مسلک کے عامل تھے۔ وہ کئی کتب کے مصنف تھے جیسے سیاسۃ الملک، قوانین الوزارۃ، آداب الدنیا والدین اور کتاب الحاوی مگر ان کی اہم تر کتاب الاحکام السلطانیہ ہے جو علامہ اقبال نے پیشِ نظر رکھی ہے۔[۵۹]

'اسلام بطور ایک اخلاقی اور سیاسی تصورِ حیات' (انگریزی) اقبال کے ایک دوسرے مضمون کا عنوان ہے جو ۱۹۰۹ء میں ہندوستان ریویو کی دو اشاعتوں میں شامل تھا۔ اس مضمون کے دوسرے حصے میں اقبال نے اسلامی معاشرے کی اہم تر خصوصیات کو گنوایا اور لادین نیز اخلاق و نیکی سے عاری تصورِ قومیت کے مضرات بیان کیے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں اقبال نے علی گڑھ میں 'امتِ مسلمہ: ایک عمرانی مطالعہ' کے[۶۰] عنوان سے ایک اہم خطبہ ارشاد فرمایا جو مختصراً ۱۹۱۱ء کی مردم شماری ہند کی رپورٹ میں بھی منعکس ہے۔ اور جس کا اردو ترجمہ 'ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر' کے عنوان سے متداول رہا۔ یہ خطبہ بھی مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کی ضرورت کا حاکی ہے اور اس ضرورت کا ایک نمایاں پہلو ریاستِ اسلامی کا قیام ہے۔ متعدد بیانات اور مکاتیب کے علاوہ، علامہ اقبال نے تصورِ ریاستِ اسلامی کو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد، ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے مسلم کانفرنس کے صدارتی خطبۂ لاہور نیز ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں لکھے گئے بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے نام خطوط میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ مارچ ۱۹۳۸ء کا ان کا وہ مضمون بھی ایک عمدہ راہنما ہے جسے انہوں نے 'مسلمان اور جغرافیائی حدود' کے عنوان سے لکھا تھا۔ یوں تو حضرتِ علامہ کے پیش کردہ تصورِ ریاستِ اسلامی پر ایک نہیں، متعدد مقالے لکھے گئے[۶۱] اور مزید مقالوں بلکہ کتابوں کو تالیف و تصنیف کیا جا سکتا ہے مگر شاعرِ اسلام کے مندرجہ ذیل فارسی اشعار ان کے تصور کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیتے ہیں:

بندهٔ حق بی نیاز از هر مقام
نی غلام او را، نه او کس را غلام

بندهٔ حق مرد آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راه و دین و آئینش ز حق
زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

عقلِ خودبین غافل از بهبودِ غیر
سودِ خود بیند، نبیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندهٔ سودِ همه
در نگاهش سود و بهبودِ همه

عادل اندر صلح و هم اندر مصاف
وصل و فصلش لایراعی لایخاف

غیرِ حق چون ناهی و آمر شود
زورور بر ناتوان قاهر شود

زیرِ گردون آمری از قاهری است
آمری از ماسوی‌الله کافری است (۸)

آدمی اندر جهانِ خیر و شر
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

کس نداند زشت و خوبِ کار چیست
جادهٔ هموار و ناهموار چیست

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات
روشن از نورش ظلامِ کائنات

گر جهان داند حرامش را حرام
تا قیامت پخته ماند این نظام

فاش می خواهی اگر اسرارِ دین
جز به اعماقِ ضمیرِ خود مبین

گر نبینی دینِ تو مجبوری است
این چنین دین از خدا مهجوری است

بنده تا حق را نبیند آشکار
برنمی آید ز جبر و اختیار

تو یکی در فطرتِ خود غوطه زن
مردِ حق شو بر ظن و تخمین متن

تا ببینی زشت و خوبِ کار چیست
اندرین نه پرده اسرار چیست

هر که از سرِ نبی گیرد نصیب
هم به جبریلِ امین گردد رقیب

ای که می نازی به قرآنِ عظیم
تا کجا در حجره می باشی مقیم

در جهان اسرارِ دین را فاش کن
نکتهٔ شرعِ مبین را فاش کن

کس نگردد در جهان محتاجِ کس
نکتهٔ شرعِ مبین این است و بس (۹)

آزاد ترجمہ :

مردِ مومن مقام و مرتبہ کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ نہ کسی کو غلام و تابع بنائے نہ کسی غیر کا اقتدار مانے۔ مردِ مسلمان ہی درحقیقت آزادانہ زندگی گذارتا ہے۔ اس کا ملک بھی خداداد ہوتا ہے اور آئین بھی خداداد۔ اس کا دین و آئین، طور طریقے، تلخ و شیریں اور خوب و بد کے پیمانے سب خدائی ہوتے ہیں۔ ہوس اور خود غرضی کی حامل انسانی عقل دوسروں کی بہتری سے غافل رہتی ہے۔ دوسروں کا تو کیا، اسے اپنے فائدے کے آداب بھی سوجھتے۔ یہ وحیٔ خداوندی ہی ہے جو سب کا فائدہ دیکھتی اور ہر کو مہ کا بھلا چاہتی ہے۔ امن کی حالت ہو یا جنگ کا زمانہ، وحیٔ الٰہی عدل و انصاف ہی خاطر نشین کرتی ہے۔ وہ نہ کسی سے بے جا رعایت برتے اور نہ کسی سے ڈرے۔ آئین خدائی کو ترک کر کے جو نظام حکمرانی وجود میں آتا ہے اس میں طاقتور کمزور کو نہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے۔ آسمان کے نیچے حکم تو طاقتور کا ہی چلتا ہے مگر نظامِ خدائی سے بے بہرہ حکمرانی کفر اور ظلم کا منظر دکھاتی ہے۔

اس خیر و شر والے جہان میں انسان کو اپنے نفع اور نقصان والے کاموں کا علم ہی نہیں۔ کام کے نیک و بد پہلوؤں اور راہ کج و صراطِ مستقیم سے آگاہ لوگ مشتے از خروارے ہیں۔ اس صورتِ حال میں شریعت ہی ہے جو زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور اسی کی روشنی سے دنیا کی تاریکیوں کے بادل چھٹتے ہیں۔ اگر اہلِ عالم شریعت کے مقرر کردہ حرام کو حرام اور حلال کو حلال مان لیں تو وہ تا قیامت ایک مستحکم نظامِ حیات سے بہرہ ور رہ سکتے ہیں۔۔۔۔ اگر آپ اسرارِ دین کو آشکارا صورت میں دیکھنا چاہیں تو اس کام کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں کے علاوہ کہیں جھانکنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ اسرارِ دین اس طرح ملاحظہ نہ کر سکیں تو آپ کا دین جبر و مجبوری اور خدا سے دوری کا مظہر ہوگا۔ مسلمان حق و صداقت کو برملا دیکھ نہ سکے تو جبر و قدر کے چکر سے نہیں نکلتا۔ تجھے چاہیے کہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں غوطہ لگاؤ۔ بندۂ خدا بنو اور ریب و شک کو قریب نہ آنے دو تاکہ تمہیں خوب و بد کا علم ہو اور نو افلاک کے زنگاری پردوں سے تیری آنکھیں چندھیا

نہ جائیں۔ جو خوش بخت رازِ رسولِ اکرمؐ سے بہرہ مند ہو جائے وہ حضرت جبرئیلؑ کیلئے باعثِ رشک بن جاتا ہے۔ تم قرآن عظیم پر ناز تو کرتے ہو مگر کب تک حجرہ نشینی پر قانع رہو گے؟ دنیا میں اسرارِ دین کو آشکار کرو اور شرعِ مبین کے نکات بیان کرو۔ شرعِ مبین کا ایک نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔

ریاستِ اسلامی کے نمایاں خدوخال:

کتبِ اقبالؒ میں ریاستِ اسلامی کے نمایاں خدوخال کئی موارد میں بیان ہوئے ہیں۔ ہم ان خصوصیات میں سے اہم تر امور کی فہرست بنا سکتے ہیں:

۱۔ اسلامی قانون اور اس کا عملاً نفاذ۔

۲۔ خالقِ کائنات کی حاکمیتِ اعلیٰ کا احساس۔

۳۔ اساسی عقائدِ اسلام جیسے توحید اور ختمِ رسالت کی سرکاری طور پر نشر و اشاعت۔

۴۔ اسلامی معاشرے میں اخوت، حریت، رواداری اور مساوات کا تداول اور مذہبی اقلیتوں (ذمیوں) کے حقوق کی نگاہداشت ہو تاکہ مسلمان قانونِ الٰہی کے اطاعت گزار اور انسانیت کے خدمت گزار ہوں۔

۵۔ نظامِ شورائی یا روحانی جمہوریت کا تعامل۔ اقبالؒ مغربی نظامِ جمہوریت اور اشتراکیت کی جملہ صورتوں کے مخالف تھے۔

۶۔ اسلامی ریاست، عظمتِ انسانی کی مظہر ہے۔ آمریت یا ملوکیت سے عاری۔ نظامِ سرمایہ داری سے منزہ اور الارض للہ کی برکات کی حامل۔ ابلیس اپنی 'مجلسِ شوریٰ' کو کہتا ہے:

الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

بہرحال تصورِ ریاستِ اسلامی افکارِ اقبالؒ میں جس طرح منعکس ہے، اس کی

مختصر کیفیت کو چند ذیلی عنوانات کے ذریعے بعد کی سطور میں واضح کیا جاتا ہے۔

دستورِ مملکت

تصورِ ریاستِ اسلامی کو عملی صورت دینے میں آئین یا دستور ایک بنیادی دستاویز کا کام دیتا ہے۔ مسلمانوں کا ابدی دستور قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے۔ زبانِ شعر میں قرآن حکیم کی ابدیت و دائمیت اور اس سراپا اعجاز کتاب کی جامعیت کی جو توصیفات علامہ اقبال نے کی ہیں، پورا متاخر اسلامی ادب اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔

از یک آئینی مسلمان زندہ است — پیکرِ ملت ز قرآن زندہ است
ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست — اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست[10]

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہان اندر بر او چون قباست
چون کہن گردد جہانی در برش — می دہد قرآن جہانی دیگرش

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ — دستگیرِ بندۂ بی ساز و برگ
نقشِ قرآن تا درین عالم نشست — نقشہای کاہن و پاپا شکست

فاش گو بم آنچہ در دل مضمر است — این کتابی نیست چیزی دیگر است
چون بجان در رفت جان دیگر شود — جان چو دیگر شد جہان دیگر شود

مثلِ حق پنہان و ہم پیدا ست این — زندہ و پایندہ و گویاست این
اندرو تقدیرھای غرب و شرق — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق[11]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور سنت و معمولات قرآن مجید کے بعض اجمالات کی تفاصیل مہیا کرتی ہیں اور یہ قانونِ اسلامی کا دوسرا اہم ماخذ ہیں۔ اسکے علاوہ میثاقِ مدینہ، بھی دراصل آنحضرتؐ کا مدون کردہ ایک آئین ہے جس سے ریاستِ اسلامی کا قانون مرتب کرتے وقت راہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ قانون سازی

کا تیسرا اصول 'اجماع' کہلاتا ہے یعنی صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور ہمارے اسلاف کی دستوری کوششوں کے نظائر اور نمونے۔ چوتھا اصول 'قیاس' یا 'اجتہاد' کہلاتا ہے جسے ہر عصر کے صاحبِ نظر اور واجد الشرائط مسلمانوں کو انجام دینا چاہیے۔ اس موضوع پر بحوالۂ اقبال یا آزادانہ ان سالوں میں ہمارے ہاں بہت لکھا جاتا رہا ہے۔ اقبال دورِ زوال کے مسلمانوں کو مشورہ دیتے رہے کہ اجتہاد سے زیادہ 'اجماع' کی تقلید کریں[۲۲]۔ مگر ریاستِ اسلامی میں اجتہاد و قیاس کا کام ناگزیر ہے اور یہ کام جب اربابِ حل و عقد انجام دیں، تو اسے متعلقہ ریاستِ اسلامی کا کام مجبوب سمجھا جائے گا۔

علامہ اقبالؒ کے شہرۂ آفاق سات خطبات 'تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' میں سے خطبہ ششم 'الاجتہاد فی الاسلام' اسی موضوع پر ہے۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی کی مجلسِ ملی نے جب خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور نئے جمہوری نظام کو اپنانے کا 'بل منظور کیا' تو اقبالؒ نے اسے ایک کامیاب اور بروقت اجتہادی کوشش قرار دیتے ہوئے سراہا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو 'تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' میں ہے:

آیئے اب ذرا یہ دیکھا جائے کہ جہاں تک مسئلۂ خلافت کا تعلق ہے، مجلس ملیہ... نے اپنا حق اجتہاد کس طرح استعمال کیا۔ سنی نقطۂ نظر سے خلیفہ یا امام کا منصب چونکہ ایک امرِ واجب ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منصب خلافت کیا کسی فردِ واحد کا حق ہے؟ ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے تو اس منصب کو افراد کی ایک جماعت، بلکہ کسی منتخب شدہ مجلس کے ذمے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان اور مصر کے علماء نے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ اپنی ذاتی حیثیت سے البتہ میرا خیال ہے کہ ترکوں کا یہ نقطۂ نظر تمام تر درست ہے، اتنا درست ہے کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ ایک تو جمہوری طرزِ حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے، ثانیاً اگر ان قوتوں کا بھی لحاظ رکھ لیا جائے جو اس وقت عالم اسلام میں کام کر رہی ہیں، تو یہ طرزِ حکومت اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

بہر حال ترکی نقطۂ نظر کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے ہمیں ابن خلدون یعنی عالم اسلام کے سب سے پہلے فلسفی مؤرخ سے رجوع کرنا چاہئے۔ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'مقدمہ' میں خلافت اسلامیہ کے تین نظریے قائم کیے ہیں۔ (۱) یہ کہ خلافت ایک امر شرعی ہے، لہذا اس کا قیام واجب ہے۔ (ب) یہ کہ اس کا تعلق ضرورت اور مصلحت سے ہے۔ اور (ج) یہ کہ اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ آخری نقطہ خوارج کا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے جدید ترکی کا رجحان دوسرے نظریے کی طرف ہے یعنی وہ اس معاملے میں معتزلہ کے ہم خیال ہیں، جن کی رائے یہ تھی کہ عالمگیر خلافت کا تعلق صرف ضرورت اور مصلحت وقت سے ہے۔ ترک کہتے ہیں ہمیں چاہئے اپنے سیاسی تفکر میں ماضی کے سیاسی تجربات سے سبق حاصل کریں، جس کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ عالمگیر خلافت کا تصور عملاً کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے گزشتہ سیاسی افکار سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ قاضی ابوبکر باقلانی نے جب اپنے زمانے کے احوال و ظروف کو دیکھا تو خلیفہ کیلئے قرشیت کی شرط ضروری نہیں ٹھہرائی؟ باقلانی کہتا ہے قریش کے ہاتھ میں اب کوئی طاقت نہیں لہذا بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ جہاں کہیں جس کسی کو طاقت حاصل ہے وہاں اسی کو امام تسلیم کر لیا جائے۔ بعینہٖ ابن خلدون نے بھی واقعات کی منطق سے لاجواب ہو کر کچھ ایسا ہی نظریہ قائم کیا جسے بین الاقوامی اسلام کا گویا ایک دھندلا سا، مگر پہلا تصور ٹھہرانا چاہیئے اور جو اب ایک حقیقت بنتا نظر آرہا ہے۔ کچھ ایسی ہی روش ترکوں کی ہے جو انہوں نے اپنے تجربات کی بنا پر اختیار کی اور جس میں انہوں نے فقہا کے ان متکلمانہ استدلالات سے مطلق اعتنا نہیں کیا جن کی زندگی اور طرز فکر کا تعلق احوال و کیفیات کے ایک ایسے عالم سے تھا جو ہمارے زمانے سے یکسر مختلف ہے۔ ۔ ۔ ۔

میری اپنی رائے بھی یہی ہے کہ اگر ان دلائل کو ٹھیک سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا ذہن اب ایک ایسے بین الاقوامی نصب العین کی طرف حرکت کر رہا ہے جو گویا اسلام کا منتہائے نظر ہے، مگر جس کو شروع شروع کی عربی شہنشاہیت

نے پس پردہ ہی نہیں، پس پشت ڈال رکھا تھا۔

دراصل یہ صرف ترک ہیں جو امم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعورِ ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ صرف ترک ہیں جنہوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالمِ حقیقت میں آ گئے ہیں۔ لیکن یہ وہ تغیر ہے جس کے لیے انسان کو ایک زبردست دماغی اور اخلاقی کشاکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک طبعی امر تھا کہ ایک ہر لحظہ حرکت اور وسعت پذیر زندگی کی روز افزوں پیچیدگیوں سے انہیں نئے نئے حالات اور نئے نئے نقطہ ہائے نظر سے سابقہ پڑتا اور وہ ان اصولوں کی از سرِ نو تعبیر پر مجبور ہو جاتے جو ایک ایسی قوم کے لیے جو روحانی وسعتوں کی لذت سے محروم ہے خشک بحثوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ شاید انگریز فلسفی ہابس تھا جس نے یہ نہایت ہی پتے کی بات کہی ہے کہ ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات کے تسلسل کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کوئی خیالات اور احساسات ہی نہیں۔ چنانچہ بلادِ اسلامیہ میں سے اکثریت کو دیکھیے تو اس پر یہ قول حرف بحرف صادق آ جاتا ہے۔ ان میں پرانی قدروں ہی کا تکرار جاری ہے، بعینہٖ جیسے کوئی کل ایک ہی انداز پر چل رہی ہو۔ ترک البتہ نئی نئی قدریں پیدا کر رہے ہیں۔ ان کا گذر بڑے بڑے اہم تجربات سے ہو رہا ہے اور یہی تجربات ہیں جن سے ان کا اندرونِ ذات ان پر منکشف ہو رہا ہے۔ ان کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی ہے، وہ بدل رہی اور وسعت حاصل کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے نئی نئی آرزوئیں اور نئی نئی مشکلات اگر پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کے نئے نئے حل بھی سمجھا رہی ہے۔ لہٰذا آج جو مسئلہ ترکوں کو در پیش ہے کل وہ دوسرے بلادِ اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے اور اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشوونما اور ارتقا کی گنجائش ہے۔ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا، گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ہم اس مسئلے میں وہی روح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا۔ وہ امت کے

اولین دل و دماغ ہیں جو ہر معاملے میں آزادیٔ رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حالتِ نزع میں کہہ دیا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔" (اردو ترجمہ ص ۲۴۴، ۲۴۸ اور ۲۵۰)

ترکوں کی اجتہادی کوششوں کی تعریف کے باوجود اقبال اس خطبے میں اور نثر و نظم کے دیگر مجموعوں میں ان کے سخت ناقد بھی ہیں کیونکہ انہوں نے سیکولر یا لادینی نظام سیاست اپنایا اور تجدید سے زیادہ تجدّد اور تقلیدِ فرنگ کے روادار ہو گئے تھے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ کتابِ زندہ 'قرآن مجید' کے حقیقی حامل کسی کے مقلد نہیں ہو سکتے۔ ان کے دستورِ حیات میں ابدی تجدیدی صلاحیتیں موجود ہیں:

ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست — تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دلِ دیگر نبود — در ضمیرش عالمی دیگر نبود
لاجرم با عالمِ موجود ساخت — مثلِ موم از سوزِ این عالم گداخت
طرفگیہا در نہادِ کائنات — نیست از تقلیدِ تقویمِ حیات
زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور — جانش از تقلید گردد بی حضور
چون مسلمانان اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآن نگر
از حدیثِ مصطفیٰؐ داری نصیب؟ — 'دینِ حق اندر جہان آمد غریب'[۱۳]
با تو گویم معنیٔ این حرفِ بکر — غربتِ دین نیست فقرِ اہلِ ذکر
بہر آن مردی کہ صاحبِ جستجوست — غربتِ دین ندرتِ آیاتِ اوست
غربتِ دین ہر زمان نوعِ دگر — نکتہ را دریاب اگر داری نظر
دل بآیاتِ مبین دیگر ببند — تا بگیری عصرِ نو را در کمند[۱۴]

روحانی جمہوریت۔

انتظامِ ملکی کے سلسلے میں اسلام نے مشورہ و مشاورہ کی تلقین کی ہے۔[۱۵] حسنِ نیت سے یہ مشاورت خاص اداروں کے علاوہ مجلسِ مشاورہ، قومی اسمبلی یا براہِ راست ریفرنڈم کے ذریعے انجام پذیر ہو سکتی ہے۔ ادارۂ خلافت مسلمانوں کا ایک معروف

انتظامی ڈھانچہ رہا مگر عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد خلافت کا نظام بالعموم آمریت اور ملوکیت کا مظہر رہا ہے۔ اقبالؒ حقیقی جمہوریتِ اسلامیہ کے قدردان تھے مگر آمریت، ملوکیت اور ان کی جملہ شئون کے سخت ناقد اور مخالف۔ نظامِ اشتراکیت نے اسلامی معیشت کے بعض پہلو اپنائے ہیں، مگر اس نظام میں الحاد، لادینیت اور آمریت کی قبیح صورتیں جمع ہوگئی ہیں۔ اقبالؒ اس نظام کے مخالف ہیں مگر وہ مغربی طرز کی جمہوریت کے بھی روادار نہیں کیونکہ وہ لادینیت کا مظہر ہے۔ یہاں حضرتِ علامہ کے چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کیونکہ مذکورہ امور کے لئے کافی شرح و بسط ضروری ہے اور وہ مقالے میں نہیں سما سکتی۔

خلافت و ملوکیت۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است (16)

بندۂ مومن ز قرآن بر نخورد — در ایاغِ او نہ مَی دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

اشتراکیت اور مغربی جمہوریت:

غربیان گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از روح بگیرد جانِ پاک — جز بہ تن کاری ندارد اشتراک (17)

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن — تا تراشی خواجہ، از برہمن کافر تری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِّ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری (18)

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے — یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو — ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ جس کی نظر (۱۹)
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟ — چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

اقبال اگرچہ نظامِ جمہوریت کو اسلام سے اقرب بتاتے ہیں مگر ریاستِ اسلامی میں وہی جمہوریت محمود اور قابلِ نفاذ ہے جس کی بنیاد روحانی اور دینی ہو۔ یہ ایسی جمہوریت ہے جس میں 'بشیری' اور 'نذیری' اور 'جنیدی' دار و شیریت ممزوج ہیں (۲۰)۔ قیامِ یورپ کے دوران کی اقبال کی ایک غزل میں ہے:

پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو تو کیا — طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

علامہ مرحوم نے اپنے خطبات کے علاوہ ۱۹۳۰ء کے اپنے تاریخی خطبۂ الٰہ آباد میں بھی اس روحانی جمہوریت کا ذکر کیا ہے۔ اقبال کے ایک بیان میں بھی اس کا ذکر اور وضاحت ہے۔ روحانی جمہوریت وہ ہے جس میں چرچ اور اسٹیٹ کی تفریق نہ ہو اور روح و مادہ کی ثنویت بھی نہ ہو (۲۲)۔ خطبۂ الٰہ آباد میں اقبال نے فرمایا تھا کہ برصغیر میں ایک ریاستِ اسلامی کا قیام اس خطے اور اسلام دونوں کے مفاد میں ہوگا۔ اسلام یہاں ثنویت اور ملوکیت کے بُرے اثرات سے محفوظ ہو کر اپنے خدوخال نمایاں کر سکے گا۔

"میں ہندوستان اور اسلام دونوں کے مفاد میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک مربوط ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کے حق میں اس کا مطلب ہوگا امن و امان اور عافیت و حفاظت جو اندرونی توازنِ قوت سے خود بخود پیدا ہوگا اور اسلام کو بھی یہ موقع میسر آئے گا کہ عربی شہنشاہیت نے اس پر جو چھاپ مجبوراً لگائی تھی، اس سے بھی دامن چھڑا لے اور پھر اپنی فقہ، تعلیم اور ثقافت کو اس طریقے سے حرکت میں لائے جو اسے اپنی اصل روح سے پھر قریب تر کر دے اور عہدِ حاضرہ کی روح بھی اس میں کارفرما ہو" ..... (۲۳)

ریاستِ اسلامی کا ماحول اخوت، حریت اور مساوات کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔

اقبال نے مثنوی رموز بیخودی میں اس ضمن میں حکایات بھی لکھی ہیں۔ اخوت، بھائی چارہ ہے اور مساوات، قانون کی نظر میں برابری جبکہ حریت اسی روحانی جمہوریت کا ایک دوسرا نام ہے۔ اس روحانی جمہوریت کا ایک خاصہ یہ ہوگا کہ اس ریاست میں عظمتِ آدم کا لحاظ ہوگا اور اقلیتوں اور ذمیوں کو محترم اور مکرم مقام حاصل ہوگا۔

آنچہ در آدم بگنجد عالم است | آنچہ در عالم نگنجد آدمی است
آشکارا مہر و مہ از جلوتش | نیست رہ جبریل را در خلوتش
برتر از گردوں مقامِ آدم است | اصلِ تہذیب احترامِ آدم است
حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست | کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست
آدمیت احترامِ آدمی | با خبر شو از مقامِ آدمی
آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن | بر طریقِ دوستی گامی بزن
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق | می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دین را گیر در پہنای دل | دل اگر بگریزد از دل، وای دل ....
گرچہ دل زندانیٔ آب و گل است | این ہمہ آفاق، آفاقِ دل است (۲۳)

یہاں یہ امر بھی توجہ طلب رہے کہ روحانی جمہوریت، ریاست اسلامی کی ایسی اساس بنے کہ آمریت اور ملوکیت کی جملہ صورتیں اس کے ذریعے محو ہو جائیں مثلاً زمین کی ملکیت۔ بادشاہ اپنی قلمرو کی زمین کے مالک سمجھے جاتے رہے اور انہوں نے اپنے حامیوں کی دل جوئی بھی زمینوں اور جاگیروں وغیرہ کے ذریعے کی ہے۔ اقبال اسے خدائی فرمان "الارض للّٰہ" کے منافی قرار دیتے ہیں:

حق زمین را جز "متاعِ ما" نگفت | این متاعِ بی بہا مفت است مفت
دہ خدایا، نکتۂ از من پذیر | رزق و گور از وی بگیر او را مگیر
صحبتش تا کی تو بود و او نبود | تو وجود و او نمودِ بی وجود
تو عقابی طائفِ افلاک شو | بال و پر بکشا و پاک از خاک شو
باطنِ "الارض للّٰہ" ظاہر است | ہر کہ این ظاہر نبیند کافر است (۲۶)

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ | کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دِہ خدایا، یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

بہر طور، 'روحانی جمہوریت' کے ذریعے ایک ریاستِ اسلامی کے باشندے قلباً ایک دوسرے سے مختلط اور مربوط رہتے ہیں:

تا اخوت را مقام اندر دل است	بیخ او در دل نہ در آب و گل است
زندگانی سوختن با ساختن	در گِلے تخمِ دِلے انداختن

فرائضِ ریاستِ اسلامی۔

ریاستِ اسلامی کے فرائض منجملہ دیگر منابع آنحضرت صلعم کے مدوّنہ اس دستورنامہ میں بھی مشہود ہیں جسے 'میثاقِ مدینہ' کہا جاتا ہے۔ ان فرائض میں دفاع اور بین الاقوامی تعلقات ہی نہیں، باشندگانِ ریاستِ اسلامی کے باہم روابط کی نظارت اور نگاہداشت بھی شامل ہے[۲۸]۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں ریاستِ اسلامی کے تصور پر مبنی جو بصیرت افروز خطبہ دیا، اس میں ان فرائض کی طرف بلیغ اشارے کر دئیے۔

یہ اشارے ترقی یافتہ صورت میں ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے ان کے خطبۂ لاہور میں مذکور ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ختمِ رسالت، توحید اور خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ وغیرہم ایسے تصورات کی نشر و اشاعت ریاستِ اسلامی کے فرائض میں شامل ہے۔ اقبال کو بالخصوص 'توحید' سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے 'توحید' یا لا الہ الا اللہ اور 'لا و الّا' وغیرہ کے عنوان سے اس موضوع پر اتنا لکھا کہ انہیں برملا ایک توحید آموز مفکر اور شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کا مدعا یہ ہے کہ ریاستِ اسلامی جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نظامِ احتساب قائم کرنے کی متوقع ہے اسی طرح توحید کی نشر و اشاعت کے لئے بھی وہ مکلف ہے۔ پھر توحید آموزی صرف اسلامیات یا دینیات وغیرہ کے دروس کا ہی جزو نہ ہو، ہر شعبۂ زندگی سے متعلق مسلمان کے لئے یہ احساس و یقین ضروری ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کا خالق و ناظم اللہ ہے اور صرف اللہ۔ مثنوی رموزِ بیخودی میں حضرت علامہ فرماتے ہیں:

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ — انتہای کارِ عالم لا الٰہ

چرخ را از زورِ او گردندگی — مہر را پایندگی، رخشندگی

بحر گوہر آفرید از تابِ او — موج در دریا تپید از تابِ او

خاک از موجِ نسیمش گُل شود — مشتِ پر از سوزِ او بلبل شود

شعلہ در رگہای تاک از سوزِ او — خاکِ مینا تابناک از سوزِ او

نغمہ ہایش خفتہ در سازِ وجود — جویدت ای زخمہ سوزِ سازِ وجود

صد نوا داری چو خون در تن روان — خیز و مضرابی بہ تارِ او رسان

زانکہ در تکبیر راز بودِ تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

تا نخیزد بانگِ حق از عالمی — گر مسلمانی نیاسائی دمی

می ندانی آیۂ ام الکتاب — اُمتِ عادل، ترا آمد خطاب؟ [۲۹]

آب و تابِ چہرۂ ایامِ تو — در جہان شاہد علی الاقوام تو

نکتہ سنجان را صلای عام دہ — از علومِ امیؐ پیغام دہ

امیؐ پاک از ہویٰ گفتارِ او — شرحِ رمزِ "ما غویٰ" گفتارِ او [۳۰]

ای کہ خوردستی ز مینای خلیلؑ — گرمیٔ خونت ز صہبای خلیلؑ

برسرِ این باطلِ حق پیرہن — تیغِ "لا موجود الا ھو" بزن

جلوہ در تاریکیٔ ایام کن — آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

لرزم از شرمِ تو چون روزِ شمار — پرسدت آن آبروی روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردہ ای — پس چرا با دیگران نسپردہ ای [۳۱]

ترجمانی :

توحید دنیا میں مرورِ ایام کا نقطۂ ماسکہ ہے اور کارِ جہاں کا انجام بھی۔ گردشِ فلک اسی کی قوت سے ہے اور سورج کی پائداری اور چمک بھی اسی سے ہے۔ اسی کی تابش سے سمندر نے موتی پیدا کئے اور سمندر کی امواج کو اس نے تپش دی۔ توحید کی بادِ نسیم سے مٹی پھول بنتی ہے اور اسی کے سوز سے مٹھی بھر پَر بلبل بنتے ہیں۔ اسی کے سوز سے درختِ انگور کی رگیں شعلہ خیز ہیں اور صراحی کی مٹی براق ہے۔ توحید کے نغمے سازِ وجود

میں خوابیدہ ہیں۔ اے زخمہ ور، سازِ وجود تیری تلاش میں ہے۔ تیرے بدن میں صدہا صدائیں خون کی طرح رواں دواں ہیں۔ اٹھو اور سازِ توحید کا مضراب چھیڑو۔ اے مسلمان، اعلانِ توحید میں تیری بقا کا راز ہے، لہذا توحید کی حفاظت اور اشاعت تیرا نصب العین ہونا چاہیے۔ جب تک توحید کا نغمۂ حق سارے جہاں میں نہ پھیلے، اگر تم اسلام کے دعویدار ہو تو تمہیں لمحہ بھر کے لیے بھی چین نہیں آنا چاہیے۔ کیا تمہیں قرآن مجید کی وہ آیت یاد نہیں جس میں تمہیں 'امتِ عادل' کا خطاب ملا ہے؟ تم چہرۂ زمانہ کی رونق ہو اور دنیا میں تم اقوام کے لیے شاہد و گواہ ہو۔ مسلمانو، عاقلوں کو دعوتِ عام دو اور اس نبیؐ امی کے علوم کی اشاعت کرو جس کی گفتار ہوی و ہوس سے پاک اور بے راہ روی کے شائبہ سے منزہ ہے ...... اے مسلمان، تو جس نے حضرت ابراہیمؑ کی مینائے توحید کی مئے صاف پی اور اس سے اپنا خون گرم کیا، اس حق نما باطل ماسوا اللہ کے وجود کو لا الٰہ الا اللہ کی تیغ سے گھائل کر۔ تاریکیٔ زمانہ میں توحید کا نور پھیلا اور اسلام کے کامل دین کی تعلیمات عام کر۔ مسلمانو، میں روزِ قیامت تمہاری بازپرس کے تصور سے نادم ہوں جب ناموس کائنات حضرت رسول اکرمؐ تم سے پوچھیں گے: تمہیں مجھ سے پیغام حق و صداقت پہنچا تھا اسے تم نے دوسروں تک کیوں نہ پہنچایا؟"۔

ریاستِ اسلامی: فلاحی مملکت:

ریاستِ اسلامی ایک فلاحی مملکت ہوتی ہے۔ فلاحی مملکت بنیادی انسانی ضرورتیں ہی زیادہ سے زیادہ مادی اور معنوی سہولتیں بہم پہنچانے کی مکلف ہوتی ہے۔ پاکستان کی ریاستِ اسلامی کو ایک فلاحی مملکت میں مبدل کرنے کے امکانات موجود ہیں مگر، زکوٰۃ اور عشر وغیرہ کے نظام کے نفاذ کے باوجود ابھی منزل بہت دور نظر آتی ہے۔ پاکستان کے مالی وسائل کم سہی، مگر وافر وسائل والی ریاستہائے اسلامی بھی ابھی اس ضمن میں بہت پیچھے ہیں۔ اقبال نے زبانِ ابلیس سے سچ ہی کہا تھا کہ:

جانتا ہے جس پہ روشن آئینہ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے (۳۲)

علامہ اقبالؒ ریاستِ اسلامی کی بات کرتے وقت ایک فلاحی مملکت کی تشکیل پر متوجہ نظر آتے ہیں۔ مثلاً ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے مکتوب بنام قائدِ اعظم میں انہوں نے لکھا:

"...... خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس (حقِ معیشت) کا حل شریعتِ اسلام کے نفاذ میں مضمر ہے جس کے ساتھ نئے تصوراتِ عہد شامل ہوں اور ترقی کی نئی راہیں کھولی جائیں۔ شریعتِ اسلام کا گہرا اور بہت دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانونِ الٰہی کے مضمرات کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر صحیح عمل کیا جائے تو پھر ہر شخص کے لئے حقِ روزی محفوظ ہو جاتا ہے۔ مگر جب تک ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں یہاں وجود میں نہ آئیں، شریعتِ اسلام کا نفاذ ناممکن ہے ......" (۳۳) اس سے قبل مثنوی "پس چہ باید کرد" کے بعض اشعار نقل ہو چکے ہیں جن میں حضرتِ علامہ نفاذِ شریعت کو ریاستِ اسلامی کے باشندوں کے جملہ دکھوں کا مداوا بتاتے ہیں کیونکہ وحیِ الٰہی سے زیادہ کوئی نظامِ حیات انسانوں کا دل سوز اور غمخوار نہیں ہو سکتا:

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است — پردۂ آدم دری سوداگری است
این بنوک این فکرِ چالاکِ یہود — نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نگردد این نظام — دانش و تہذیب و دین سودای خام
کس نگردد در جہان محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبین این است و بس
مکتب و ملا سخنہا ساختند — مؤمنان این نکتہ را نشناختند
زندہ قومی بود از تاویل مرد — آتشِ او در ضمیر او فسرد

تتمۂ مطالب:

مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک ریاستِ اسلامی وہ ہے جہاں ایک متحد العقیدہ قوم ہو، جہاں شریعتِ اسلامی بتمامہ نافذ ہو اور جہاں دینِ اسلامی کی

۸- جاوید نامہ، فلک عطارد، آخری شعر کا مترادف؛ ایک اردو شعر بھی ہے (نظم خضر راہ):

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

۹- مثنوی 'پس چہ باید کرد' میں عنوان: در اسرارِ شریعت۔

۱۰- مثنوی 'رموزِ بیخودی' میں ہے:

۱۱- جاوید نامہ، فلک عطارد۔

۱۲- مثنوی 'رموزِ بیخودی' میں ہے:

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر   اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

۱۳- الاسلام جاءَ غریباً فسیعود غریباً   (او کما قال ؐ)

۱۴- جاوید نامہ، فلک عطارد۔

۱۵- قرآن مجید ۱۵۹ : ۳ ، ۳۸ : ۴۲

۱۶- ارمغانِ حجاز (اسی عنوان کے تحت)

۱۷- جاوید نامہ، فلک عطارد۔

۱۸- بانگ درا، نظم خضر راہ

۱۹- ارمغانِ حجاز، نظم ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

۲۰- 'بال جبریل' میں ہے (نظم 'دین و سیاست'):

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی   سماتی کہاں اس فقیری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں   کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا   چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی   ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی   دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا   بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی   کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

۲۱- بال جبریل، حصہ دوم غزل ۱۷۔

۲۲- 'تھاٹس اینڈ ریفلکشنز آف اقبال' مذکورہ بالا صفحہ ۲۸۴
(جواب بہ پنڈت جواہر لال نہرو)

۲۳- ماہنامہ 'ماہ نو' بابت مارچ ۱۹۶۸ء (تحریک پاکستان نمبر) صفحہ ۱۰۷-

۲۴- جاوید نامہ، بالترتیب فلک عطارد اور خطاب بہ جاوید

۲۵- قرآن مجید ۱۲۸ : ۷ (قرآن مجید میں کئی جگہ الارض اللہ بھی آیا ہے جیسے ۳۷ ؛ ۷ ،

۲۶- جاوید نامہ، فلک عطارد (ارض ملک خدا است)

۲۷- ایضاً

۲۸- دیکھیں اس کے اہم تر مطالب صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے خطابہ
۱۲- اگست ۱۹۸۳ء میں۔

۲۹- قرآن مجید ۱۴۳ : ۲

۳۰- ایضاً ۳-۲ : ۵۳- نبی اکرمؐ کے لقب امّی کے لئے دیکھیں
۱۵۷ و ۱۵۸ : ۷

۳۱ مثنوی رموز بیخودی، عنوان: در معنی اینکہ جمعیت حقیقی .....
نصب العین امت محمدیہ حفظ و نشر توحید است

۳۲- ارمغان حجاز، نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ

۳۳- ماہنامہ ماہ نو تحریک پاکستان نمبر مذکورہ بالا، صفحہ ۱۲۳-

۳۴- دیکھیں سہ ماہی 'اقبال ریویو' بابت جنوری ۱۹۸۳ء میں میرا مضمون:
علامہ اقبالؒ اور وحدت ملی۔

۳۵- ارمغان حجاز، حصہ آخر- عنوان ہے:
تو چہ دانی کہ دراین گرد سواری باشد۔

ہماری چند مطبوعات

سیرۃ ابن ہشام	علامہ ابن ہشام
تمدنِ عرب	سید علی بلگرامی
تمدنِ ہند	سید علی بلگرامی
خدا موجود ہے	عبدالمجید صدیقی
رسولؐ میدانِ جنگ میں	سید واجد رضوی
صحائف	قمر نقوی
مسلمان یورپ میں	محمد احسان الحق سلیمانی
عبرت نامہ اندلس	مولوی عنایت اللہ دہلوی
قائد اعظم اور ان کا عہد	سید رئیس احمد جعفری
خطبات قائد اعظم	سید رئیس احمد جعفری
صوفیائے نقشبند	سید امین الدین
آدمی کی انسانیت	مولانا محمد بخش مسلم
نگارشات آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد
آزادیٔ ہند	سید رئیس احمد جعفری
خلیفہ ہارون الرشید اور ان کا عہد	سید رئیس احمد جعفری
سید العرب	عمر ابوالنصر
آل محمد کربلا میں	عمر ابوالنصر
شاہ فیصل شہید	ایم۔ ایس۔ ناز
حمطایا	عبدالعزیز خالد
دانائے راز	سید واجد رضوی
برکات اقبال	ڈاکٹر محمد ریاض
افادات اقبال	ڈاکٹر محمد ریاض
اقبال کی قومی شاعری	ڈاکٹر تسنیم ملک
پاکستان کا اسلامی پس منظر	آغا اشرف
رن کچھ سے چونڈہ تک	خالد محمود
اے وطن میرے وطن	میرزا ادیب
شنکار بلتی	قمر نقوی

مقبول اکیڈمی ۔ لاہور

- افادات اقبال ——— ڈاکٹر محمد ریاض
- برکاتِ اقبال ——— ڈاکٹر محمد ریاض
- دانائے راز ——— سید واجد رضوی
- چراغ لالہ ——— سید واجد رضوی
- اقبال کی قومی شاعری ——— ڈاکٹر شمیم ملک
- قائد اعظم اور انکا عہد ——— رئیس احمد جعفری
- خطبات قائد اعظم ——— رئیس احمد جعفری
- خون کی ہولی ——— رئیس احمد جعفری
- پاکستان کا اسلامی پس منظر ——— آغا اشرف
- روداد پاکستان ——— آغا اشرف

مقبول اکیڈمی

۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور